مُدیر:
نوید ظفر کیانی

حضرت عبداللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

میں اُس شخص کو پہچانتا ہوں جس کو سب سے آخر میں دوزخ سے نکالا جائے گا، وہ پیٹھ کے بل گھسٹتا ہوا دوزخ سے نکلے گا، اس سے کہا جائے گا، جنت میں داخل ہوجا! وہ جنت میں داخل ہونے کے لئے جائے گا تو دیکھے گا سب نے اپنے اپنے ٹھکانے بنا لئے ہیں، اس سے کہا جائے گا: کیا تم کو وہ وقت یاد ہے جب تم دوزخ میں تھے؟ وہ کہے گا جی ہاں! پھر اُس سے کہا جائے گا تمنا کرو تو وہ تمنا کرے گا، پھر اُس سے کہا جائے گا جو تم نے تمنا کی ہے وہ بھی اور اس سے دس گنا زائد لے لو۔ تو وہ کہے گا کیا تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو؟ حالانکہ تم فرشتے ہو! حضرت عبداللہ نے کہا، میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ اِس قدر ہنسے کہ آپ کی داڑھیں ظاہر ہوگئیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:۱۷۵۶۷،۱۱۵۷،صحیح مسلم الایمان:۱۸۶،رقم الحدیث۳۰۹،
۳۰۸،سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۵۹۵،سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:۴۳۳۹)

مُدیر:
نوید ظفر کیانی

مشاورت:
کے ایم خالد
روبینہ شاہین
محمد امین

ارمغان ابتسام

http://www.facebook.com/groups/837838569567305/

برقی ڈاک کا پتہ برائے خط و کتابت
mudeer_ai@yahoo.com

حلقہ ارباب مزاح

مزاح نگار ڈائریکٹری

مرتب کرنے کا ارادہ رکھتا ہے حلقہ ارباب مزاح کی خواہش ہے پوری دنیا میں بسنے والے ہر اس مزاح نگار کا تعارف اس میں شامل ہو جس کے قلم نے کسی بھی ذی روح کے ہونٹوں پر مسکان دی ہو

زیادہ سے زیادہ آٹھ سو الفاظ پر مشتمل اپنا تفصیلی تعارف ان پیج فارمیٹ میں اپنی خوبصورت ترین تصویر (شادی والے دن کے علاوہ) حلقہ ارباب مزاح کو ای میل ایڈریس halqa.mezah@gmail.com پر ای میل کر دیں۔ آپ کا تعارف درج ذیل نکات کا احاطہ کرتا ہو۔

☆ پیدائش کا علاقہ (شہر اور ملک)، گردش دوراں نے کون کون سے علاقے دکھائے اور موجودہ سکونت کس شہر (ملک) میں ہے۔

☆ اسکول، کالج یونیورسٹی کے نام اور تعلیمی دور کا کوئی یادگار واقعہ

☆ لکھنے کا آغاز کتنی عمر اور کہاں اور کس ادیب سے متاثر ہو کر کیا، پہلی تحریر کہاں چھپی۔

☆ جرائد، اخبارات اور ویب سائٹس کے نام۔

☆ کسی ادبی شخصیت سے دوستی یا ملاقات کا کوئی واقعہ

☆ شائع شدہ کتابوں کے نام پبلشرز کی تفصیل کے ساتھ (اگر شائع ہوئی ہوں)۔

☆ مستقبل میں آنے والی کتابوں کے نام۔

☆ کسی ریڈیو یا ٹی وی کے پروگرام میں شرکت کی ہو تو چینل اور پروگرام کا نام۔

☆ حکومت یا کسی ادارے سے کوئی ایوارڈ حاصل کیا ہو تو اس کی تفصیل۔

☆ رہائش کا پتہ (آپشنل) ای میل ایڈریس (ضروری)، موبائل فون ا (آپشنل)

☆ فیس بک آئی ڈی (ضروری)، ٹویٹر آئی ڈی (اگر ہے تو)، سکائپ (اگر ہے تو)

☆ چند تحریروں کے ویب سائٹ لنک یا اپنی تحریر کے چند سیکن نمونے ضرور ای میل کریں۔

اگر فیس بک کے دوست اپنے قرب و جوار میں رہنے والے کسی مزاح گو شاعر، مزاح نگار یا کارٹونسٹ سے واقف ہوں تو ان کا تعارف حلقہ ارباب مزاح تک پہنچائیں تا کہ ان کا تعارف "مزاح نگار ڈائریکٹری" کی زینت بن سکے۔

مزاح نگاروں کا ایک با اعتماد، نمائندہ حلقہ

کیا کیا کہاں کہاں

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اِک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت
(الطاف حسین حالی)

غزلیات

آپ نے دیکھا نہیں شائد ہمیں بیگم کے ساتھ
زندگی اپنی بھی گزری ایک ایٹم بم کے ساتھ (سید ضمیر جعفری)

سفرنامہ

چٹکلے

نظمیں

سہ ماہی کی کتاب

ادب اور ادیب

قطعات

باتوں باتوں میں مادر پدر ہوگئی ۔۔۔ دوستی اور بھی معتبر ہوگئی (سرپٹؔ سیتاپوری)

سلسلہ وار

قلم اور کالم

کارٹون

سفید گاؤن میں ملبوس نوجوان ڈاکٹر با آواز بلند حلف اٹھا رہے تھے شائد اس وقت جذبے بھی سچے ہی تھے کیونکہ ان کے چہرے اس حلف کی تمازت سے دہک رہے تھے ان کی آنکھوں میں محسوس کی جانے والی نمی سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دکھی انسانیت کے درد کا ادراک رکھتے ہوں جیسے آج کے بعد معاشرے میں کوئی دکھی انسان دکھائی نہیں دے گا وہ معاشرے کا سارا دکھ سمیٹ کر ایک نئے معاشرے کی بنیاد رکھیں گے وہ ایک شاعر کا کلام بھی گنگنا رہے تھے '' آؤ مل کر محبت کی نئی فصیل کھینچیں ۔۔۔ کہ جس پار دکھ درد کا کوئی سایہ نہ ہو۔۔۔ محبتیں بوئیں، محبتیں کاٹیں''۔

کالے کوٹ میں ملبوس وکیلوں کا ایک جتھا با آواز بلند حلف اٹھا رہا تھا ان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ سے ان کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی کہ معاشرے کے دکھی لوگوں کا وہی آخری سہارا ہیں کسی بھی غریب، مجبور انسان کو تنہا نہیں چھوڑا جائے گا انصاف دلوانا ہی ہمارا نصب العین ہے وہ معاشرے کے پسے ہوئے مظلوم طبقے کی آواز بنیں گے ان کے حلف کی بلند ہوتی آواز ان کے دلوں کی ترجمانی کر رہی تھی ''کسی بھی مظلوم کو انصاف کی فراہمی تک وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے''۔

خاکی پینٹ اور کالی شرٹ میں ملبوس سرکاری پولیس کے نوجوان اہلکار اپنی پاسنگ آوٹ پر چلا چلا کر حلف دھرا رہے تھے ہم دکھی انسانیت کی خدمت کے لئے میدان عمل میں آئیں گے، نفرت مجرم سے نہیں جرم سے ہیں اگر کوئی امیر بھی جرم کرے گا تو وہ بھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوگا دکھی انسانیت کی خدمت ہمارا سب سے بڑا نصب العین ہے، ہم تھانہ کلچر بدل کر رکھ دیں گے اب وہ سب نہیں ہوگا جو پہلے ہوتا تھا ساتھ میں وہ ایک شاعر کا کلام بھی گنگنا رہے تھے ''چلو مل کر محبت کی نئی فصیل کھینچیں ۔۔۔ جس کی ہواؤں میں قرار سا ہو، خمار سا ہو ۔۔۔ محبتیں بوئیں، محبتیں کاٹیں''۔

نئی نویلی کابینہ کی حلف برداری کی تقریب میں وزراء حلف اٹھا رہے تھے کہ وہ دکھی انسانیت کی خدمت کے لئے میدان عمل میں آئے ہیں پچھلی جمہوریت نما آمریت نے معاشرے کے پسے ہوئے طبقہ کو مزید پیس کر رکھ دیا ہے انسانیت کو دکھی کر کے رکھ دیا ہے وہ خزانہ لوٹ کر فرار ہو چکے ہیں لیکن اس کے باوجود موجودہ حکومت اور اس کے رفقا کار دکھی انسانیت کی خدمت کے لئے اپنے ذاتی وسائل بھی بروئے کار لائیں گے تا کہ حکومت دکھی انسانیت کے دکھوں کا کچھ تو مداوا کر سکے۔

دکھی انسانیت جن طبقات کے ہاتھوں دکھی ہے وہی اس کا دکھ بانٹنے کا حلف اٹھاتے ہیں ان سب اور دیگر طبقات کی دکھی انسانیت کی ''خدمت'' پہلوانوں کی فری سٹائل کے اس دنگل کی مانند ہے، جس میں ایک سے زیادہ پہلوان حصہ لیتے ہیں جب ایک پہلوان دوسرے مغلوب پہلوان کی ٹھکائی کر کے تھک جاتا ہے اور مغلوب پہلوان ''دکھی انسانیت'' کی طرح اس قابل بھی نہیں رہتا کہ وہ بھاگ کر رنگ کے کونے کی طرف جائے اور اپنے کسی ساتھی پہلوان سے ہاتھ ملا کر اسے مدد کے لئے رنگ میں بلائے جبکہ ٹھکائی کرنے والا پہلوان اپنے تازہ دم پہلوان ساتھی کو ہاتھ ملا کر رنگ میں مغلوب پہلوان کی ٹھکائی کی باضابطہ دعوت دے رہا ہوتا ہے۔

کے ایم خالد

ابنِ انشاء

سیٹھ حاتم طائی سے سیٹھ لٹھا بھائی ململ بھائی تک

کل ہم نے ایک صاحب کو اپنے دروازے پر منڈلاتے دیکھا۔ ڈھیلی ڈھالی عبا زیب تن۔ سر پر عقال باندھے۔ کمر پر ہاتھ رکھے کراہتے۔ ہائے ہائے کرتے ہوئے۔

ہم نے کہا: " کون ہو بھیا! سچ مچ کوئی چوٹ آئی ہے یا بھیک مانگنے کی صورت بنائی ہے۔ ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں کسی کو فضول دینے کے لئے۔ آجاتے ہیں لوگ عربوں کی سی وضع بنا کر"

بولے: "میرا نام حاتم ہے۔ شاید آپ نے سنا ہو"

ہم نے کہا: "ہاں ہاں سنا ہے بلکہ تمہیں دیکھا بھی ہے۔ اگر تم وہی آدمی ہو جس نے فلم حاتم میں صبیحہ کے ساتھ کام کیا ہے۔ اچھا کام تھا تمہارا۔ اک ذرا موٹے نظر آتے تھے"

کہنے لگے "بخدا میں وہ نہیں ہوں۔ نہیں معلوم وہ موٹا مسٹنڈا کون ہے۔ میں تو حاتم طائی ہوں۔ قصے کہانیوں والا"

ہم نے کہا: "اچھا وہ شخص جس کی وجہ شہرت فضول خرچی ہے۔ حاتم سیٹھ تم اتنی سخاوت نہ دکھاتے تو یہ حال کیوں ہوتا۔ آج تمہاری ایک حاتم کاٹن مل ہوتی۔ ایک حاتم سلک مل ہوتی۔ حاتم بوٹ مل ہوتی۔ حاتم فرٹیلائزر فیکٹری ہوتی اور ایک ۔۔۔۔۔ خیر اب کیا ہوا ہے تمہیں۔ منہ سے پھوٹو تو!!!"

بولے: " کچھ لوگ رات بھر میری قبر پر لاتیں مارتے رہے۔ قبر کے ساتھ ہڈیاں بھی چکنا چور ہوگئیں۔ ہائے مر گیا"

" کون ظالم تھے وہ" ہم نے کہا "ذرا نام پتہ بتاؤ۔ تھانے میں ان کی رپورٹ کریں"

بولے " آپ کے ملک کے کپڑا ملوں والے سیٹھ تھے۔ میری قبر پر لاتیں مارتے جا رہے تھے اور اعلان کر رہے تھے: ہوگیا، ہوگیا، خلق خدا کا بھلا ہوگیا۔ ڈھائی روپے تک کے کپڑے پر ڈھائی فیصد کمی۔ اٹھو ورنہ حشر نہ ہوگا پھر کبھی۔ دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا"

ہم نے کہا: "یہ ڈھائی روپیہ کا ڈھائی فیصد کیا ہوا؟"

بولے: "یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن بہت ہوگا"

ہم نے کہا: "ہاں ہمارا بھی یہی خیال ہے۔ اچھا کسی سے پوچھیں گے۔ کسی سے کیا خود سیٹھ صاحباں سے بات کریں گے، اتنے میں تو یہ چونی لے۔ کسی سے ہلدی چونا لے کر اپنی ہڈیوں پر لگا اور باقی پیسوں کی روٹی کھا۔ دیکھنا بھوکا مت رہنا"

"سیٹھ لٹھا بھائی ململ بھائی دفتر میں تشریف رکھتے ہیں" ہم نے ان کے منیم صاحب سے پوچھا۔

" کیا مانگتا ہے" منیم صاحب نے روکھے پن سے کہا "نوکری مانگتا ہے تو سیٹھ صاحب کے پاس کوئی نوکری نہیں۔ ہم نے پھٹا لکھ کر بھی لگا دیا ہے۔ یتیم خانے کے لیے چندہ مانگتا ہے تو بھی

یہ نشتر یہ مرہم یہ پٹی یہ قینچی بتِ شوخ کے گھر کی تیاریاں ہیں (حاجی لق لق)

معاف کر۔ سیٹھ صاحب آج کل خود یتیم ہو رہے ہیں"

ہم نے کہا: "ہم یہ کچھ نہیں مانگتا بابا۔ انٹرویو مانگتا ہے اخبار کے لیے"

بولا: "ہمارے سیٹھ کا فوٹو بھی چھاپے گا؟"

ہم نے کہا: "جرور چھاپے گا۔ اس کا بھی چھاپے گا۔ تم کہو تو تمہارا بھی چھاپے گا"

بولا: "ٹھیک ہے۔ ابھی ملائے دیتا ہوں"

سیٹھ صاحب ہمارے ملک کی مایہ ناز ہستی ہیں۔ ان کا نام اندرون ملک اور بیرون ملک مشہور ہے۔ انٹرپول والے تک ان کو جانتے ہیں۔

ان کے کئی مل ہیں۔ بنک ہیں۔ بیمہ کمپنی ہے۔ کپڑا بھی بیچتے ہیں۔ لوہا بھی بیچتے ہیں۔۔۔۔ گھی بھی بیچتے ہیں۔ تیل بھی بیچتے ہیں۔ کھاد بھی بیچتے ہیں۔ ایمان بھی بیچتے ہیں۔ غرض یہ کہ کوئی چیز ایسی نہیں جو نہ بیچتے ہوں۔ کوئلے کی دلالی اس پر مستزاد۔ خوش اخلاق بھی بہت ہیں۔ اٹھ کر مصافحہ کیا۔ بتیسی بھی نکالی۔ لیکن یہ دیکھ کر ہمارے ساتھ فوٹوگرافر نہیں ہے، جلدی سے سمیٹ لی۔

ہم نے کہا: "سیٹھ جی۔ ہم ایک بات پوچھنے آئے تھے۔ یہ رہا ہمارا کارڈ"

بولے: "ہاں ہاں پوچھو بھائی۔۔۔۔ آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ کمال کرتے ہیں (کارڈ پر نام پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے) کیا نام ہے آپ کا؟ ابن عیسیٰ۔ عیسیٰ صاحب میں تو ہر روج پڑھوا کر سنتا ہوں"

ہم نے کہا: "شکریہ، یہ بتایئے کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے ڈھائی روپے تک کے کپڑے پر ڈھائی فیصد دام کم کر دیے ہیں؟"

فرمایا: "ہاں ہاں۔ سارے اخباروں میں مسرت سے اس کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ یوں سمجھو ہم نے یہ قربانی کی ہے۔ گریب آدمیوں کے لیے"

ہم نے کہا: "ڈھائی روپیہ پر ڈھائی فیصد کیا بنا؟"

بولے: "خود حساب کر لو۔ ایک روپے پر ڈھائی پیسے۔ ڈھائی روپے پر ایک آنہ یعنی جو کپڑا ڈھائی روپے کا تھا۔ اب دو روپے سات آنے کا ہوگا۔ جتنا جی چاہے لے لو۔ بابا۔ ہماری ٹیپ ٹاپ پر مت جاؤ۔ ہمارا دل گریب ہے۔ گریبوں کے ساتھ ہے پچھلے الیکشن میں بھی ہم نے یہی بات کہی تھی بلکہ کئی کئی ہجار روپے غریب ووٹروں میں بانٹ دیے تھے"

ہم نے کہا: "اس میں کیا شک ہے لیکن سیٹھ صاحب ہم نے تو کوئی کپڑا بازار میں ڈھائی روپے سے کم دام کا نہیں دیکھا۔ آپ کون سا کپڑا ڈھائی سے کم کا بناتے ہیں؟"

انہوں نے پکار کر کہا: "منیم جی۔۔۔۔ عیسیٰ صاحب کو بتاؤ ہم کون کون سا کپڑا ڈھائی روپے سے کم دام کا بناتے ہیں"

منیم صاحب نے کہا: "سیٹھ صاحب! آج کل تو کوئی ایسا کپڑا نہیں۔ ایک کھدر ہوا کرتا تھا۔ سوا دو روپے گز کا۔ وہ بھی کوئی چھ مہینے ہوئے پونے تین روپے گز کر دیا گیا"

بولے: "پونے تین روپے تو اس پر تو ہم کچھ گھٹا نہیں سکتے۔ مجبوری ہے۔ منیم جی اس سے کم کا کچھ نہ کچھ تو بنتا ہوگا۔ ہماری ڈھاکے والی فیکٹری میں کیا بنتا ہے؟"

"وہ تو ٹاٹ ہے حجور" منیم صاحب نے کہا۔

"وہ بھی تو کپڑا ہی ہوا" سیٹھ صاحب بولے "گرمیوں کے لیے بڑے کام کی چیز ہے"

ہم نے کہا: "جی ہاں۔ ہم اس سے بوریا بناتے ہیں۔ ہو خبر گرم ان کے آنے کی تو اسی کو بچھاتے ہیں"

"ان سے کیا مطلب آپ کا؟ مارشل لاء والے تو نہیں؟"

سیٹھ جی نے سہم کا کہا: "منیم جی وہ اپنا زرمبادلہ تو چھپا دیا"

"جی ہاں۔ چنتا نہ کیجئے" منیم جی نے کہا "آپ کی جائے نماز کے نیچے چھپا دیا ہے"

"آپ بھی لاتوں کے بھوت ہیں سیٹھ" ہم نے آہستہ سے کہا۔

"کیا کہا عیسیٰ صاحب" سیٹھ صاحب بولے۔

"کچھ نہیں۔ لیکن سیٹھ جی ایک گز پر ایک آنہ!! یہ تو کچھ بات نہ ہوئی، آپ بڑھاتے تو دس فیصدی، پچیس فیصدی، پچاس فیصدی کے حساب سے ہیں۔ گھٹاتے ہیں تو ڈھائی فیصدی۔" ہم پر احسان

جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا۔"

"دیکھیے عیسیٰ صاحب!" سیٹھ صاحب سنجیدہ ہو کر بولے۔

"آپ کو یہ تھوڑا معلوم ہوتا ہے۔ حساب لگایئے۔ اگر کوئی گریب آدمی پانچ روپے کا کپڑا پاجامے کے لئے لیتا ہے تو اسے دو آنے بچیں گے۔ پورے دو آنے۔ اگر وہ سو روپے کا خریدے تو ڈھائی روپے کا سیدھا سیدھا فائدہ ہے۔ ہجار روپے کا خریدے تو پچیس روپے کا۔ پچیس روپے تھوڑی رقم نہیں ہوتی۔ کسی گریب آدمی سے بات کیجئے بہت کھس ہو گا وہ یہ سن کر"

ہم نے کہا" بے شک اب ہماری عقل میں آئی"

"اور یہ دیکھو۔ ہم نے قوم کی کھدمت کے لیے اپنے آپ اعلان کیا ہے۔ جب ہم خود یہ غریبوں کے لیے اتنا کچھ کرنے کو تیار ہیں تو لوگ سوشلزم کی بات کیوں کرتے ہیں عیسیٰ صاحب"

ہم نے کہا" یہ ہماری بھی سمجھ میں نہیں آتا"

"اور پھر سوشلزم اسلام کے خلاف بھی تو ہے" سیٹھ صاحب نے زور دے کر کہا۔

"ہاں سیٹھ" ہم نے تائید کی "جو چیز تیرے مفاد کے خلاف ہے وہ اسلام کے خلاف ہو جاتی ہے۔ تو اور اسلام ایک چیز ہوئے نا؟"

" کیا کہا عیسیٰ صاحب"

" کچھ نہیں۔ ہم اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے۔ اچھا خدا حافظ سیٹھ صاحب"

"ارے منیم جی" سیٹھ صاحب پکارے "عیسیٰ صاحب کے لئے چائے لاؤ اور کھارا بسکٹ بھی۔ اور ہاں عیسیٰ صاحب۔ یہ فوٹو ہمارا چھاپئے گا۔ ہمارے انٹرویو کے ساتھ۔ ذرا بڑا سا کر کے۔ ابھی کل ہی کھچوایا ہے"

یہ ایک شخص تھا میلا سا تہبند باندھے۔ پھٹی ہوئی بنیان پہنے داڑھی بڑھی ہوئی۔ پاؤں سے ننگا۔

"ابے تو کون ہے؟" ہم نے للکار کر کہا۔

"جی میں ہوں غریب آدمی" وہ مسکینی سے بولا۔

" کیا ثبوت ہے؟" ہم نے پوچھا" جیب کی تلاشی دو ہمیں"

"میری جیب ہی نہیں ہے حضور!"

"پھر ٹھیک ہے" ہم نے کہا "اچھا انٹرویو دے"
بولا "حضور! میرے پاس نہیں ہے۔ ہوتا تو ضرور دیتا"
"ابے انٹرویو کا مطلب نہیں جانتا؟" ہم نے ڈھول جما کر کہا۔
"ہم سوال کریں گے۔ تو جواب دینا"
کچھ اس کا ضعف، کچھ ہمارا رعب۔ زمین پر بیٹھ گیا اور بولا۔
"جی اچھا"
"تو پاکستانی ہے؟"
"جی ہاں"
"ڈویلپمنٹ کا نام سنا ہے؟ جی۔این۔پی کا مطلب جانتا ہے؟"
"جی نہیں"
"تو اپنا معیار زندگی کیوں نہیں بلند کرتا؟"
"حضور غلطی ہوئی۔ آئندہ کروں گا۔ آپ طریقہ بتا دیجئے"
"بچت کیا کر۔ بہت پیسے ہو جائیں گے تیرے پاس۔ بچوں کو اچھے سکولوں میں پڑھا۔ انہیں پھل اور انڈے التزام سے کھلا۔ ٹیلی ویژن دیکھا کر۔ آرٹ کونسل جایا کر۔ تیرا ذہنی پس منظر وسیع ہوگا۔ تیری شخصیت میں گہرائی آئے گی"
کچھ نہیں بولا۔ بھونچکا بیٹھا ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔
ہم نے کہا: "اچھا یہ بتا تو نے کپڑا سیٹھوں کا اعلان سن لیا کہ ڈھائی روپے تک کے کپڑے پر ڈھائی فیصدی دام کم کر دیے گئے۔ اب تو تو خوش ہے نا۔ تیرے سارے دلدر دھوئے گئے"
"کیا مطلب ہے جی اس کا؟"
ہم نے کہا: "ارے گھامڑ۔ اگر تو سو روپے کا کپڑا خریدے تو ڈھائی روپے کی بچت"
"اگر ہزار روپے کا خریدے تو پچیس روپے کا فائدہ۔ لاکھ روپے کا خریدے تو۔۔۔۔۔۔"
"لیکن جی میں یہ سو روپے اور ہجار روپے اور لاکھ روپے کہاں سے لاؤں گا؟"
"یہ سوچنا تیرا کام ہے" ہم نے کہا "ہم تو صرف یہ بتانے آئے تھے کہ ہمارے معاشرے کے ایک محبِ وطن طبقے نے تیری ہمدردی میں کتنا بڑا قدم اٹھایا ہے اور یہ شان دار رعائتی اعلان رضا کارانہ طور پر کیا ہے۔ اپنے آپ کیا ہے"
بولا: "اپنے آپ کیا ہے جی
ہم نے کہا: ہاں۔ اور وہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں"
"ایک کہانی سناؤں آپ کو؟" گریب آدمی کہنے لگا۔
"ابے تو بھی کہانی سنانے لگا۔ نا بابا" ہم نے کہا۔
بولا: "جی کہانی نہیں، لطیفہ ہے چھوٹا سا۔ ایک غرض مند کسی سیٹھ کے پاس گیا اور مدد کا سوال کیا۔ سیٹھ صاحب نے اپنی نورانی داڑھی پر ایک بار ہاتھ پھیرا اور کہا "بابا! جا تیری قسمت میں کچھ نہیں"
سائل نے کہا: "کیا مطلب سیٹھ جی؟"
بولے: "ہمارا دستور ہے کہ کوئی سائل سوال کرے تو اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ جتنے بال ٹوٹ کر ہاتھ میں آئیں اتنے روپے سائل کو عنایت کرتے ہیں۔ اتفاق سے اس وقت کوئی بال ہاتھ میں نہیں آیا"
سائل بولا: "اجازت ہو تو کچھ عرض کروں"
سیٹھ صاحب نے بڑی مہربانی سے کہا "ہاں ہاں کہو"
بولا: "حضور انصاف یہ ہے کہ داڑھی آپ کی ہو اور ہاتھ میرا پھر کوئی بال ہاتھ میں نہ آئے تو البتہ۔۔۔۔۔"
ہم نے طیش میں آ کر کہا "ارے ناشکرے۔ کنگلے۔ کوئی تیرے لیے اپنا گھر لٹا دے۔ ڈھائی فیصد تھوڑا ہوتا ہے۔ آخر سیٹھوں کی اپنی بھی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ کوٹھیاں، کاریں، کلب، کتے۔۔۔"
وہ کچھ کہنے کو تھا کہ ہم نے ایک لات کس کر جمائی "چل بھاگ تو اپنا معیار زندگی کبھی بلند نہیں کرے گا۔ تیری وجہ سے ہمارا سارا بین الاقوامی رعب غارت ہو گیا"

(۱۹۶۹ء میں لکھا گیا)

ہم نے جو کی ہے ترقی تمہیں معلوم نہیں
چین کی روس کی جاپان کی ایسی تیسی
(سید اطہر جعفری)

سید عارف مصطفیٰ

مچھلی کے شکاری

صبر اور شکر کی صفات کو مومن کی نشانیوں میں سے بتایا گیا ہے اور اِس پیمانے سے دیکھا جائے تو ہمارے میاں بہاء الدین عرف بن میاں سمیت مچھلی کا ہر غیر پیشہ ور شکاری (مچکاری) اس درجہ پہ فائز ہے۔ اکثر سارا دن ہی اپنی ٹوکری کو خالی دیکھنا اور جھلا کر سارا سامان تالاب میں غرق نہ کر ڈالنا صرف صبر کے سہارے ہی ممکن ہے، پھر کسی ایک بھی چھوٹی سی مچھلی پکڑ لئے جانے پہ شکر کرنا تو اُس کے مقام مومنیت کی دلیل ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ بن میاں جیسے گرو اپنے نفع نقصان سے ہی بے نیاز ہوتے ہیں، دراصل بنسی ڈال کے بیٹھے گھنٹوں مسلسل انتظار کے باعث ان کا سارا جسم ہی ایک بڑی سی آنکھ بن چکا ہوتا ہے اسی لیے لاکھ دنیا سے غافل معلوم ہوں آپ ذرا ان کے کسی سامان کو ہاتھ لگا کر تو دیکھئے، اپنے سامان کی حفاظت تو وہ شاید سامان آخرت سے بھی زیادہ ہی کرتے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ اس میں ایسا کوئی خفیہ میٹر لگا چھوڑ دیتے ہیں جو ذرا بھی اجنبی لمس محسوس کرتے ہی اُن کے دل میں لگا الارم بجا دیتا ہے، لہٰذا اس بابت کسی کے دل میں ذرا بھی برا خیال آئے اس کی مطلق گنجائش نہیں چھوڑتے۔ اس سے منسلک ہر ہر شے کی دیکھ بھال بالکل نوادرات کی مانند کرتے ہیں اور بچوں کو اس سے ''فحش مواد'' کی مانند دور رکھتے ہیں اور اسی احتیاط کے بل پہ بن میاں رات کے اندھیرے میں بھی شکار کے لئے سارا سامان اس خوبی سے بٹور کر لے جاتے ہیں کہ آغاز سے یہ مہم آرٹ کا درجہ پالیتی ہے۔ عموماً ایک مچکاری کے سامان میں بنسی ڈوری کانٹے اور کینچوے کے علاوہ اس کے احباب بھی ہوتے ہیں جو جاتے تو مچکاری کے ساتھ اخلاقی سہارے کے لئے ہیں لیکن سارا وقت وہ اس کی حدِ نگاہ و احاطۂ سماعت سے دور۔۔۔افق سے پرے، کہیں دری بچھائے بالعموم تاش کھیلتے اور شکاری کے سامان خورد و نوش پہ ہاتھ صاف کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔

مچھلی کے شکار کے بارے میں ہمارے خواجہ صاحب کا ماننا یہ ہے کہ مچھلی کے شکار کا ذوق رکھنے والے زندگی میں صرف ایک ہی مرتبہ مچھلی پکڑتے ہیں باقی تمام عمر مچھلی ہی انہیں پکڑے رکھتی ہے، یہ وہ لت ہے جو شدت طلب میں ہیروئن اور چرس کی طلب سے بس ذرا ہی کم ہے لیکن اس میں بدنامی کا مطلق کوئی خوف نہیں، بلکہ مفت اور تازہ مچھلی ہاتھ لگنے کا امکان بن میاں جیسے سڑیل مچکاری کو بھی احباب اور خاندان میں مقبول کیے رکھتا ہے حالانکہ ان سے ان کے اپنے اہل خانہ بالعموم بیزار ہی رہتے ہیں کیونکہ جن لوگوں کو یہ لت لگ جائے پھر وہ کسی اور کام جوگے نہیں رہتے۔ کوئی سیاسی بحران ہو یا کسی طرح کی معاشرتی ٹینشن، اُنہیں صرف اور صرف شکار کی ہی ٹینشن رہتی ہے، اِسی لئے مچھلی اور محبوبہ دونوں کا تعاقب اپنی شدت اور اثرات کے لحاظ سے یکساں ہی سمجھے جاتے ہیں، دونوں ہی کو ہاتھ سے پھسلنے سے بچانے کے

لئے سو جتن کرنے پڑتے ہیں لیکن ہاتھ لگنے تک کے مرحلے کے لئے تو ہزار جتن کرنے پڑے ہیں ''سرکار'' بعد میں جس کچے دھاگے سے بندھے چلے آتے ہیں وہ اصل میں شروع میں سلیقے سے ڈالے گئے ڈورے کے اجزاء ہوتے ہیں جو تا عمر کام دیتے رہتے ہیں۔ اسی طرح مچھلی کو ورغلانے کے لئے ڈوری ڈالنے کی نوبت آتی ہے، یوں ڈورے ڈالنے اور ڈوری ڈالنے کے نتائج کچھ زیادہ مختلف نہیں دیکھے جاتے، پھر یہ کہ زیادہ لاگت آنے کا مسئلہ بھی دونوں میں قدرِ مشترک ہے۔ جو مچھلی آسانی سے 300 روپے کلو مل جاتی ہے، شکار کے اخراجات کے حساب سے ہزار پندرہ سو روپے کلو سے کم نہیں پڑتی، ببن میاں کے سامنے ایک بار اسی طرح کا حساب لگا کر شکار سے باز رکھنے کی کوشش کی گئی تو یکدم بھڑک اٹھے اور چیخ کر بولے کہ ''شوق کا کوئی بدل نہیں اور اس کا حساب کتاب رکھا جائے تو شوق ''دھندا'' کہلاتا ہے، میاں! اوباش قسم کے لوگ شادی کے اخراجات کو برآمد ہونے والے سرور پہ تقسیم کر کے حاصل ہونے والا حسابی نقصان دکھا کر بہتیرے کنواروں کو اسی پیمانے سے شادی سے تا دیر روکے رکھتے ہیں''۔

ببن میاں سے مچھلی کے فوائد پوچھیں جائیں تو وہ تو مچھلی کی طرف بھوکی نظر سے دیکھنے کے بھی درجن بھر فوائد گنواتے ہیں اور مچھلی پکڑنے کے فوائد اس سے بھی کہیں زیادہ، اس لئے کھانے کے فوائد پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آپاتی لیکن حکیموں کے مطابق ''مچھلی اپنے طبی خواص کے لحاظ سے ''گرم اور تر'' ہے'' (اور کڑاہی سے برآمد ہونے کے بعد اس کے درجات گرم تر اور تربتر کے ہو جاتے ہیں) جبکہ اس کے شکاری عام طور پہ طبعاً ''سرد اور خشک'' کے زمرے میں شمار کئے جاتے ہیں، دونوں کے یہ خواص ایک دوسرے کی ضد نہ ہوں تو شاید کبھی کوئی مچھلی پکڑی نہ جا سکے لیکن اپنی اس سرد اور خشک طبیعت کی وجہ سے مچھلی کے شکاری عام طور پہ اپنے خاندان اور علاقے میں الگ ہی سے پہچانے جاتے ہیں، اپنے ببن میاں ہی کو دیکھئے، عین خوشیوں کے ہلے گلے کے عالم میں کوئی روح فرسا خبر دینا یا عبرت آموز درس بیان کرنا ان کا خاص وصف ہے۔ وہ تمام مسکراہٹوں کو کینچوے کی مانند اپنی ڈوری سے لٹکا کر مصائب کی مچھلی کو پیش کرنے میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں، وہ اور ان ہی کی قبیل کے دیگر شکاریوں کی یہی آدم بیزار طبیعت انہیں مچھلی سے دل لگانے پہ اکساتی ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں ڈور کہیں اجاڑ سے تالاب یا ویران سی جھیل کنارے کوئی مدقوق سا شخص پانی میں بنسی ڈالے ڈوری پہ نظر جمائے، دنیا و مافیہا سا بے خبر پہروں بیٹھا دکھتا ہے، اکثر کچھ بھی نہیں بدلتا نہ ٹوکری کے حالات اور نہ ہی اردگرد کا منظر نامہ، البتہ تاریخ بدل جاتی ہے، امید پہ دنیا قائم ہے کی اس سے درد انگیز مثال شاید کہیں اور نہ دکھائی دے۔

مچھلی پکڑنے کے طویل دورانیئے میں ببن میاں کی مانند ہر مچھلی پکڑنے والا عام طور پہ بالکل خاموش رہتا ہے، اتنا خاموش کہ آنکھیں پتھریلی ہو جاتی ہیں، ہونٹ بھنچ جاتے ہیں اور چہرے

ش سے شاعر

گزشتہ کرفیو کے دنوں میں شہر کے حالات خاصے سنگین تھے۔ کرفیو کے اوقات میں ایک شاعر کے دروازے پر دستک ہوئی جس پر اُس نے گھبرا کر بلکہ ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تو سامنے ایک شاعر دوست کو کھڑا پایا۔ اُس نے بغل میں بیاض دابی ہوئی تھی۔ دروازہ کھولنے والے نے کرفیو کے اوقات میں اپنے اس دوست کو سامنے پایا جس کا گھر بھی دوسرے محلے میں تھا اور جس کے پاس کرفیو پاس بھی نہ تھا تو وہ بہت حیران ہوا۔ اِسی حیرانی کے عالم میں اُس نے اپنے اُس شاعر دوست سے آمد کا مقصد دریافت کرنا چاہا مگر پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتا، شاعر دوست نے کہا ''ملک صاحب کے ہاں مشاعرے میں نہیں جانا؟''

اس پر اُس نے اپنی ہنسی ضبط کی اور پوچھا ''کیسے چلیں؟ کرفیو لگا ہوا ہے!''

''کوئی بات نہیں'' شاعر دوست نے جواب دیا ''گلیوں میں سے نکل چلتے ہیں!!''

از عطا الحق قاسمی (روزنِ دیوار سے)

پہ دراڑیں سی پڑ جاتی ہیں، اپنے بن میاں شکار کی جگہ پہنچ کر ایکدم کینچلی سی بدل لیتے ہیں اور یکا یک اجنبی سے بن جاتے ہیں اور گویا اپنے کانوں کے کنکشن منقطع کر لیتے ہیں، ان سے شکار کے ست اور طویل دورانیئے کے دوران جب بھی بات کرنے کی کوشش کی جائے وہ فوراً ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر "شش" کرتے ہیں اور آخر میں واپسی پہ اگر ناکام لوٹ رہے ہوں (جیسا کہ دس میں سے نو بار ہوا کرتا ہے) تو صرف اُسی بندے کو اپنی ساری ناکامی کا ذمہ دار قرار دے ڈالتے ہیں کہ جس نے اس سے اس عین "نازک موقع" پہ بات کرنے کی کوشش کی تھی اور یوں وہاں سے پانچ چھ سو مچھلیاں بھگا دی تھیں اور مزید یہ بھی بتاتے ہیں کہ مجبوأ کی جانے والی اس کی جوابی کوشش سے باقی کی سوڈیڑھ سو مچھلیاں بھی رفو چکر ہوگئیں تھیں، انہی صفات حسنہ کی بدولت مچھلی کے شکاری کوئی عام انسان نہیں ہوتے۔۔۔ وہ عموماً اپنی مسلسل اور بے تکان خاموش رہنے کی عادت کی وجہ سے خود بخود ارسطو اور کسی حد تک بقراط دکھنے لگتے ہیں، اِسی حلیئے و بشرے کے سبب بہتیرے سادے لوگ مشورہ لینے کے لئے ہمارے بن میاں کے پیچھے بھی جاتے ہیں اور جب بھی کوئی کسی دقیق مسئلے کا حل معلوم کرنے کے لئے اُن سے رجوع کرتا ہے تو وہ اسے مایوس نہیں کرتے اور اس کی پوری بات آنکھیں بند کر کے نہایت توجہ سے سر جھکا کر سنتے ہیں اور کافی دیر غور کرنے کے بعد سر اٹھا کر اور آنکھیں کھول کر نہایت سنجیدگی سے سائل سے کہتے ہیں کہ "بھئی تم کسی اور سے ہی پوچھ لو"

سرد اور خشک مزاج ہونے کے باوجود بن میاں اپنے شکار کی مہم پہ جانے جانے کے لئے بالعموم بہت پر جوش اور نہایت بیکل ہوئے دیکھے جاتے ہیں، کوئی کوہ پیما یا کوئی کھلاڑی یا کوئی جنگجو بھی اپنے ولولے میں انکے آگے ہیچ دکھائی دیتا ہے۔۔۔ ہر بار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب کے ایسا کچھ کر دکھائیں گے کہ گویا شکاریات کی تاریخ ہی بدل جائیگی لیکن چونکہ ان کا کمتر حیثیت کا سامان وہیل مچھلی کے شایان نہیں ہوتا لہٰذا بات کلو دو کلو کی مچھلیوں تک ہی محدود رہ جاتی ہے مگر ہر بار ایسا نہیں ہوتا، کبھی کبھی تو

آؤ تقریر سیکھیں

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو تقریر کے لئے بار بار بلایا جائے تو آپ منتظمین جلسہ کی تعریف میں کوئی کسر نہ چھوڑیئے ان کا فرداً فرداً نام لے کر کہیئے کہ یہ امید کی کرن ہیں، انقلاب کی آواز ہیں۔ یہ اپنی جہدِ مسلسل سے ہندوستان کی تقدیر بدلنے والے ہیں، وغیرہ۔ ان جملوں سے منتظمین کے ذہنوں میں بھی علامہ اقبال کا وہ "یقین" پیدا ہو جاتا ہے کہ لاؤڈ اسپیکر اور کرسیوں کے لئے چندے جمع کرنے اور جلسے کرنے میں ہی انقلاب پوشیدہ ہے۔

تقریر کے دوران منتظمین کی جانب سے آپ کو اکثر چھوٹی سی پرچی بھی بھیجی جائے گی جس پر لکھا ہوگا "آپ کا وقت ہو چکا مختصر کیجیے" آپ پوری ڈھٹائی سے مائک پر کھڑے رہیئے اور پرچی کو دور سے سامعین کو دکھا کر کہیئے "مجھے یہ اعلان کرنے کہا گیا ہے کہ باہر کسی صاحب کی سفید ماروتی نمبر۔۔۔ غلط کھڑی کی گئی ہے براہِ مہربانی فوری وہاں سے گاڑی ہٹالیں"۔

جو حضرات تقریر سیکھنے میں واقعی سنجیدہ ہیں اُن سے گزارش ہے کہ اس طرح کے بے شمار زرّین مشوروں کے لیئے ہم سے ضرور ملاقات کریں۔

از: علیم خان فلکی

ٹوکری خالی ہی پڑی رہ جاتی ہے اور دہائیاں دیتی محسوس ہوتی ہے لیکن مایوسی کفر ہے اور اللہ مسبب الاسباب ہے اور ستار العیوب ہے۔۔۔ اسی نے کچھ لوگوں کو یہ توفیق دی ہے کہ وہ مارکیٹوں میں مچھلی فروخت کریں اور ان بن میاں جیسے لوگوں کا بھرم رکھ لیں کہ جن کی ٹوکری شکار سے واپسی پہ سامان رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔۔۔ آخر میں احتیاطاً یہ بات کان میں ڈالے دیتا ہوں کہ اگر کوئی مچھلی کا شکاری سال میں کبھی خوش نظر آئے تو اس سے ذرا دور ہی رہیئے ورنہ وہ آپ کو ایسے موقع پر اپنے ایک روزہ کامیاب شکار کی ایسی "رال پرور" داستان سنا سکتا ہے کہ جو کم از کم 300 مچھلیوں پہ محیط ہوگی اور نتیجے میں قوی خدشہ ہے کہ داستان ختم ہوتے ہی آپ بھی اپنا گیلا دہانہ پونچھ کر اس کی بنسی اور ڈورا پکڑ کر اسکے ساتھ چل پڑ سکتے ہیں،،، ایک ایسے سفر کی جانب کہ جو آپکے آخری سفر سے پہلے کبھی ختم نہیں ہوگا۔

محمد ایوب صابر

مجھے تختِ طاؤس چاہیئے

تخت اُس شاندار کرسی کو کہا جاتا ہے جس پر براجمان ہونے کے بعد عام آدمی خود کو عوام الناس سے بالاتر کوئی بالائی مخلوق تصور کرتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ تخت سے اترنے کے بعد فوراً عالمِ بالا میں پہنچ جاتے ہیں۔ تخت نشینی کے لئے عمر یا تجربے کی کوئی حد مقرر نہیں۔ اس کے لئے حسب نسب ہی واحد پیمانہ ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ شیر خوار بچے بھی تخت نشین ہوتے ہیں اور کبھی ادھیڑ عمر لوگ بھی تخت نشین ہونے کے بعد اپنی حرکات وسکنات کی وجہ سے خوار ہوتے ہیں۔

برِصغیر میں تختِ طاؤس کو سب سے مشہور تخت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جسے مغل حکمران شاہجہاں نے چھ کروڑ روپے کی لاگت سے بنوایا تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب امریکی کرنسی کو کوئی گھاس بھی ڈالتا تھا کیونکہ گھاس کی قدر زیادہ تھی جبکہ آج تو ڈالر 100 روپے کی حد سے بھی تجاوز کر گیا ہے۔ اس قیمتی تخت کو 1052ء میں نادر شاہ ہندوستان سے لُوٹ کر ایران لے گیا تھا۔ اس تخت پر ایک مرصع مور پر پھیلائے کھڑا تھا جس کا سایہ بادشاہ کے سر پر ہوتا تھا۔ گویا بادشاہ اپنے آپ کو انسان کے سائے سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب بھی کسی انسان کے زیرِ سایہ آ گیا اس کے نیچے سے تخت ہی نہیں بلکہ سر سے تاج بھی چھین لیا جائے گا۔

ویسے تختِ طاؤس کی قیمت سے شاہجہاں کی شاہ خرچیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہمارے موجودہ حکمران بھی شاید اُسی شاہ کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آزادی کے بعد کراچی شہر، پاکستان کا پایہ تخت قرار دیا گیا تھا۔ اس کے بعد کچھ لوگوں کو خیال آیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا ہے اس لئے پاکستان کا پایہ تخت اسلام آباد ہونا چاہئے لہٰذا اسلام آباد کے نام سے راولپنڈی کے قریب نیا شہر آباد کیا گیا۔ شاید یہی وجہ کہ آج بھی لوگ اسلام کا نعرہ لگا کر اسلام آباد پہنچنا چاہتے ہیں۔ آج کل تخت کے بارے میں عجیب باتیں گردش کر رہی ہیں جن میں تیونس، مصر، لیبیا اور یمن کی مثالیں دی جا رہی ہیں جہاں پر عوام نے تخت کو تختہ بنا دیا ہے۔

جب ہم اسکول پڑھتے تھے تو استاد نے کہا کہ خوش خط ہونا ایک اضافی خوبی ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ خط وکتابت میں دلکشی پیدا کرنا ہے۔ اس وقت مجھے خطوط نویسی کی اہمیت کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔ آج یہ راز کھلا کہ مبہم لکھائی کی وجہ سے ہچکچاہٹ کا شکار ہو کر خط نہ لکھنے والے تخت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ کاش بچپن میں تختی دھونے کے بعد ملتانی مٹی کی تہہ جما کر تختی لکھنے کی مشق کرتے تو یہ شعر یاد نہ آتا:

> ہزاروں بار کہتا ہوں کہ خط لکھنے پہ دم نکلے
> بڑے بے آبرو ہو کر ترے "کھونچے" سے ہم نکلے

اسکول کے کمرہ ء جماعت کے اندر تختہ سیاہ پابندی سے استعمال ہوتا تھا۔ یہی تختہ سیاہ ذہن کے تاریک گوشوں کو روشن کرتا تھا۔ جب تختہ سیاہ کا استعمال کم ہوا تو لوگوں کے ذہنوں میں بھی

تاریکی کے آثار پیدا ہوگئے۔ اُن میں جدید طرز کی روشن خیالی آ گئی۔

نئے اِس دور نے اقدار کو پامال کر ڈالا
کہ سن کر ڈانٹ بیٹے کی پدر خاموش رہتا ہے

ایک سیانے کا کہنا ہے کہ تخت حاصل کرنے کے لئے شطرنج کا کھلاڑی ہونا لازمی شرط ہے۔ شطرنج کا کھلاڑی جانتا ہے کہ کب ہاتھی اور گھوڑے کو آگے بڑھانا ہے۔ کس طرح پیادے کے ذریعے شہ مات ہوتی ہے۔ گزشتہ دنوں کیمرے کی آنکھ نے ایک عجیب منظر اپنے ناظرین تک پہنچایا۔ جب ایک تخت نشین جوشِ خطابت سے لبریز ایک جھٹکے کے ساتھ تقریر کرنے کے لئے اٹھے تو ان کا تخت دھڑام سے زمین بوس ہوگیا۔ تخت کے چاروں پائے چت ہوگئے۔ کچھ دور کی کوڑی ملانے والوں نے وہیں کہہ دیا کہ یہ اُن کا دھڑن تختہ ہونے کی ریہرسل ہے۔ بہر حال مسند نشین کی پشت پر کھڑے چاق و چوبند مسلح شخص نے اپنے دونوں ہاتھوں کا سہارا دے کر ایک دفعہ پھر تخت کو اس طرح کھڑا کر دیا جیسے وہ گرا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے پایہ تخت کے اندر تخت کے پائے کمال پھرتی سے کھڑے کر دیئے۔ ظاہر ہے کہ کوئی مسلح شخص ہی ایسا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ ایک تہی دست شخص تو چارپائی کو کندھا دے سکتا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر چشمِ تخت گاہ بالکل حیران نہیں تھی کیونکہ وہ تخت گرنے کے اتنے مناظر دیکھ چکی ہے کہ اب اسے خود بھی اس طرح کے مناظر یاد نہیں:

دنیا میں ٹھکانے دو ہی ہیں اقتدار منش انسانوں کے
وہ جیل میں پائے کھاتے ہیں یا اُن کو پایہ تخت ملے

لوگ کہتے ہیں کہ تخت، بخت سے ملتا ہے۔ بعض حوالوں میں ایک پرندے ہُما کا بھی ذکر ملتا ہے۔ وہ پرندہ جس کے سر پر بیٹھ جاتا تھا اسے تخت کا وارث قرار دیا جاتا تھا۔ میں نے ہُما پرندے کی بہت تلاش کی تاکہ اسے پکڑ کر زبردستی سر پر بٹھا لوں لیکن آج تک وہ پرندہ نہیں مل سکا۔ ایک دن میں نے اپنی یہ خواہش ایک بزرگ کے گوش گزار کر دی۔ انہوں نے اپنی دانش اور تجربے کی بنیاد پر کہہ دیا کہ بھائی یہ ہُما کیسی ہُما شُما کے سر پر نہیں بیٹھتا۔ ہُما کسی زردار

کافی

آپ کو یقین آئے یا نہ آئے، مگر یہ واقعہ ہے کہ جب بھی میں نے کافی کے بارے میں استصوابِ رائے کیا اس کا انجام اسی قسم کا ہوا۔ شائقین میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے اُلٹی جرح کرنے لگتے ہیں۔ اب میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کافی اور کلاسیکی موسیقی کے بارے میں استفسارِ رائے عامہ کرنا بڑی ناعاقبت اندیشی ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بدمذاقی ہے جیسے کسی نیک مرد کی آمدنی یا خوب صورت عورت کی عمر دریافت کرنا (اس کا مطلب یہ نہیں کہ نیک مرد کی عمر اور خوب صورت عورت کی آمدنی دریافت کرنا خطرے سے خالی ہے)۔ زندگی میں صرف ایک شخص ملا جو واقعی کافی سے بیزار تھا۔ لیکن اس کی رائے اس لحاظ سے زیادہ قابلِ التفات نہیں کہ وہ ایک مشہور کافی ہاؤس کا مالک نکلا۔

از مشتاق احمد یوسفی (چراغ تلے)

کے سر پر ہی بیٹھنا پسند کرتا ہے۔ میں بھی دل میں تخت کی خواہش بھرے کہاں چین سے بیٹھ سکتا ہوں۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے "رسک العقیدہ" شخص کی طرح ایک پہنچے ہوئے بابا کے پاس پہنچنے کا رسک لے لیا۔

میں نے بابا سے عرض کیا کہ کسی طرح جنتر منتر کر کے ہُما میرے سر پر بٹھا دیں۔ میری عرضی سنتے ہی بابا کی آنکھوں میں انرجی سیور کی طرح چمک آ گئی۔ انہوں نے کہا 101 روپے دے دو، تمھارا کام ہوجائے گا۔ بابا کی بات سن کر میرے چہرے پر بھی کسی مدھم بلب کی طرح روشنی آ گئی۔ بابا نے دو ہفتے کی مہلت دی۔ میں نے 101 روپے دیئے اور ٹھمکے مارتا ہوا بابا کے آستانے سے نکل آیا۔ ابھی باہر نکلا ہی تھا کہ ایک شریف آدمی سے ٹکرا گیا۔ میں نے اُس سے معذرت کی اور کہا کہ بھائی معاف کرنا میں فقط جذبات سے مغلوب ہو کر آپ سے ٹکرا گیا ہوں۔ اس نے پوچھا کہ تمھیں کون سا تختِ سلیمانی مل گیا ہے جو اس قدر خوشی سے جھوم

رہے ہو؟ میں نے بابا سے ملاقات کا احوال سنایا کہ دو ہفتے بعد ہُما میرے سر پر ہوگا۔ اس بھلے آدمی نے کہا کہ تم تو بہت بھولے ہو، ہُما کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ میں نے کہا کہ ہُما جس کے سر پر بیٹھ جائے اُسے تخت مل جاتا اور بابا نے ہُما میرے سر پر بٹھانے کا "غیر سیاسی" وعدہ کرلیا ہے۔ اُس آدمی نے نے کہا کہ یہ وعدہ سچا ہے لیکن میں تمھیں ہُما کے بارے میں ذرا آگاہ کردوں۔ دراصل بابا کی بھینگی بیٹی کا نام ہُما ہے۔ جس کی ایک آنکھ دوسری کی رقیب نظر آتی ہے۔ ہُما کے لیے اب تک 101 رشتے آئے اور اسے دیکھنے کے بعد سب لوگ انکار کر کے چلے گئے۔ اب بابا اپنی بھینگی بیٹی ہُما کی شادی تم سے کرنا چاہتا ہے۔ دو ہفتے کے بعد وہ ہُما تمھارے سر پر سوار ہوگی ۔ پھر ہُما بلاناغہ تمھارے سر کو تختہ ٔ مشق بنائے گی۔ مجھے ساری بات سمجھ میں آگئی، اس کے بعد آج تک میں بابا کے آستانے پر نہیں گیا۔ مجھے ہُما سے زیادہ اپنا سر عزیز ہے۔

بات تختِ طاؤس سے شروع ہوئی تھی کہ نادر شاہ نے تختِ طاؤس حاصل کرنے کی خاطر ہندوستان پر حملہ کیا اور تخت حاصل کرلیا تھا۔ ایک خبر کے مطابق گزشتہ دنوں برطانوی قصبے ہنکس میں اچانک صبح سویرے جنگِ طاؤس نے خوف اور سنسنی پھیلادی۔ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ آس پاس کے علاقے سے جنگ باز موروں کی بڑی تعداد صبح سویرے سے ہی علاقے میں پہنچنا شروع ہوگئی تھی۔ جنگ اس قدر خوفناک صورت حال اختیار کرگئی کہ علاقے کے کتے اور بلیاں فرار ہونے پر مجبور ہوگئے۔ وہاں کے رہائشیوں نے بھی باقاعدہ پانی والے پستول سنبھال لئے اور جنگِ طاؤس میں عملی حصہ لیا۔ اِس سے ثابت ہوگیا کہ تخت وتاج کے لئے انسان ہی نہیں پرندے بھی طلب گار ہوتے ہیں۔

انسانی جنگ اور طاؤسی جنگ میں زیادہ فرق نہیں۔ دونوں اپنی برتری اور تخت کی خاطر لڑی جاتی ہیں۔ ہاں اتنا فرق ہے کہ انسانی جنگ میں شہر اور گاؤں تباہ ہوتے ہیں لیکن جنگِ طاؤس نے پھلوں اور سبزیوں کی ستیاناس کردیا ہے۔ اپنے پایہ تخت میں بھی اکثر جنگ کا سماں رہتا ہے۔ اس جنگ نے ہماری معشیت کا تختہ الٹ دیا ہے۔ ذہن کی کچھار سے نکل کر میرے بھی دو شعر اس جنگ میں کود پڑے، ملاحظہ کریں:

وہ جس نے جھگڑے کئے تخت وتاج کی خاطر
کوئی بھی کام کیا ہے سماج کی خاطر؟
کہے جو دل کہ چلو گھوم پھر کے آتا ہوں
چلا وہ جاتا ہے لندن علاج کی خاطر

سیّد ظفرؔ کاظمی

قصہ مٹھاس کے ہنگاموں کا

دوستو آپ جانتے ہیں کہ ہم ایک پیر ہیں اور ایک پیر کیلئے ہمیشہ صحت مند نظر آنا نہایت ضروری ہے ورنہ یہ سننا پڑتا ہے کہ "آپ کا یہ حال ہے تو ہمارا کیا حال ہوگا"

پیر اگر شدید بیمار ہو جائے تو عموماً اس بات کو خفیہ رکھا جاتا ہے ، اگر بات ظاہر ہو جائے تو پھر اسے امر قرار دے کر کئی کرامات بتائی جاتی ہیں کہ جوں ہی حضرت نے آنکھ کھولی تو ڈاکٹر قدموں میں گر پڑا اور نرس نے بوکھلا کر انجکشن کی سوئی ڈاکٹر کی گال میں گھسیڑ دی۔ اسی وقت در و دیوار سے نعروں کی آوازیں آئیں اور حضرت کلمہ پڑھتے ہوئے خالق کی یاد میں گم ہو گئے۔

ہمارا ابھی ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے اسلئے ہم داخل ہونے سے پرہیز کرتے ہیں۔ شوگر تو ہمیں بہت عرصہ سے ہے لیکن ہم نے اسے اپنے علاج سے ہی ٹھیک رکھا اور ممکنہ بد پرہیزی بھی کرتے رہے، انسولین سے بھی نفرت تھی۔

پچھلے دنوں ایک پیر میں سوجن ہوئی تو سب کو فکر پڑی دوست ڈاکٹروں نے دوائیاں تجویز کیں اور ہمیں اپنے نسخہ جات استعمال کرنے سے منع کیا، ڈاکٹر شاھد نے بتایا کہ گردوں کے افعال میں نقص کی بنا پر پاؤں میں سوجن ہے۔ سخت حیرانی ہوئی کہ گردوں کی سوجن پاؤں میں کیوں ہے، اس پر یہ شعر بھی یاد آ گیا:

خدارا چھوؤ نہ مری پنڈلیوں کو !
کہ اِن میں ہے دردِ جگر مام دینا

ساتھ ہی ہم شاعر کی طبی بصیرت کے بھی قائل ہو گئے کہ جگر کی تکلیف کو پنڈلیوں میں ثابت کر کے اُنہوں نے پاؤں اور گردوں کے باہمی ربط کی نشان دہی بھی کی ہے اور فاصلہ بھی درست رکھا ہے اگر وہ گردوں کا ذکر کرتے تو پھر وہ پاؤں کا ہی ذکر کرتے

مختلف دوائیاں کھا کر سوجن تو اتار لی لیکن ہمارے ایک بڑے کزن کو زیادہ فکر لاحق ہوگئی اور انہوں نے ہرٹ ہسپتال سے مکمل طبی معائنے کیلئے ہمارا وقت لے لیا۔

ہرٹ ہسپتال میں مختلف ٹیسٹ گئے، ہفتوں تک لئے گئے اور پھر وہیں زبردستی انسولین کا پہلا ٹیکہ لگایا گیا تا کہ ہم عادی ہو جائیں اور لگاتے رہیں۔ بہت سی گولیاں اور کیپسول بھی دئے گئے جو ابھی تک کھا رہے ہیں، ہر ماہ معائنہ بھی ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ہم گئے تو پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت خراب ہے اور وہ کچھ دیر میں آئیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کا وزن کافی ہے اسلئے ہم نے انھیں پرہیز کرنے اور عرقِ مہزل استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ مسکرائے اور مزید دو قسم کے کیپسول نسخے میں لکھ دئے۔

ہمارے ایک بھتیجے اشفاق اکاؤنٹس میں افسر ہیں اُنہوں نے

یہ اردو نثر کی خوش قسمتی ہے کہ آپ اسے زیادہ نہیں چھیڑتے۔ آپ کا بیشتر وقت اردو شاعری کی خبر لینے میں گزرتا ہے۔

از ڈاکٹر شفیق الرحمٰن (ذکی الحسن)

بھی اور ایک اور عزیز نے بھی مشورہ دیا کہ ایک مرتبہ یہاں بھی اپنا چیک اپ کرا لیں سو کل ہم ہرٹ ہسپتال سے معائنے اور وصولِ ادویات کے بعد وہاں گئے۔ عزیز نے استقبال کیا اور اندر بہت سی تحقیق کے بعد اجازت ملی۔ ہم نے سجاد سے کہا کہ پٹواری سے فرد لانا تو ہم بھول گئے ہیں شائد اسکی ضرورت نہ پڑ جائے لیکن اُنہوں نے بتایا کہ شناختی کارڈ سے کام چل جائے گا۔ ہماری آنکھوں کا عکس لیتے ہوئے خاتون نے پیچھے کھڑے ہمارے ڈرائیور سے دور ہٹ جانے کو کہا تا کہ آنکھیں چار کی بجائے دو ہی رہیں۔

اندر جا کر پتہ چلا کہ ڈاکٹر میٹنگ میں ہیں ہماری فائل بنوائی گئی فیس جمع ہوئی اور انتظار کرنے کو کہا گیا ایک ڈاکٹر پاس کھڑی تھیں جی چاہا کہ انھیں ہی دکھا لیا جائے لیکن پھر یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ ہماری امراض دوسری ہیں۔

کچھ دیر بعد ایک کمرے میں بلوا کر ایک خاتون نے مختلف سوال پوچھے اور بازو پر پٹی باندھ کر بلڈ پریشر چیک کرنے لگیں لیکن سٹیتھو سکوپ کی بجائے اُنہوں نے نبض پر ہاتھ رکھ کر جانچنا شروع کیا۔ ہم نے کوشش کی کہ نارمل رہیں۔ چیک کرنے کے بعد انہوں نے مسکرا کر بتایا کہ آپ نارمل ہیں۔ یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔

پھر ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں بھیج دیا گیا اور بتایا گیا کہ آپ پہلے مریض ہوں گے لیکن ہم دوسرے تھے جب پہلے باہر نکلے تو ہم گئے

معائنہ شروع ہوا ٹیسٹ دیکھے گئے پاؤں پر پن چبھو کر پوچھا گیا کہ آپ کیا محسوس کرتے ہیں۔ ہم نے بتایا کہ بہت زیادہ محسوس کرتے ہیں۔

آخر کئی قسم کے امتحانات کے بعد پتہ چلا کہ وہ سب دوائیاں درست ہیں جو ہم لے رہے ہیں اور پرہیز کے ہمراہ انھیں جاری رکھتے ہوئے معائنہ کراتے رہنا ہے۔

"یہ تو ہم کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے" ہم نے کہا۔

سجاد نے بہت مزیدار چائے پلائی، رخصت ہوئے شام تک محمود فیض کے پاس رہے رات کا کھانا بھی وہیں کھایا، جس میں پرہیز والی کوئی چیز نہیں تھی۔

نادر خان سرگروہ

انڈا سکوپ

(انڈے اور مرغی پر ایک سیر حاصل بحث)

انڈا بھی ایک بے زبان جانور ہے۔ یہ اور بات ہے کہ چل پھر نہیں سکتا، لیکن اِس کو ذرا سی گرمی دی جائے تو اِس میں سے کوئی چلتا پھرتا نظر آ سکتا ہے۔ انڈے کی شکل بیضوی ہوتی ہے۔ یہاں ایک سوال قابلِ غور ہے کہ کیا انڈے کی بھی کوئی شکل ہوتی ہے؟ ویسے ہم نے دیکھا ہے کہ انڈے پر دو آنکھیں، ناک اور منہ بنا کر ایک شکل بنائی جاتی ہے، جس سے بد شکل چھپکلیوں کو ڈرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مُرغی کے ہاں ہر روز ایک انڈا پیدا ہوتا ہے۔ اِس حساب سے دنیا میں سب سے زیادہ آبادی انڈوں کی ہوئی۔ اگر دنیا کی بیشتر مرغیاں سونے کے انڈے دیتیں تو سونے کا بھاؤ انڈے کے برابر ہو جاتا اور انڈا سونے کے بھاؤ بکتا۔ انڈا کبھی اپنے بل پر سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اُسے کہیں رکھو تو لُڑھک لُڑھک جاتا ہے۔ انڈے کو اگر پکڑ کر سیدھا کھڑا کیا جائے تو وہ صفر کا ہم شکل نظر آتا ہے، اسی لیے جب صفر کی بات نکلتی ہے تو انڈے کا ذکرِ خیر ہوتا ہے۔

پتا نہیں مُرغی کے پیٹ میں پیکنگ کا کون سا ایسا نظام ہوتا ہے جو وہ انڈے کو اِتنے خوب صورت اور نفیس کیپسول کی شکل میں برآمد کرتی ہے۔ یہ اُس وقت سے ہو رہا ہے جب مُرغی کو یہ پتا بھی نہیں تھا کہ انڈا کیا چیز ہوتی ہے۔ قدرت نے مُرغی کے بطن سے سیدھے مُرغی پیدا نہیں کی۔ پہلے انڈا پیدا کر کے ہمیں یہ اختیار دیا کہ انڈا کھاؤ! اگر انڈا کھانے کا موڈ نہیں تو تھوڑا انتظار کرو اور مُرغی کھاؤ!

ہمارے دوست پُر جوش پُوری انڈوں کے بارے میں اچھی خاصی معلومات رکھتے ہیں۔ اُن کے اندازے کے مطابق، دنیا میں سب سے زیادہ انڈے، انسان اور کوّے کھاتے ہیں۔ ان کے

بعد بے وزن شعرا اور بے سُرے گلوکاروں کا نمبر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں، ''اسکول کے زمانے میں مجھے وقتاً فوقتاً مُرغا بننے کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ لیکن افسوس ! استاد نے کبھی مجھے مُرغا نہیں جانا۔ ہر بار اِتنی عمدگی سے مُرغا بننے کے باوجود وہ مجھے گدھا ہی سمجھتے تھے اور نتیجے میں کسی نہ کسی پرچے میں اَنڈا دیتے تھے۔''

مُرغیوں کے مقابلے میں مُرغوں کے پاس کرنے کے لیے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ یوں بھی پولٹری کی صنعت میں اِنہیں بے مصرف سمجھا جاتا ہے۔ یہ نہ انڈے دیتے ہیں نہ سیتے ہیں۔ نَر چوزوں کو اُن کے پیدا ہونے کے ۲۴ گھنٹوں کے اندر، گرائنڈر میں ڈال کر یا بجلی کے شاک (Electrocution) کے ذریعے قتل کر دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ مُرغے نہ ہوتے تو مُرغیاں بس کُڑک بیٹھی رہتیں۔ مُرغے؛ دو اہم فرائض انجام دیتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ انڈے کی تخلیق میں اپنا فرض (اور کردار) ادا کرتے ہیں۔ دُوسرے۔۔۔ بانگ دینے کے فرض کو اپنے اوپر واجب کر لیتے ہیں۔ گاؤں کے مُرغے جب بانگ دیتے ہیں تب 'اپنے اپنے 'گھوڑے بیچ کر سو رہے لوگوں کی آنکھیں کھلتی ہیں اور وہ یہ کہتے ہیں کہ اب ہمیں اُٹھنا چاہیے۔ اور شہروں میں 'ایک دوسرے کے 'گھوڑے بیچ کر سو رہے لوگ جب آنکھیں کھولتے ہیں تو پولٹری شاپ کے مُرغے کہتے ہیں کہ اب ہمیں بانگ دینا چاہیے۔ لیکن کبھی کبھار بانگ دینا کچھ مُرغوں کی عادت بن جاتی ہے تو کچھ کو بانگ دینے کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ ایسے مُرغوں کی ٹائمنگ اَپ سیٹ ہو جاتی ہے۔ اُن کا جب دل کیا، منہ اُٹھایا اور بانگ دے دی۔ ایسے مُرغوں کی ککڑوں کُوں سے تنگ آ کر لوگ اُن کے حلق پر چھری پھیر کر، اب کی، تب کی۔۔۔ سب بانگوں کو اپنے حلق سے اُتار لیتے ہیں۔

مُرغی کا شمار جزوی طور پر پرندوں میں ہوتا ہے، جو پَردار ہونے کے باوجود اُڑ نہیں سکتی۔ غنیمت ہے، مُرغی اُڑ نہیں سکتی، ورنہ اُس کو دبوچنے میں انسان کی جان نکل جاتی۔ جب کہ پُر پیچ خطوط پر جھپا جھپ دوڑنے والی مُرغی ہی ہمارے ہاتھ نہیں آتی۔ اُسے پکڑنے جھکو تو ٹانگوں کے بیچ سے نکل نکل جاتی ہے۔ ایک مرتبہ پُر جوش پُوری مُرغی کے پیچھے دوڑ لگاتے ہوئے، بے خیالی میں جانے کہاں کہاں سے ہوتے ہوئے، بہت دُور نکل گئے۔ جب تھک گئے تو دَم لینے کو رُکے۔ ہانپتے ہوئے پُر جوش پُوری کو دیکھ کر مُرغی بھی رُک گئی اور اُن کی بڑی بڑی آنکھوں میں اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ڈال کر سوچنے لگی کہ ''یونہی اکیلے اکیلے دوڑ لگانے کا کیا فائدہ۔'' پُوری جی کو ہم نے بارہا سمجھایا کہ مُرغی کو پکڑنے کے لیے دانہ ڈالنا پڑتا ہے۔ دانہ نہ ڈالو تو مُرغی گھاس نہیں ڈالتی۔

ویسے۔۔۔ ایک منفرد ترکیب ہے ہمارے پاس، وہ یہ کہ

میراجی

چند ہی دن پہلے میراجی میرے پاس آیا اور میرے سامنے اپنی دو کتابیں پھینک کر بولا ''اس میں سے ایسے گیت چن دیجیے جو سمجھ میں آسکتے ہوں!''

میں یہ مطالبہ سن کر حیران رہ گیا۔

''ہمیں ایک پروڈیوسر کو سنانے ہیں'' میراجی نے کہا ''لوگ کہتے ہیں ہمارے گیت سمجھ میں نہیں آتے، آپ چُن دیں ورنہ ہم آپ کا آملیٹ بنا دیں گے۔''

''مگر میں کیوں چن دوں میراجی؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اس لئے کہ وہ پروڈیوسر اتنا ہی جاہل ہے، جتنے آپ ہیں، آپ کی سمجھ میں آ گئے تو اُس کی سمجھ میں بھی آ جائیں گے اور ہمیں کام مل جائے گا۔''

احمد بشیر (جو ملے تھے راستے میں)

اِک آہِ آتشیں میں ڈبل کام ہو گیا
اُس کو بخار غیر کو سرسام ہو گیا
(بیڈھب بدایونی)

H کی خرمستیاں

ہمارے ملکی معاملات میں جی ایچ کیو کا عمل دخل (عمل کم دخل زیادہ) کبھی کبھی اتنا شدید ہوتا جا رہا ہے کہ وہ ''جی ایچ کیوں'' لگنے لگتا ہے۔ لیکن سیانے کہتے ہیں کہ جہاں پہ ''جی'' آ جائے، وہاں کیوں کا جواز ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں تک آتے آتے تو ہماری جاہلانہ 'جی حضوریوں' نے پورے معاشرے سے کیوں کا گلہ گھونٹ کر رکھ دیا ہے اور اب چاروں طرف بے مہار حکمرانی کا ''H'' دندناتا پھرتا ہے۔ اب تو یہ H دل و دماغ سے ہوتا ہوا کاروبارِ حیات پر اس طرح محیط ہو گیا ہے کہ سڑک کے دونوں کناروں پر اُگے ہوئے درختوں کی ٹہنیاں ایک دوسرے سے گلے ملتی ہیں تو H کی شکل سامنے آ جاتی ہے۔ دو آدمی کھڑے ہو کر مصافحہ کرتے ہیں تو H بن جاتا ہے۔ کسی دیوار کے ساتھ لگی سیڑھی پر نظر پڑتی ہے تو گویا H کا وسیع سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

اشفاق احمد ورک (ذاتیات)

جب بھی آپ مرغیوں کے غول سے مرغی پکڑنا چاہیں تو کسی دوسری مرغی پر نگاہ رکھیں، اِس طرح آپ کی مطلوبہ مرغی بلا مشقت آپ کے ہاتھ آ جائے گی۔ (یہی دنیا کا اصول بھی ہے، جس چیز کے پیچھے آپ دوڑتے ہیں، وہی آپ کے ہاتھ نہیں آتی) ہاں تو ۔۔۔ بتائے گئے اُصول کے تحت تمام مرغیاں پکڑ پکڑ کر ڈربے میں ڈالتے جائیں۔ پھر جب آخری مرغی کی باری آئے تو سَر کھجاتے ہوئے سوچنے میں وقت ضائع نہ کریں۔ پہلے سے پکڑی گئیں مرغیوں میں سے ایک کو کھلا چھوڑ دیں اور آخری مرغی کو دبوچ لیں۔

ہر مُرغی کے سَر پر ایک کلغی ہوتی ہے اور گردن سے ایک جھالر لٹکی ہوتی ہے۔ ایک مُرغی کی کلغی دوسری سے جدا ہوتی ہے، جس سے مرغیاں ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں۔ پُر جوش پُوری کہتے ہیں کہ ایسی ہی کلغیاں چینیوں کے بھی ہونی چاہیے، تا کہ پتا تو چلے کہ اُن میں 'یہ چینی' کون ہے اور 'وہ چینی' کون۔

مُرغی پانچ مہینے کی عمر سے ہی انڈے دینا شروع کر دیتی ہے۔ اُس کے پیٹ میں انڈے کی تخلیق کا عمل تقریباً بیس گھنٹوں میں مکمل ہوتا ہے۔ ہائے بے چاری مُرغی! ایک انڈا دِیا نہیں کہ اَگلے کی تیاری شروع۔ اگر اُس کی پیشانی ہوتی تو ہمیں پتا چلتا کہ اُس کے ماتھے پر شکن تک نہیں آتی۔ اور یہ کہ وہ کتنی 'انڈا پیشانی' سے انڈا دیتی ہے۔ (معاف کیجیے) وہ کتنی خندہ پیشانی سے انڈا دیتی ہے۔ (انڈے کا ذکر اِتنی کثرت سے ہو رہا ہے کہ بات بات پر منہ سے انڈا نکل رہا ہے)

تو جناب! بے چاری مرغی معلوم ہی نہیں ہونے دیتی کہ اُس کے انڈا ہُوا بھی ہے۔ ہمیں خود اُس کی تخلیق کو 'دریافت' کرنا پڑتا ہے کہ کدھر دیا ہے؟ کہاں دیا ہے؟

ایک زمانے تک 'مَرغزار' کو ہم 'مُرغ زار' پڑھتے تھے اور اِس کا مطلب پولٹری فارم سمجھتے تھے۔ بلکہ کئی موقعوں پر ہم نے یہ لفظ استعمال کر کے اپنی زبان دانی کا رُعب بھی جھاڑا۔ رُعب بھی ایسا کہ اچھے اچھوں نے ہمارے آگے زانُوئے 'تلفُّظ' تہ کیا۔ لیکن جب ہمارے کلون (Clone) کا ظہور ہوا تو پتا چلا کہ اِس لفظ کے صحیح معنی ہیں ۔۔۔ سبزہ زار، ایسی جگہ جہاں دُور دُور تک ہری گھاس اُگی ہو۔ لیکن پُر جوش پُوری نے ہمیں ایک بار گمراہ کرنے کی کوشش کی اور مَرغزار کے یہ معنی بتائے کہ ایسی جگہ جہاں دُور ۔۔۔ دُور تک ہری ہری گھاس اُگی ہو، اور وہاں ہزار مُرغیاں چُگ رہی ہوں۔ ہم تو کہتے ہیں 'مرغزار' پر مرغیوں کا حق زیادہ بنتا ہے۔ پولٹری فارم کے متبادل کے طور پر اِس لفظ کو مُرغیوں کے حوالے کر دینا چاہیے۔ ہری گھاس کے پاس تو پہلے ہی سبزہ زار کا لفظ موجود ہے۔ کسی کے پاس دو ۔۔۔ دو اور کسی کے پاس ایک بھی نہیں۔ یہ ہے اُردو کی حالتِ زار۔

انڈے سے ہوتے ہوئے بات اُردو کے مسئلے تک آ پہنچی، جو دنیا کے اُن پیچیدہ اور ٹھوسیدہ (جیسے پیچ سے پیچیدہ، ویسے ہی ٹھوس سے ٹھوسیدہ) مسائل میں سے ایک ہے، جن پر بات کرنا، انڈے اور مُرغی کی بحث کے مترادف ہے۔ جو صفر سے شروع ہوتی ہے اور گھوم پھر کر صفر پر ہی لَوٹ آتی ہے۔

جو ختم ہو کسی جگہ ، یہ ایسا سلسلہ نہیں

سیّد ممتاز علی بخاری

آم بادشاہ اور ہم فقیر

آم کھانے کا تجربہ ہمارے لیے ہمیشہ سے ناخوشگوار رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آم کھانے کھلانے والی محفلوں سے دور ہی رہتے ہیں۔ ہمارے اکثر ادبی دوست آم کے ساتھ روا رکھے گئے ہمارے رویے کو دیکھ کر اس بات سے انکاری ہو جاتے ہیں کہ ہمارا شمار بھی ادیبوں میں ہو سکتا ہے۔ وہ ہمیں اقبال و غالب کی مثالیں دیتے ہیں کہ جو جنون کی حد تک آم کے عشق میں مبتلا مشہور تھے۔ اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ادیب کے لیے آم سے محبت ضروری ہے۔ ہم ان کے اس مؤقف سے اتفاق نہیں کرتے اور اپنی اس سوچ کی تائید میں ہم انہیں میر تقی میر، میر درد، نواب داغ دہلوی اور فیض و مومن کی مثالیں پیش کرنے سے ذرا بھر بھی نہیں دریغ کرتے۔ حالانکہ اس حوالے سے ہمارے پاس کسی قسم کی کوئی ضعیف روایت بھی دستیاب نہیں جس سے ہم ان حضرات کی آم سے نفرت ظاہر کر سکیں۔ ہمارے دوست بھی ہم سے یہی سوال کرتے ہیں کہ آیا ہمارے پاس اس قسم کی کوئی معلومات ہیں جو ان کے مؤقف کی مخالفت میں ہم انہیں پیش کر سکیں لیکن ہم زیر و زبر تو کر سکتے ہیں لیکن پیش کرنا ممکن نہیں کیونکہ ہمارے علم میں بھی ان کی کوئی حرکت تاریخ محفوظ کرنے سے محروم رہی یا پھر آم تاریخ دانوں کے پسندیدہ پھلوں میں شامل ہے۔ ہم دوستوں، آم محب لوگوں اور تاریخ کے اس گٹھ جوڑ کو اس دلیل سے رد کرتے ہیں کہ اگر ان حضرات کی آم سے نفرت کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی تو آپ مجھے ان کی آم سے محبت ہی کا کوئی ثبوت فراہم کر دیں۔

آم کو پھلوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ یہ عہدہ اسے کس الیکشن کمیشن کے ذریعے حاصل ہوا تاریخ اس کے بارے میں کچھ بھی بتانے سے قاصر ہے۔ خیر جس نے بھی دیا اس نے پھلوں کی دنیا کے ساتھ نہایت زیادتی کی وگرنہ اِس منصب کے اس سے بڑھ کر کئی پھل اہل تھے لیکن شاید کہیں دھونس دھاندلی والا معاملہ ہو گا یا پھر اس الیکشن میں باقی قابلِ ذکر پھل بائیکاٹ کیے بیٹھے ہوں گے۔ ہم آم کو اس لیے پھلوں کا بادشاہ ماننے کے مخالف ہیں کہ یہ پھل شاہانہ طریقے سے نہیں کھایا جا سکتا۔ اس کو کھانے کے لیے ادب اور تمیز کے دائرے سے نکلنا پڑتا ہے۔

ہمارے اکثر احباب ہماری اس چڑ سے بخوبی واقف ہیں اور اکثر و بیشتر ہمیں تنگ کرنے اور ہم سے جان چھڑانے کے لیے محفل میں آم منگوا لیتے ہیں اور پھر آم کو دیکھتے ہی ہم رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ اب یہ تو ہمیں معلوم نہیں کہ انہیں آم سے زیادہ محبت

ہے یا صرف ہمیں تنگ کرنے کا چکر ہے۔جب کبھی انہیں ہمیں تحفہ دینے کے لیے دل کرتا ہے تو وہ آم ہی تحفے میں دیتے ہیں۔

ابھی پچھلے دنوں ہی کا ذکر ہے کہ ہمارے ایک مہربان ثقلین ہارون (جو مظفر نگر کے رہنے والے تھے) ہمیں ملنے کے لیے جب تشریف لانے لگے تو انہوں نے گھر سے نکلنے سے پہلے ہم سے رابطہ کیا۔سلام دعا کے بعد ہم سے سوال کیا کہ آپ سندھڑی، چوسر، لنگڑا اور قلمی میں سے آپ کیا پسند کرتے ہیں؟ اب یہ تو ہمارے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ یہ کن بلاؤں کے نام ہیں۔خیر ہماری چھٹی حس کچھ ہم پر زیادہ ہی مہربان ہوگئی اور ہم نے اس کی خدمات لیتے ہوئے اتنا سمجھ لیا کہ یہ کسی کھانے ہی کی چیز کا نام ہوگا۔اصل میں یہ نام سنتے ہی ہمارے منہ سے رال ٹپکنا شروع ہو گئی تھی جسے ہم نے بڑی مشکل سے قابو کر رکھا تھا۔ہم نے اللہ توکل کرتے ہوئے اندازے سے قلمی کا نام لیا کیونکہ اس نام سے ادیبانہ رنگ جھلکتا تھا باقی تو نام بھی عجیب وغریب تھے۔ہماری اس لاعلمی کی وجہ یہ تھی کہ آم سے ہماری واقفیت بہت ہی کم ہے اور دوسرا ہم اس بات سے لاعلم تھے کہ آم کی جائے پیدائش کون کون سی ہے۔جب ہماری ثقلین سے ملاقات ہوئی تو کافی دیر گپ شپ کرنے کے بعد اُس نے ایک چھوٹی سی پیٹی ہمارے حوالے کی۔ہم نے دریافت کیا کہ اس میں کیا ہے تو اس نے بڑی رسائیت اور محبت واخلاص کو سمیٹتے ہوئے ہمیں اس میں آموں کی موجودگی کی دھماکہ خیز خبر سنائی۔اس کی یہ بات سنتے ہی ہم اپنی جگہ سے اچھل پڑے اور بے اختیار ہماری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ہماری یہ حالت دیکھ کر ثقلین فوراً ہمیں سہارا دینے کو لپکے۔اگر وہ ایک سیکنڈ بھی دیر کرتے تو ہم زمین بوس ہو جاتے کیونکہ ان کے سہارا دیتے ہی ہمارے ہوش وحواس کھو گئے۔ثقلین نے ہمیں پانی پلایا اور کافی دیر کی کوشش کے بعد ہمیں ہوش دلانے میں کامیاب ہوا۔ہمیں جب ہوش آیا تو ہم نے سب سے پہلے ثقلین کا متفکر چہرہ دیکھا۔اس نے جیسے ہی ہماری کھلی آنکھیں دیکھیں تو خود پر قابو نہ رکھ سکے اور فوراً اس بے ہوشی کی وجہ دریافت کرنے لگے۔اب ہم اس شش وپنج میں مبتلا ہو گئے کہ انہیں اصل بات بتائی جائے یا نا۔۔۔ کیونکہ وہ اتنے دور سے اتنے پیار اور خلوص کے ساتھ ہمارے لیے تحفہ لایا تھا۔اب اسے کیا علم کہ ہم جو اقبال وغالب کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے اور ان کے اشعار ہر وقت ہماری زبان پر تھرکتے رہتے ہیں، ہمیں ان کی محبوب ترین شے سے اتنا گریز ہو سکتا ہے حالانکہ ان کے خلاف کوئی فتویٰ وغیرہ بھی موجود نہیں۔بڑی مشکلوں سے ہم نے انہیں اپنے اور آم کے تعلقات سے آگاہ کیا اور درخواست کی کہ یہ آم آپ کسی اور دوست کو دے دیں کیونکہ ہم

کسی جماعت میں شامل ہونے کا طریقہ کار کیا ہو یہ ایک اہم نکتہ ہوتا ہے۔ جماعت کے انتخاب میں جلد بازی سے کام نہ لیجئے۔ اگر آپ نے شوقِ گل بوسی میں کانٹوں پر زبان رکھ دی تو مستقبل لہولہان ہو سکتا ہے۔ پہلے یہ طئے کر لیجیئے کہ کس پارٹی میں شامل ہونا ہے۔ پھر اس کی مخالف پارٹی میں شامل ہو جایئے اس لیئے کہ آپ جس پارٹی میں داخل ہونا چاہیں گے وہاں پہلے ہی سے اتنے بڑے بڑے لیڈر موجود ہوں گے کہ آپ کو کوئی گھاس نہیں ڈالے گا۔آپ جیسے جونیئر تو سینئر دولہوں کے سامنے باراتیوں کے طور پر کام آتے ہیں۔اور ویسے بھی بقول یونس بٹ کہ "چھوٹے لیڈر پیدا ہونا یوں بھی بند ہو گئے ہیں،،، جتنے پیدا ہوتے ہیں سارے بڑے لیڈر پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے وہاں آپ کی دال گلنا مشکل ہے۔ ترقی کے زینے چڑھتے چڑھتے ماہ وسال نکلتے جائیں گے محنت اور ایمانداری کے ذریعے ترقی کرنے کی آرزو میں آپ بوڑھے ہو جائیں گے۔اگر تمام بوڑھوں کو اوورٹیک کرتے ہوئے ان سے بھی بڑا لیڈر بننا چاہتے ہیں تو مخالف پارٹی میں شامل ہونے کے بعد اپنی پسندیدہ پارٹی کے خلاف دھواں دھار تقریریں کرنا شروع کر دیجیئے۔ مہنگائی، فسادات اور رشوت اور ہر بدانتظامی کی ذمہ داری اسی کے سر ڈالیئے۔ہو سکے تو طوفان زلزلے اور قحط کا ذمہ دار بھی ان کو قرار دیجیئے۔

علیم خان فلکی (آؤ لیڈری سیکھیں)

اس تحفے کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ ثقلین یہ سن کر غصے سے لال پیلا ہوگیا اور کہنے لگا کہ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ آپ ان آموں کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ میں اتنے دور سے کتنے خلوص کے ساتھ تحفہ لایا ہوں۔ اب آپ کو یہ قبول کرنا ہی ہو گا۔ بڑی منت سماجت کے بعد ہم نے اسے اس بات کے لیے راضی کر ہی لیا کہ وہ پیٹی سے پانچ چھ آم نکال کر ہمیں دے دیں اور باقی پیٹی وہاں ملاقات کے لیے آنے والے احباب کے ذوقِ خورد کی نظر کیے جائیں۔ انہوں نے فوراً پانچ چھ آم الگ کر کے ایک شاپنگ بیگ میں ڈالے اور باقی کا افتتاح کرنے کے لیے ایک پلیٹ میں ڈال کر ہمارے سامنے رکھ دیے۔ اب ہم ایک بار پھر پریشان ہوگئے کیونکہ ہم نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی محفل میں آم نہیں کھائے تھے۔ اس وقت ہماری وہی حالت تھی جیسی ایک دیہاتی کی چھچ کانٹے دیکھ کر ہوتی ہے۔ لیکن پھر پتا نہیں کیسے ثقلین کو ہم پہ رحم آگیا کہ اس نے ہمیں بنا آم کھلائے رخصت کی ایک دم اجازت دے دی۔ ہم جب وہاں سے نکلنے لگے تو ہم نے چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں کوئی ہمارا جان پہچان والا ہمیں آموں کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑ نہ لے۔

رات کا وقت تھا اور ہماری یہ ''چوری'' پکڑے جانے کے آثار بھی بہت کم تھے لیکن احتیاط پھر بھی ضروری تھی کہ آموں کا یہ شاپنگ بیگ کہیں ہماری برسوں کی کمائی عزت پر داغ نہ لگا دے کیونکہ ہم سرف ایکسل کی انتظامیہ کی طرح داغ کو اچھا نہیں سمجھتے۔ ہم نے آموں کا تھیلا ایسے اٹھا رکھا تھا جیسے بم ڈسپوزل سکواڈ والے بم اٹھاتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ہی ہم اپنے ہاسٹل پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر ہم نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا۔ اپنی پھولی ہوئی سانسوں کو درست کیا اور پھر اس سوچ میں پڑ گئے کہ انہیں کیسے ٹھکانہ لگایا جائے۔ ہمارے آم نہ کھانے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ آم کھاتے ہوئے بندہ انسان کم اور بندر زیادہ لگتا ہے۔ ہم اس وقت کمرے میں اکیلے تھے سو ہم نے ایک آم تھیلے سے نکالا اور تھوڑی دیر اسے ٹینس بال کی طرح دیوار پر پھینکتے رہے۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ کہیں آم پھٹ نہ جائے کیونکہ پھٹا ہوا آم کھانا اور پھٹے ہوئے دودھ کو پینا یقیناً ایک دردناک مرحلہ ہوتا ہے۔ خیر کچھ دیر میں آم جب پینے کے قابل ہوگیا تو ہم نے ایک سوراخ کیا اور لگے آم پینے۔۔۔۔ آم خود سے دشمنی بھلا کیسے بھول سکتا تھا؟ ہم نے جیسے ہی آم کو دبایا تو اس کی گٹھلی ایک دم ہمارے ناک منہ کو ماسٹر پینٹ کی طرح ایک رنگ بنا گئی۔ منہ صاف کرنے کے چکر میں ہم ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مار ہی رہے تھے کہ اچانک ہمارے کمرے کا دروازہ کھلا اور میرے چند ہم نفرتِ آم دوست (جو آم سے نفرت کے حوالے سے میرے ہم پیالہ و ہم نوالہ تھے) دروازے سے داخل ہوئے۔۔۔!!

باہر شیر بیٹھا ہوا ہے؟

''میں ذرا پڑوس میں جا رہی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے بیگم لپک جھپک کر باہر کو چلیں، لیکن فوراً ہی اُلٹے قدموں لوٹ آئیں۔ واپسی کی وجہ پوچھی تو کہنے لگیں کہ باہر شیر بیٹھا ہوا ہے، سوچا اُس کے لیے کچھ لے لوں۔ ہم بے اختیار ہنس پڑے۔ شیر کو اگر سالم آپ مل جائیں تو اُسے بھلا اور کیا چاہیے۔ ہم نے دل میں سوچا۔ لیکن ہمارے خیالات و جذبات سے بے خبر اُنھوں نے جلدی جلدی شلوار قمیص کا ایک نیا جوڑا اٹھایا اور دھڑ سے باہر نکل گئیں، جیسے شیر کو آدمیت کے جامے میں لانے کا ارادہ ہو۔

''اب تک شیر اپنا فرض بخیر و خوبی نبھا چکا ہوگا۔'' یہ سوچ کر اپنے جذبۂ تجسس کے تحت ہم باہر نکل آئے، مگر وائے حسرت۔۔۔۔! دیکھا تو شیر محمد چوکیدار اپنی تین ٹانگ والی کرسی پر بڑے ٹھسّے سے بیٹھا ہوا تھا اور بیگم صاحبہ بڑی خوش مزاجی کے ساتھ اُس کا حال احوال پوچھتے ہوئے اُسے شلوار قمیص کا تحفہ پیش کر رہی تھیں۔ ہمیں شیر محمد پر رشک آنے لگا۔۔۔۔!

ابوالفرح ہمایوں (جوئے لطافت)

فہد خان

۵۳۔ اے زبیر ہال

یہ کہانی یونی ورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، لاہور کے ہاسٹل زبیر ہال کے کامن روم، کمرہ نمبر 53اے کی ہے۔ یہ کمرہ پہلی منزل کی سیڑھیاں چڑھتے ہی سامنے نظر آتا ہے اور اگر آپ زبیر ہال کے باہر کھڑے ہو کر دیکھیں تو آپ کو بزبانِ انگریزی "زبیر ہال" لکھا نظر آئے گا۔ یہ الفاظ اس کمرے کی دیوار کی پشت پر ہی لکھے گئے ہیں۔ گویا یہ کمرہ زبیر ہال کی پیشانی ہے۔ (اس کے اندر کا ویسا ہی کاٹھ کباڑ ہوتا ہے جیسا بعض لوگوں کی پیشانی کے اندر کا ہوتا ہے!)

پہلی منزل کی سیڑھیاں ختم ہوئیں تو دروازہ سامنے ہی تھا۔۔۔"روم نمبر 53اے"

"شکر خدایا کہ تھا جس کا انتظار، مل ہی گیا وہ شاہکار!" اویس نے ایک تھکی ہوئی آہ نکالی، جس میں مسرت کی آمیزش تھی۔

"صبح سے کمر پر اور ہاتھوں میں سامان لادے تنگ آ گیا ہوں۔ شکر تیرا اے مولا، کہ اب ذرا آرام نصیب ہوگا!" اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے خود کلامی کی۔

اس کے اور کمرے کے دوران بس چند قدموں کا فاصلہ تھا اور ان چند قدموں میں اس نے بہت کچھ ذہن میں دہرا لیا تھا: ابو کا خواب تھا اس کا انجینئر بننا، ماں کی محبت اس کے لئے دعائیں کرنا، ہمیشہ کی محنت کا صلہ تھا یہ یوای ٹی کا داخلہ اور پھر آخر کو آ ہی گئے!۔۔اور ساتھ ہی یہ بھی سوچ ڈالا کہ مملکتِ پاکستان کی اس عظیم یونی ورسٹی کا ہاسٹل کیسا ہوگا؟

"ایک مسہری جس پر خوب صورت سی چادر ڈلی ہوگی، ایک کشادہ سی الماری کہ جس میں سب سامان آسانی سے سما جائے، فرش پر چاندنی تو نہیں البتہ ایک پرانا سا قالین، ہوگا، وغیرہ وغیرہ (شاید بار ہا استعمال سے کچھ چیزیں خراب ہو گئی ہوں مگر کوئی پروا نہیں، سب چلے گا!) اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا، یہ سوچ کر کہ:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

دروازہ کھولتے ہی یوں لگا جیسے شاہی قلعہ کی زیرِ زمین کال کوٹھڑی میں قدم رکھا ہو! کچھ نظر ہی نہ آیا۔ موبائل (آلۂ گشتی) کی بتی روشن کی تو محسوس ہوا کہ ایلس ونڈر لینڈ میں تو نہیں آئی مگر اویس "بندر لینڈ" میں ضرور پہنچ گیا تھا۔ یہ کمرہ تھا یا کوئی سٹور روم یا کباڑ خانہ۔ شاید کباڑ خانہ اور سٹور بھی اس سے بہتر ہوں کہ وہاں چیزیں سینت سینت کر، سلیقے اور طریقے سے، خوب محفوظ کر کے رکھی جاتی ہیں؛ مگر یہاں کا حال تھا کہ الامان والحفیظ۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی ابھی علی عمران یہاں کی اچھی طرح سے تلاشی لے کر فائل نمبر ایس222 حاصل کر کے ہی نکلا ہو یا پھر جیسے کوئی

ان کو صرف اس کام میں الجھائے رکھنا ہے غلط
ہم نے مانا بچے جننا کارِ مستورات ہے
(چونچال سیالکوٹی)

بگولہ اس کمرے میں رہتا رہا ہو! کمرے میں ایک الماری زمین پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کے پٹ یوں کھلے تھے جیسے کسی عاشق کا گریبان۔ دو چار پائیاں ایک دوجے سے لگ کر یوں کھڑی تھیں کہ جیسے انگریزی زبان کا حرف "وی" الٹا۔ ایک الماری دوسری چارپائی پر گری ہوئی تھی اور وہ بے چاری چارپائی "ون وہیلنگ" کے عالم میں تھی۔ فرش پر صفحات الٹے پڑے تھے اور چند بال پوائنٹ بھی پڑے تھے (جو کہ بعد میں خالی ثابت ہوئے تھے)۔ اولیس نے سوئچ بورڈ کی تلاش میں روشنی دیواروں پر ڈالی تو پتہ چلا کہ دیواروں کا وہی حال ہے جو کہ جی ٹی روڈ کا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کمرے کو کافی عرصے تک ایک باورچی خانے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے؛ ایک ایسا باورچی خانہ جہاں کوئلوں کا استعمال ہوتا ہو، کہ جن کا دھواں کسی بھی عروسی کمرے کو چند دنوں میں کوئلے کی کان کر سکتا ہے! سوئچ بورڈ پر موجود تمام بٹن دبائے مگر روشنی نہ ہوئی۔ یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ ہولڈر میں انرجی سیور یا بلب دستیاب ہی نہ تھا۔ "دھت تیرے کی!" اولیس کے لبوں سے نکلا۔ اس نے اپنا سامان ایک کونے میں رکھا۔ الماری سیدھی کر کے نیچے سے چارپائی نکالی اور اس پر گر پڑا۔

اگلے چند دنوں میں کمرے میں دوسرے لوگ بھی آ گئے تھے۔ یہ ایک "کامن روم" تھا جس میں پانچ لوگوں کی رہائش کا انتظام تھا) انتظام تھا محاورتاً ورنہ کسی قسم کا کوئی انتظام نہ تھا)۔ ان چند دنوں میں کمرے کے بارے میں مزید پریشان کن انکشافات بھی ہوئے تھے۔ اس کمرے کے بالکل اوپر ہی باورچی خانہ تھا، جس کا شور بہت تکلیف دیتا تھا۔ اس باورچی خانے مع دوسری منزل کے لیٹرینوں کا متحدہ پائپ اس کمرے میں سے گزرتا تھا اور غضب یہ کہ اس میں کچھ سوراخ بھی تھے (جن پر سینئرز نے ڈرائنگ کے سلسلے میں استعمال ہونے والی ٹیپ باندھ کر رفو کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کو ہر ہفتے RENEWAL کی ضرورت پیش آتی تھی بقولِ درد:

یاں تو کسو کے ہاتھ سے ہرگز رفو نہ ہو

کمرے کی چھت یوں تو مسطح تھی مگر ہموار سطح نہ تھی بلکہ سطح مرتفع تھی۔ سیدھے سبھاؤ چلتے چلتے یکا یک ایک طرف سے اوپر کو اٹھی ہوئی، یوں جیسے اوپر چھت پر کوئی سپیڈ بریکر بنایا گیا ہو! اس کمرے میں تین احباب شعبہ سول انجینئرنگ سے تعلق رکھتے تھے اور وہ اکثر اس کے پیچھے پوشیدہ راز کو جاننے کی سعی فرماتے رہتے تھے اور یہ الگ بات کہ ہمیشہ ناکام ہی رہتے تھے۔ (خیر ان بحثوں کا آخر میں یہ نتیجہ نکالا گیا تھا کہ اس عمارت کا مہندس یو-ای-ٹی کا ہی طالب علم رہا ہوگا! اس معاملے میں کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا تھا)

کمرے میں کھڑکیاں تھیں، جن پر جالی لگی تھی مگر پٹ کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ دیواروں پر کچھ ناشائستہ سی باتیں بھی لکھی

محکمۂ موسمیات کے ماہرین کی طرح اب تو کراچی کے شہری بھی بارش اور صرف بارش کے سلسلے میں ٹھیک ٹھیک پیشگوئیاں کر لیتے ہیں۔ کل جب ہم نے ایک شہری سے یہ پوچھا کہ اسے کس طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ بارش ہونے والی ہے تو شہری نے بتایا:

☆ جب کراچی کے ٹیلیفون کام کرنا چھوڑ دیں تو سمجھ لو کہ بارش آنے والی ہے۔

☆ اور جب شہر کی بجلی بار بار فیل ہونے لگے تو سمجھ لو کہ بارش آنے والی ہے۔

☆ جب سوئی گیس اور کے ڈی اے کا عملہ سڑکوں پر گڑھے کھود دے تو سمجھ لو کہ بارش آنے والی ہے۔

☆ جب لیڈروں کی آواز سنو تو سمجھ لو کہ بارش آنے والی ہے۔

☆ جب نلوں میں پانی نہ آئے اور دودھ والے تالابوں پر جانا شروع کر دیں تو سمجھ لو کہ بارش آنے والی ہے۔

☆ جب کارپوریشن کے ٹھیکیدار سڑکوں کو میک اپ کروانا شروع کر دیں تو سمجھ لو کہ بارش آنے والی ہے۔

☆ جب ٹیکسیوں کے میٹروں پر غلاف دیکھو تو سمجھ لو کہ بارش آنے والی ہے۔

نصر اللہ خان (بات سے بات)

ہوئی تھیں ؛ویسی جیسی عوامی لیٹرینوں میں لکھی ہوتی ہیں۔ وہاں موجود چارپائیوں کے دو پایوں کی آپس میں نہ بنتی تھی۔ ایک زمین کی کہتا تو دوسرا آسمان کی خبر لاتا۔ ایک اگر فرش کو چھوتا تو دوسرا فضا میں معلق رہتا اور اگر اُس کو (بالجبر) زمیں سے لگا دیا جاتا تو پہلا زمین سے منہ موڑ بیٹھتا۔ اِس پایوں کی لڑائی میں ہی رات بیت جاتی (وہ تو کہیں بعد میں اس پائے تلے ایک لکڑی کا ٹکڑا رکھ کر اسے خاموش کرایا گیا تھا)۔

آصف کی الماری کا ایک پٹ باہر نکل آتا تھا۔ آصف اکثر صبح صبح نیند میں اٹھتا اور الماری کھولتا تا کہ " فیس واش " نکال سکے۔ (اس پر ایک ساتھی کا کہنا تھا کہ اگر آصف جاور دیگر طالب علم فیس واش کی جگہ اگر ماؤتھ واش استعمال کرنا شروع کر دیں تو یو ای ٹی کی فضا معطر ہو جائے۔) نیند کے خمار میں آصف دھڑاک سے پٹ کھولتا اور وہ "فنی خرابی" والا پٹ الماری سے نکل کر زمین بوس ہو جاتا۔ اس کی آواز سن کر تمام اہلِ کمرہ خصوصا اور اہلِ ہوسٹل عموما جاگ جاتے۔ کسی کی کلاس ہوتی تو اس جگانے کو خداداد نعمت سمجھ کر آصف کو دعا دیتا، کسی کی نہ ہوتی تو وہ گالیاں۔

سب اہلِ کمرہ کی اجتماعی مشاورت سے یہ طے پایا کہ اس کمرے کی حالت بدلنے کے لیے انتظامیہ کے کان پر کم از کم کچھ جوئیں تو رینگوائی جائے۔ سب سے پہلے خادمِ اعلیٰ برائے کمرہ جات، دوم منزل زیرِ ہال مسمی رشید سے رابطہ کیا گیا۔ جنہوں نے فرمایا کہ اگر اہلِ کمرہ انوسٹمنٹ کے لئے تیار ہوں تو وہ نہ صرف خود اس کمرے میں پینٹ کرنے کو تیار ہے بلکہ کھڑکی میں شیشے لگانے کا کام بھی سرانجام دے سکتا ہے۔ یہ تجویز اہلِ کمرہ کہ متفقہ رائے سے رد کر دی گئی۔ اب باری تھی جنابِ عالی، استادِ رہائش کی! انھیں درخواستیں دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ دن گذرتے گئے ۔۔۔ سیکنڈ منٹوں میں، منٹ گھنٹوں میں، گھنٹے دنوں میں، دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں گذرتے گئے، مگر وہ " نکی جئی ہاں " نہ ہوئی! اب سب تھک ہار گئے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اب ان شاء اللہ اگلے سال تو کمرہ ویسے ہی تبدیل ہو ہی جانا ہے تو کیا زیادہ جوتے گھسانا؟ دن جیسے تیسے گذر رہے ہیں بس گزارئیے۔

> **نثری غزل**
>
> زبید بھائی نے فنِ عروض (جدید) پر لیکچر دیتے ہوئے فرمایا "نثر میں عورتوں کے ساتھ باتیں کرنے کو نثری غزل کہا جاتا ہے۔"
>
> اعظم نصر

آخر ایک سمسٹر گذرا اور پھر دوسرا بھی گذرنے کو تھا۔ فائنلز شروع ہونے میں چند ہی دن تھے۔ تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔ ادھر اویس نے ذرا پڑھائی شروع کی اور اُدھر میس میں پیاز بھونے گئے۔ نمیریکل سمجھ میں آنے والا ہی ہے کہ اس بھنے مصالحے میں دال ڈال دی گئی۔۔ سڑڑ کی آواز کانوں کو چیرتی ہوئی معدے تک جا پہنچی۔ ابھی اگلا ٹاپک اٹھایا ہی تھا کہ اس دال کو بگھار لگا دیا گیا! اف مالک۔۔۔ بے اختیار زبان منہ سے باہر نکل آئی ؛لیکن یہ کیا! آخ تھو! پائپ سے ناپاک پانی کا ایک قطرہ زبان پر ٹپک پڑا ہے۔۔ اب جب تک تین دفعہ ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ نہ کر لو مجال ہے جو اُبکائیاں رک جائیں۔

ان مشکل حالات میں اہلِ کمرہ پڑھ رہے تھے کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ اویس کان لپیٹے بیٹھا ہی رہا۔ ساتھ والی چارپائی سے آواز دی گئی" اویس! اب تیری باری ہے دروازہ کھولنے کی۔" وہ کتاب بند کر رہا تھا کہ دوسری چارپائی سے گرہ لگائی گئی" آرام سے۔ بندے کے پتروں کی طرح۔"

اویس نے دروازہ کھولا تو سامنے خادمِ اعلیٰ ایک نوجوان کے ہمراہ کھڑے تھے۔ حلیے سے نوجوان کوئی "رنگ باز" لگتا تھا۔ اویس نے سوالیہ نظروں سے خادم کو دیکھا۔ تو وہ بولا " صاحب جی! خوش ہو جائیں۔ آپ کی درخواست منظور ہو گئی۔ اب آپ کے کمرے کا نیا پینٹ ہو جائے گا اور کھڑکیوں کے شیشے بھی منظور ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔! بس آپ اپنا سامان الماری میں ڈال کر الماریاں باہر رکھ دیں۔ تالہ شالہ لگا کر رکھنا! ویسے بھی گرمیاں اوپر ہی سوئیں گے آپ لوگ۔ بس دو تین دن کی تو بات ہے۔۔!"

وہ نہ جانے مزید کیا کچھ کہتا، اویس نے ایک زوردار جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا!

کائنات بشیر، جرمنی

پڑوسی

پڑوسن فلم دیکھنے کے بعد ہم سمجھتے تھے کہ ہمارا واسطہ زندگی میں صرف۔۔ پڑوسن۔۔ سے پڑے گا۔ لیکن ہائے ری قسمت، اندازہ نہ تھا کہ ہمارا واسطہ ایک پڑوسی سے پڑنے والا ہے۔

اب ایسی بات نہیں تھی کہ ہمارے نصیب میں پڑوسن نہ تھی۔۔ وہ تو تھی۔۔،

پَر جو بات پڑوسی میں ہے پڑوسن تجھ میں وہ کہاں۔۔۔!

دیوار سے دیوار ملی تھی۔۔۔ جب کئی پڑوسنوں کو بھگتانے کے بعد ہمارا ربط ہوا ایک جرمن پڑوسی سے۔۔!

عام گزرتے شب و روز میں اچانک تبدیلی آ گئی۔ اس کا نام کافی لمبا اور مشکل تھا۔ اس لیے ہماری زبان پہ کبھی نہ چڑھ سکا۔ کبھی اس کے نام کے پہلے حصے پہ غور کرتے کبھی آخری پہ۔۔ نک نیم اس نے بتایا نہیں تھا ورنہ اس سے کام چلا لیتے۔۔ (سو اس کی کوئی اور نشانی رکھ لی) پہلی بار جب اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ہم کچن میں کام کر رہے تھے۔ بٹر چکن، سبزی پلاؤ، نان، رائتہ، سلاد۔ مینو صبح ہی بن چکا تھا۔ اس لیے ہاتھ تیزی سے کام میں مصروف تھے۔ سالن بنانے کے بعد نان کا آٹا گندھ چکا تھا۔ چٹنی پیس لی تھی۔ پلاؤ دم پہ تھا، رائتہ بنا کر ہاتھ تیزی سے سلاد کاٹنے میں مصروف تھے۔ کبھی کبھی کھڑکی سے باہر نظر جا رکتی۔ دور تک نظر آتے لوگوں کے ذاتی گھر۔۔ گاڑیاں، پھولوں بھرے گارڈن اور ان کے بیچ میں سے گزرتی ہوئی سڑک۔۔ رات بھر برستی بارش کے بعد ہر چیز نکھر گئی تھی۔ درخت، پھول، بوٹے اور بھی ہرے بھرے لگ رہے تھے۔ بادل ابھی تک کہیں کہیں آسمان پہ تیر رہے تھے۔ موسم بڑا خوشگوار تھا اور موڈ بھی، ریڈیو پر اچھے اچھے گیت بج رہے تھے،

میں نے تیرے لیے ہی سات رنگ کے سپنے چنے
کچھ ہنستے کچھ غم کے تیری آنکھوں کے سائے چُرائے
جب ماحول میں پہلا کنکر گرا۔۔!

گھنٹی بجانے کے ساتھ کسی نے ہاتھ سے بھی دستک دی۔ نل کھول کر جلدی سے ہاتھ دھوئے اور ہیپر دھپڑ میں کچن تولیے سے صاف کرتے ہوئے باہر کی اور قدم بڑھا دیئے۔ دروازہ کھولنے پر اِک انجان حضرت کو سامنے کھڑے پایا۔ ہم نے سَر دا اجنبی سوالیہ

نقاب پھاڑ کے پہنچے گی اُن کے چہرے تک — رکاوٹیں نگہہِ کامیاب کیا جانے — (ماچس لکھنوی)

نظروں سے اُسے دیکھا۔ شکر ہے پردیس میں مانگنے والے دروازے پر نہیں آتے۔ البتہ کبھی کبھار چرچ والے پھیرا ڈال لیتے ہیں۔۔ یا ٹیلی فون سروس کی کمپنیاں نئی پرکشش پیش کش لے کر آن موجود ہوتی ہیں (ہمارا ہوم ورک شروع ہوگیا۔۔!)

چرچ والا یا ٹیلی فون سروس والا۔۔۔؟

تصور میں اسے پادری اور سیلز مین کے حلیے میں جانچنے کی کوشش کی۔ تو نہ جانے کیوں اسکی شکل پادری سے ملتی لگی۔ پھر ہم نے اسکیسر پر پادری کے لباس کے ساتھ سفید ٹوپی فٹ کر دی تو کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ سو اب ہم پادری کا لیکچر سننے کے لیے بالکل تیار تھے۔

تبھی اس نے اپنا نام بتا کر کہا،

"!میں آپ کا نیکسٹ ڈور نیبر۔۔"

(اچھا تو پڑوسی اور وہ بھی مذہبی)

"حال ہی میں یہاں شفٹ ہوا ہوں۔"

پہلا گھر کیوں چھوڑا۔۔۔؟

ہمسایوں کو تنگ کر کے تو نہیں آئے۔۔؟

کہیں انھوں نے تمھارا پتہ صاف تو نہیں کروا دیا۔۔۔؟

غل غپاڑہ تو نہیں مچاتے تھے۔۔؟)

امکانات کے سارے گھوڑے دوڑا لیے گئے۔

اس نے پھر کہا،

"میں سنگل (اکیلا) ہوں۔۔۔!"

(تو پھر۔۔؟)

"میں فلاں کمپنی میں اتنے سالوں سے جاب کر رہا ہوں۔"

(کرنی بھی چاہیئے۔۔۔ ویلے رہ کر کیا کرو گے، مفت کی کھاؤ گے)

"میں ایک اچھا پڑوسی ثابت ہوں گا۔"

(ہونا بھی چاہیئے ورنہ ہم تمہارا ناطقہ بند کر دیں گے)

اس دوران ہم اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیتے رہے۔۔ اونچا لمبا چھ فٹ کے قریب قد، نیلی بنٹے جیسی آنکھیں، سفید گلابی ملی جلی رنگت پٹ سن جیسے بال اور کچھ بھاری بھر کم جسم۔۔،

میں زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں اس لئے میری ٹائم لائن پر صرف سکول کا ذکر ہے۔ اب سوچ رہا ہوں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں میٹرک کے لئے داخلہ لے کر ٹائم لائن پہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی لکھ دوں اور اگر خدانخواستہ میٹرک نہ بھی ہو سکا تب بھی یونیورسٹی کا طالبِ علم تو رہوں گا، آپ کی کیا رائے ہے؟

اعظم نصر

(ہوں، تو حضرت کافی موٹے ہیں۔۔ ہماری نظر اس کی موٹی توند پہ آ کر رک جاتی۔۔ اللہ معاف کرے۔۔ کھانے پینے کے کافی شوقین لگتے ہیں۔۔ اور ورزش سے عاری۔۔! اس وقت رسمی گفتگو ہوئی۔ اس نے اپنا تعارف زیادہ دیا اور ہمارا کم لیا (شکر ہے گوسپ، چٹپٹی سننے سے نابلد لگتا ہے) اب اس کے ساتھ کیسی جمے گی یہ وقت بتائے گا۔ ہم نے یہ سوچ کر دروازہ بند کر دیا۔ اگلا گانا شروع ہو چکا تھا،

میرے دوار کھڑا اک جوگی (پڑوسی)

جرمن بڑے طریقے سلیقے کے لوگ ہیں۔۔ کم گو، آہستہ آواز میں بات کرنے والے، کبھی کبھی تو لگتا ہے ان کے گھروں میں کوئی رہتا ہی نہیں۔۔ صرف بھوت ناچتے ہیں۔۔۔ سو اگر ایک اور بھوت کا اضافہ ہو گیا تھا تو زیادہ فرق پڑنے والا نہیں تھا۔

تقریباً ایک ہفتہ بعد کی بات ہو گی جب عین دن کے بارہ بجے دروازے پہ دستک ہوئی۔ دیکھا تو خر دوپہر پڑوسی کا دیدار ہوا۔۔

(آہا پڑوسی۔۔۔ خیر نال؟)

وہ ہاتھ میں ایک کپ لیے کھڑا تھا۔ کبھی ہم اسے دیکھتے اور کبھی کپ کو۔۔ اگر وہ ہمارے لیے کافی، کاپوچینو بنا کر لایا ہوتا تو کپ بھرا ہوتا۔ لیکن اس کا خالی پن ہماری نظروں سے سوالیہ نشان بن کر جھلک رہا تھا۔ پتہ چلا جناب لنچ میں کیک بنا کر کے کھانے لگے تھے۔ دیکھا تو بٹر، گھی ندارد۔ سو وہ پڑوسی ہونے کا فائدہ اٹھا کر چلے آئے تھے۔ ہم نے مسکراتے ہوئے کپ اسکے ہاتھ سے لے لیا۔ دل میں پھلجڑی چھوٹ رہی تھی۔ اس نے وہ کام کیا تھا جو

آنکھوں میں کیا کلوروفارم بھرا ہوا تھا جس کو اُس نے دیکھا بیہوش ہو گیا تھا (ہلبلیے فرخ آبادی)

نظام الملک طوسی سے کسی شہزادے نے پوچھا: ''دانا بزرگ! تخت نشینی کی کم سے کم عمر کیا ہوتی ہے؟''
طوسی نے جواب دیا ''پندرہ سال''
شہزادے نے دوسرا سوال کیا ''اور شادی کیلئے کم سے کم عمر کیا ہونی چاہیے؟''
طوسی نے کہا ''اٹھارہ سال''
شہزادے نے کہا ''یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جہان داری جیسے مشکل کام کیلئے پندرہ سال اور شادی جیسے معمولی کام کیلئے اٹھارہ سال۔۔۔۔۔۔آخر یہ فرق کیوں؟''
طوسی نے جواب دیا ''شہزادے! کچھ دن صبر کر، جب تو تخت نشینی کے بعد رشتۂ ازدواج میں جکڑا جائے گا تو تجھے خود ہی یہ نکتہ معلوم ہوجائے گا کہ جہانداری سے زن داری کہیں مشکل کام ہے۔''

آج تک کبھی دوسرے جرمن پڑوسیوں نے نہ کیا تھا۔

اِک نئے باب کا اضافہ ہوگیا تھا۔۔

اس نے مکھن کی واپسی کا ذکر کیا۔ جسے ہم نے فراخدلی سے یہ کہتے ہوئے رَد کردیا۔

کوئی بات نہیں آپ ہمارے پڑوسی ہیں (ویسے کیک تو کھلاؤ گے نا۔۔؟اور ہاں خبردار۔۔!اندرا لا کلامت ڈالنا)

(میرے دوار کھڑا اِک پڑوسی
نہ مانگے سونا چاندی، مانگے بٹرفری
میرے دوار کھڑا۔۔۔!)

وہ خوشی سے چمکتے چہرے کے ساتھ مکھن لے کر چمپت ہوگیا اور کیک بھی اکیلے ہی کھا گیا۔۔ہم مفت میں مکھن دے کر کیک میں حصہ ڈال چکے تھے۔شام کی چائےتک کیک کا انتظار کیا۔ نہ آنے کی صورت جل کر سوچا۔

(اللہ کرے، کیک جل گیا ہو۔۔کچا رہ گیا ہو۔۔۔تمھیں وہ مزہ نہ آیا ہو۔سڑے بُسے منہ کے ساتھ اسے ختم کیا ہو۔۔یا تمہاری فرج میں پڑا ڑل رہا ہو۔اُمیدِ واثق تو ہے کہ وہ تمہاری موٹی توند میں پہنچ کراب چربی میں بدل رہا ہوگا۔۔ن)

اسکے بعد تو اک نیا سلسلہ چل نکلا۔۔ایک اتوار کو اسکے گھر نمک ختم ہوگیا۔بازار بند تو دکان بند۔۔عذر قابلِ قبول تھا نمک کافی ستا، ہم نے مسکراتے ہوئے نمک کا چھوٹا پیکٹ اسے تحفے میں دے دیا (اللہ تمھارے گھر میں نمک سے برکت ڈالے۔۔ آمین ،کیا کرے بیچارہ۔۔۔سنگل، اکیلے ڈکیلے کے گھر کا یہی حال ہوتا ہوگا)

ایک اکیلا اس شہر میں رات اور دوپہر میں
آب و دانہ ڈھونڈتا ہے، ڈھونڈتا ہے
سن رائز ریڈیو بر محل گونج رہا تھا۔۔

اس کے بعد کبھی اس کے گھر میدہ ختم ہوجاتا، کبھی ایک دو پیاز کی ضرورت پڑ جاتی۔ ہم ماتھے پر شکن ڈالے بغیر اس کے کام آ جاتے۔اب ہم اپنے گھر کے ساتھ ساتھ اس کا گھر بھی چلا رہے تھے۔زندگی میں رنگینی آ گئی تھی۔۔۔لین دین کی۔۔!

کھانے پینے کی چیزوں کی حد تک تو ٹھیک تھا لیکن ایک دن اس نے دس یورو بطور قرض مانگ لیے۔۔اس دن ہم پہلی بار چوکنے ہوئے (موصوف، کافی کھلے ڈلے لگتے ہیں۔کہیں یہ با قاعدہ مانگنے کے عادی تو نہیں۔۔؟)

ہم نے بغور اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔ہمیں اچنبھے کی حالت میں دیکھ کر اس نے جلد رقم کی واپسی کا کہا،

(تو اور کیا۔۔۔رقم!وہ تو تمھیں ہر صورت واپس کرنی پڑے گی ورنہ ہم تمھارے دروازے پر لکھ کر لگا دیں گے، ہمارا قرضدار۔۔نیچے اپنا نام ہم فخریہ لکھیں گے)

مطلوبہ رقم انجان پڑوسی کو اللہ بھروسے دے دی۔

(خیر زیادہ بڑی رقم نہیں اگر اس نے واپس نہ بھی کی تو ہم خیر خیرات کے کھاتے میں ڈال کر دلِ ناتواں کو تسلی پہنچالیں گے)

(جو وعدہ کیا وہ نبھانا پڑے گا
روکے زمانہ چاہے روکے خدائی
تم کو آنا پڑے گا)

اچھی بات یہ ہوئی کہ اس نے رقم حسبِ وعدہ واپس کردی۔ ہم خوشی سے نہال تھے کہ پڑوسی نے وعدہ نبھایا اور کسی برائی سے بچ

گیا۔اس کے بعد تو جیسے اس نے ہمارے ساتھ بینک والا کھاتہ بھی کھول لیا۔۔کبھی پانچ،کبھی دس اور ایک بار بیس یورو تک قرض لے گیا۔۔کبھی اسکا بنک بند ہوتا،کبھی اسے جلدی ہوتی۔۔کبھی اس کی ٹرین چھوٹنے والی ہوتی۔ہم اسکی ضرورت پوری کر کے پڑوسی کے فرائض بخوبی نبھا رہے تھے۔

ایک دن گھر سے نکل رہے تھے کہ اس نے ہم سے تھوڑی سی ریز گاری مانگی۔۔ریز گاری اتنی کم مانگی تھی کہ ہم ندامت سے چُور چُور ہو گئے۔۔اپنا معیار اونچا رکھتے ہوئے ہم نے ایک ہاتھ پر اسے درکار مطلوبہ رقم پچاس سینٹ (یورو کا آدھا) اور دوسرے پر پانچ کا نوٹ رکھ کر لولی پاپ کی طرح اسے دکھایا کہ جو لینا ہے لے لو۔۔ہم ہکا بکا رہ گئے جب اس نے صرف پچاس سینٹ اٹھائے۔ پانچ یورو کو نظر انداز کر دیا۔اب کی بار بے اختیار ہمارے منہ سے خود ہی نکل گیا کہ اسے واپس کرنے کی ضرورت نہیں۔

(اتنے تو ہم بآسانی شہر میں گانے بجانے والوں کے آگے اُچھال دیتے ہیں۔۔ چندے کے ڈبے میں ڈال دیتے ہیں)

لیکن اس کی خودی کو شائد گوارا نہ ہوا۔۔ اگلے روز جب آشیانے کا در کھولا تو دروازے کے عین بیچوں بیچ ایک سفید پلیٹ پڑی تھی جس کے درمیان میں پچاس سینٹ کا سکّہ پڑا چمک رہا تھا۔ہم نے جلدی سے آگے بڑھ کر اِدھر اُدھر دیکھ کر سکّہ اُچک لیا۔۔اس کی اس حرکت پہ جز بز ہو کر رہ گئے۔

(اگر کوئی اور دیکھ لیتا تو۔۔!کیا سمجھتا کہ وہ اپنا صدقہ اتار کر پیسے ہمیں دے رہا ہے)

ہمیں لگا جیسے ڈور میٹ کی جگہ ہم زمین پر کپڑا بچھائے بیٹھے ہیں اور اس کے آگے ہاتھ پھیلا کر اسکی طرف بے بسی بیچارگی کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ جواباً اس نے ہماری حالت پہ ترس کھاتے ہوئے پچاس سینٹ کا سکہ کپڑے پہ اچھال دیا ہے۔۔

(دل چاہ رہا تھا اسے لیکچر دیا جائے کہ تمہارا پلیٹ میں پیسے سجا کر دینے کا انداز ہمیں پسند آیا۔لیکن کیا تھا اگر دروازہ کھٹکھٹا کر پلیٹ ہاتھ میں دے دیتے تو کیا۔۔کیا قیامت آجاتی!)

ایک روز اس نے کہا،

"ہفتے والے دن میرے گھر پہ رات کو پارٹی ہے۔شور شرابہ ہو سکتا ہے۔ میوزک اونچی آواز میں چلے گا۔۔سوچا پہلے سے بتا دوں۔۔تا کہ آپ بے آرام نہ ہوں۔"

(صدقے جاؤں۔۔۔بے آرام تو تمہارے بتانے پر بھی ہوں گے۔۔تم تو مانگنے کے ساتھ ناچنے گانے والے بھی نکلے، یہ شوق تو کلب جا کر بھی پورا کر سکتے تھے)

پارٹی زور دار رہی۔میوزک بھی اونچی آواز میں چلا۔جرمنوں کے یہ رنگ ڈھنگ گھر بیٹھے دیکھ لیے۔۔(اب یہ اتنے بھی خاموش نہیں۔صرف خول چڑھائے رکھتے ہیں شائد) دل چاہ رہا تھا جواباً ہم بھی اونچی آواز میں میوزک چلا دیں،

ساقیا آج مجھے نیند نہیں آئے گی
سنا ہے تیری محفل میں رتجگا ہے

پھر ایک دو مہینے بعد اُسے ایسا ہی اُبال اٹھتا اور وہ یونہی اپنی زندگی میں پارٹی کے رنگ بھرتا۔۔ہاؤ ہو کرتا رہتا۔پہلے سے آگاہ کر دیتا۔

کبھی اس کی سالگرہ ہے۔۔

کبھی دوستوں کو دعوت دی ہے۔۔

کبھی فلاں چیز کی پارٹی ہے کبھی ڈھمکاں کی۔۔!!

سن سن کر ہمارے کان پک گئے (کبھی اس بات کے لیے بھی پارٹی دیا کرو نا، آج میری آفس میں میٹنگ تھی۔۔آج دانتوں کے ڈاکٹر نے دانتوں کا معائنہ کیا۔۔آج ایک نیا بل آ گیا۔۔)

پارٹی اور میوزک چلتا رہا۔آگے پیچھے بھی وہ اونچی آواز میں میوزک سنتا۔۔اور کبھی کبھی خود ایک آدھ ساز (گٹار) بجا کر ایلوس پریسلے بن جاتا۔۔ادھر گھر میں کوئی مہمان آتے تو کہتے،

"آپ کا پڑوسی تو بڑا زندہ دل انسان ہے۔"

(اللہ جانے زندہ دل ہے یا اپنے مردہ دل کو بہلا رہا ہے)

اسی طرح وقت گزرتا گیا۔۔ اس کے شوق ختم ہوئے نہ عادتیں۔۔!

لین دین یونہی چلتا رہا۔

جو داڑھی مونچھ اُدھر غائب تو چوٹی ہے اِدھر غائب میاں ہیں موبہ مو غائب تو بیوی سر بسر غائب (ناظر نوکی)

چار پانچ سال گزر گئے۔۔

ایک روز گھر کے باہر مل گیا۔ سامنے بڑے اچھے موڈ میں چلا آ رہا تھا۔۔ ہمیں شرارت سوجھی اسے دیکھ کر بھی اَن دیکھا کر دیا اور اپنا بیگ کھول کر اس میں جھانکنے لگے۔۔ لیکن وہ سیدھا چلا آیا۔ رسمی کلمات کے بعد کہنے لگا،

"اس ہفتے کو میرے گھر پر ایک بڑی پارٹی ہے۔۔!"

(ہاں ہاں، شور بھی ہوگا اور ہنگامہ بھی، میوزک بھی چلے گا اور پارٹی لیٹ نائٹ چلے گی) ہم تیار تھے۔

اچانک وہ ذرا آگے بڑھ کر رازداری سے بولا،

"دراصل اس دن میری شادی کی پارٹی ہے۔۔ اور میری شادی۔۔،" چمکتی مسکراتی نظروں سے بات کا سسپنس بڑھاتے ہوئے وہ ذرا دیر کو رکا۔

"بہت مبارک ہو۔" ہم نے بیچ میں جواب اچھال دیا، (وَنی، اب تو سنگل سے ڈَنگل ہوگا، نی)

"میری شادی۔۔، میری ایکس وائف سے ہو رہی ہے۔۔!!

"اس نے بات پوری کی تو اب چونکنے کی باری ہماری تھی۔

" کیا۔۔؟" حیران نظروں سے اُسے دیکھا جو کسی بنے کی طرح متوالا بنا کھڑا تھا۔۔

" کیا تمھیں نئی بیوی نہ ملی۔۔؟" (جرمن ہو کر) زبان پھسل گئی۔

بات سمجھ کر وہ خجالت سے مسکرایا۔ پھر بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "وہ دراصل میری اپنی بیوی سے پانچ سال پہلے زبردست لڑائی ہوگئی تھی اس لیے قِصہ تمام ہوا اور میں اس مکان میں اٹھ آیا۔ اب ہماری صلح ہوگئی ہے اور ہم دوبارہ شادی کر رہے ہیں۔۔"

"ہمم، تو یہ بات ہے۔ کیا اسی گھر میں رہو گے یا یہاں سے شفٹ کر جاؤ گے۔۔؟"

"ہم ادھر ہی رہیں گے۔"

پارٹی زوردار رہی۔۔ ہمارا خیال تھا لین دین کا کاروبار اتنا جم چکا ہے کہ اب ایک کی بجائے دو کو بھگتنا پڑے گا۔۔ شادی کی دعوت ملی لیکن ہم ایک میلاد میں چلے گئے۔

شادی کو کئی روز ہو چکے ہیں۔۔

پڑوسی دوبارہ نظر نہیں آیا۔ ہم سمجھنے سے قاصر ہیں۔ پتہ نہیں آنے والی بلا تھی کہ ڈائن، جس نے آتے ہی اُسے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔۔ یا پھر وہ اتنی خوبصورت تھی کہ پڑوسی دوبارہ اُس کی زلفوں کا اسیر ہو گیا۔

جمیل خان

سڑک پر وصال ہو

شہنشاہِ ظرافت دلاور فگار مرحوم کا ایک شعر ہے:

لے کر برات کون سپر ہائی وے پر جائے
ایسی بھی کیا خوشی کہ سڑک پر وصال ہو

دلاور فگار تو پندرہ سال قبل انتقال کر گئے تھے، اگر آج بقید حیات ہوتے تو اپنے شہر کی شاہراہوں کو دیکھ کر سپر ہائی کو دیا گیا الزام واپس لے لیتے۔ اس لیے کہ ہمارے شہروں کی چھوٹی بڑی ہر ایک سڑک اس درجے کو پہنچ چکی ہے کہ کسی کو بھی کہیں بھی زندگی کے عذاب سے نجات دلا کر جاں بحق کر سکتی ہے۔

ہماری سڑکوں پر موت کو گلے سے لگانے کے لیے ہر ایک بے چین دکھائی دیتا ہے، اگر خود اپنے لیے یہ بے چینی نہیں ہوتی تو کم از کم اکثر کی تمام تر تگ و دو دوسروں کو موت کے منہ میں پہنچانے کے لیے تو ضرور رہوتی ہے۔

اس کی اور بہت سی وجوہات میں سے ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری درسی کتابوں سے لے کر وعظ کی تمام مجلسوں میں یہی تلقین کی جاتی ہے کہ موت کو زندگی پر فوقیت دینی چاہیے۔ چنانچہ مرنے کے بعد جنت کے حصول کے لیے لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے معاشرے کو ہی جہنم کا شاندار نمونہ بنا دیا ہے۔

جب سے شادی ہالوں کا رواج شروع ہوا ہے، اس وقت سے سڑکوں پر تمبو لگا کر شادی کا سلسلہ تو کم سے کم ہو گیا ہے، لیکن میلاد، مجلس، مایوں، مہندی اور سالگرہ وغیرہ کی قسم کی تقاریب اب بھی سڑک پر ہی منعقد کی جاتی ہیں۔ تمبو کو باندھنے کے لیے لوہے کی بڑی بڑی کیلیں سڑک پر گاڑی جاتی ہیں، اس سے سڑک تو زخمی ہوتی ہی ہے، راہ چلتے لوگ بھی ٹکرا کر زخمی ہو جاتے ہیں، اور اگر کوئی موٹر سائیکل سوار کی نظر تیز رفتاری میں ان پر نہ پڑے تو اس کے لیے فوتگی کے کنارے تک پہنچنے کے مراحل شروع ہو سکتے ہیں۔

اور چونکہ یہ مملکت خداداد ہے، چنانچہ یہاں اپنی تمام احمقانہ کارگزاریوں کے ہولناک نتائج کو بآسانی خدا اور اُس کی بنائی ہوئی قسمت کے کھاتوں میں ڈالا جا سکتا ہے۔

مثال کے طور پر سڑک پر آتے جاتے سب کو دکھائی دے رہا ہوگا کہ سیوریج کے مین ہول کا ڈھکن غائب ہے، لیکن کانوں کو تو چھوڑیے، کہیں اور بھی جوں تو کیا کچھ بھی نہیں رینگے گا۔ کسی کو اگر کچھ فکر ہوگی بھی تو وہ زیادہ سے زیادہ اس مین ہول میں کسی درخت کی شاخ لا کر ڈال دے گا۔

اللہ اللہ خیر صلاّ......!

اور اگر کوئی بچہ ایسے کسی گٹر میں گر کر ڈوب جائے، یا کوئی موٹر سائیکل سوار کی بائیک اس گٹر سے ٹکرا کر اُچھلنے کے بعد دور تک رگڑتی چلی جائے اور نتیجہ میں وہ بچہ یا موٹر سائیکل سوار ہلاک

ہوجائے تو کوئی یہ سبق ہرگز نہیں سیکھے گا کہ آئندہ کوئی گٹر بغیر ڈھکن کے نہیں ہونا چاہیے، بلکہ بڑے اطمینان اور سکون قلب کے ساتھ داڑھی یا اور کچھ کھجاتے ہوئے فرمادیا جائے گا کہ۔۔۔ اللہ کی مرضی! اللہ کی دی ہوئی چیز تھی اللہ نے واپس لے لی!

ٹریفک حادثات سے محفوظ رہ جانے والوں کے لیے موت کے حصول کیا اور بہت سے انتظامات کیے گئے ہیں۔ نامعلوم افراد کی نامعلوم سمت سے آنے والی گولی سے بھی یہ نعمت غیر مترقبہ حاصل ہوسکتی ہے۔ اب تو ایک اور سہولت یہ بھی بہم پہنچادی گئی ہے کہ ہر گاڑی میں سی این جی سیلنڈر نصب ہیں، جو اگر پھٹ جائیں تو بم کا کام کرتے ہیں اور ایک ہی جھٹکے میں بہت سے لوگوں کو زندگی کے عذاب سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ یعنی اب ہماری سڑکوں پر ہزاروں گاڑیاں محض گاڑیاں نہیں رہیں، بلکہ ان کی صورت میں بم دوڑتے پھر رہے ہیں۔

موت کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے لیے ہماری حکومتیں بھی عوام کی زندگی کو اجیرن بنانا اپنا مذہبی فریضہ اور باعث اجر وثواب سمجھتی ہیں کہ اگر لوگوں کو اس دنیا میں ہی ساری نعمتیں نصیب ہوگئیں تو پھر وہ اگلی دنیا میں جانے کے لیے بے قرار نہیں ہوں گے۔

چنانچہ مملکت خداداد میں رزق کو اتنا گرانقدر بنادیا گیا ہے کہ ہر ایک شہادت کی تمنا اور جستجو کرنے پر مجبور ہوجائے۔ دراصل شہیدوں کو مرنے کے بعد بھی رزق ملتا ہے، اس لیے شہادت کے مزے لوٹنیا ور مفت خدائی رزق حاصل کرنے کے لیے بہت سے لوگ بآسانی آمادہ ہوجاتے ہیں۔

جو لوگ ازخود شہادت جیسی انمول نعمت سے فیضیاب ہونے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے، تو ان کو زبردستی شہادت سے سرفراز کردیا جاتا ہے۔ اس کے لیے عموماً جمعہ شریف کے مبارک دن اور مسجد میں نماز کے وقت کا انتخاب کیا جاتا ہے، کہ اس طرح شہادت کی برکتوں میں مزید اضافہ ہوجائے۔

مملکت خداداد میں عوام کی اکثریت کو نہ روٹی میسر ہے نہ کپڑا اور نہ ہی مکان! ظاہر ہے کہ یہ اہتمام بھی جان بوجھ کر کیا گیا ہے، کہ لوگ اس عارضی اور چند روزہ زندگی میں ناپائیدار وسائل کی کشش میں کھو نہ جائیں۔ کافروں نے اس دنیا کو ہی سب کچھ سمجھ لیا ہے اور آخرت کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ توبہ توبہ! سنا ہے کہ وہاں کیسائنسدان انسانوں کی عمر میں اضافہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں اور ہزار سال بلکہ اس سے بھی اوپر لیجانا چاہتے ہیں۔

ہم ایسا ہرگز نہیں ہونے دیں گے! کم ازکم مملکت خداداد میں تو ہرگز نہیں! یہ الگ بات ہے کہ ہمارے قبلہ و کعبہ اور دارالحاجات مملکت السعودیہ العربیہ میں تو شیخوں کی عمریں اچھی خاصی ہوتی ہیں۔ ان کے ہاں تو بادشاہت کے منتظر ولی عہدوں کی عمریں بھی اسی برس سے تجاوز کرچکی ہیں۔ لیکن ہم ان کو کیوں دیکھیں کہ وہ کیا کررہے ہیں؟ ہاں ہم ان کے ریال کو ضرور دیکھتے ہیں اور ان سے زکوٰۃ وخیرات لے کر اپنی مملکتِ خداداد میں موت کے ہی کاروبار کو فروغ دیتے ہیں۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم نے مذہب کا کچھ ایسا ٹینڈر بھر دیا تھا جو سعودی مملکت والوں نے نہیں بھرا تھا، چنانچہ ہمیں خصوصی طور پر مذہب کا ٹھیکے دار بنادیا گیا ہے۔

ہم نے مملکت خداداد میں اسلام کو قلعہ بند کردیا ہے کہ اسلام کو یہاں شدید خطرہ لاحق رہتا ہے۔ دنیا کے دیگر اسلامی ممالک بالخصوص سعودی عرب میں بھی اسلام کو اس قدر سنگین خطرات لاحق نہیں ہوتے جیسے کہ ہمارے ہاں یہ خطرات منڈلاتے رہتے ہیں۔

اس معاملے میں ہمارے ہاں لوگ اتنے حساس ہوگئے ہیں کہ صرف اتنا کہنے کی دیر ہوتی ہے کہ یہ یا فلاں شخص نے مذہب کی توہین کی ہے۔ بس پھر دیکھتے ہی دیکھتے مشتعل ہجوم اس کو مکوں اور لاتوں سے ہی کوٹ پیٹ کر جہنم رسید کردیتا ہے۔ اس رویے سے بہت سے لوگوں کے لیے خاصی آسانیاں بھی فراہم ہوگئی ہیں۔ وہ جائیداد ہتھیانے، اپنے کسی کاروباری حریف کو راستے سے ہٹانے، کسی رقیب روسیاہ سے اپنی یکطرفہ محبت کو آزاد کرانے، جنسی زیادتی کے بعد اپنا دامن صاف کرنے یا پھر کسی سیاسی مدمقابل کا پتہ صاف کرنے کے لیے اس تیر بہ ہدف نسخے کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔

ارمان یوسف

یہ دفتروں کے پھیرے

گیدڑ کی موت آئے تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے، یہ محاورہ گھسا پٹھا سا لگتا ہے۔ جو کچھ ہمارے ساتھ کل بیتی تو اس یادگار تجربے کی روشنی میں ہمارے زرخیز ذہن نے نوخیز محاورہ اگلا "جب ایک پاکستانی کی موت آتی ہے تو وہ سرکاری دفاتر کا رُخ کرتا ہے" جی ہاں یقین مانیے ذرا بھی جھوٹ کی آمیزش نہیں اس میں۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ پرانے کاغذات ٹٹولتے ہوئے ہمارے ہاتھ پاسپورٹ لگ گیا۔ کھول کے دیکھا تو پتلی پتلی مونچھوں اور لمبی گردن والا ایک لڑکا نظر آیا۔ غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ تصویر تو ہماری ہی ہے جو میٹرک کا داخلہ بھجواتے وقت ہم نے بن سنور کے بنوائی تھی۔ اب تو خیر ہم وکالت کے آخری سال میں ہیں (کسی کو بتایئے گا مت کہ ہم نے ایف اے چار اور بی اے پانچ سال میں کیا جبکہ گذشتہ چار سالوں سے قانون کی ڈگری کیئے جا رہے ہیں) پاسپورٹ پر نام بھی ہمارا ہی تھا "عادل نواز" خیر اب تو ہم یونیورسٹی ہوسٹل اور محلے میں "چوہدری عادل نواز گجر ایڈووکیٹ" کے نام سے ایک مشہور شخصیت بن چکے ہیں۔

پاسپورٹ کی ضرورت کچھ یوں بھی پیش آئی کہ گذشتہ برس ہمارے ایک دوست برطانیہ چلے گئے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ دوستی سرحدیں نہیں دیکھا کرتی۔ ہمارے اس دوست نے برطانیہ کے پرامن حالات بتائے، وہاں کے عوام دوست اور فلاحی نظام کا ذکر کیا۔ مذہبی آزادی ایسی کہ مندر، مسجد اور گردوارے ایسی ہمسائیگی میں ہیں کہ کبھی تو مسجد کے میناروں کے سائے گرجا گھروں میں پڑ رہے ہوتے ہیں اور مندروں کی گھنٹیاں گردواروں کے صحنوں میں صاف سنائی دے رہی ہوتی ہیں اور ہر شخص یہاں اپنے مذہب اور عقیدے کے مطابق من پسند عبادت گاہ میں جانے کے لئے آزاد، خود مختار اور محفوظ و مامون

گرتے ہیں لوگ گرمیِ بازار دیکھ کر
سرکار دیکھ کر! مری سرکار دیکھ کر !!
(عبدالحمید عدمؔ)

ہے۔ یہاں کے لوگ سوشل ایسے کہ دوسروں کی غلطی کے باوجود خود ہی ''معذرت'' کر کے مسکرا کے آگے گزر جاتے ہیں۔ زندگی کی اسائشات اور سہولیات تک رسائی کا ذکر بھی بلا امتیاز کیا تو ہم سے بھی رہا نہ گیا۔ سوچا یہ وکالت کا کورس تو ہوتا ہی رہے گا، اب کے برس نہ سہی چند سال بعد ہی سہی وکالت کی ڈگری تو ہمیں مل ہی جانی ہے۔ اور اگر ڈگری نہ بھی ہو تو کیا، ہم نے اپنے نام کے ساتھ ایڈووکیٹ لکھوالیا ہے اور بہت سے لوگوں کو قائل بھی کر لیا ہے کہ وہ ہمیں ایڈووکیٹ بلایا کریں۔ اب تو وزٹنگ کارڈز بھی چھپنے کے لئے پرنٹنگ پریس میں جا چکے ہیں۔ اور یہ بھی کہ ''مکمل ہو یا نامکمل ڈگری ڈگری ہی ہوتی ہے''

ہاں تو جی میں خیال آیا کہ کیوں نا ایک سفر برطانیہ کا ہی رکھ لیا جائے، جی لگ گیا تو ٹکے رہیں گے یا بصورتِ دیگر واپس آجائیں گے اور ایک نئے عزم کے ساتھ ایل ایل بی مکمل کرنے میں لگ جائیں گے۔

سفری دستاویزات کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ یار لوگوں نے ویزہ لگوانے کے لئے پاسپورٹ ضروری قرار دیا ہوا ہے۔ اگرچہ الماری کھولنا، پرانے کاغذات میں سے پاسپورٹ نکالنا ہماری آرام پسند طبیعت اور مزاج کے خلاف تھا مگر بالآخر چھ ماہ کی غور و فکر اور منصوبہ پسندی کے بعد آج ہم نے پاسپورٹ حاصل کر ہی لیا۔ پاسپورٹ کے ایک کونے میں درج تاریخ پہ نظر دوڑائی تو معلوم ہوا کہ یہ اپنی قانونی مدت پوری کر کے زید المیعاد ہو چکا ہے۔ لہذا توسیع ضروری ہے۔ سو پاسپورٹ اُٹھایا وقت دیکھا تو ہمارے گلیکسی موبائل نے مسکراتے ہوئے پیغام دیا کہ ابھی خاصا وقت ہے ہم متعلقہ بنک میں آج ہی فیس جمع کروا سکتے ہیں۔ لو جناب! ہم نے گاڑی نکالی اور قریبی برانچ جا پہنچے۔ پتا چلا کہ دفتر کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ لہذا کل صبح زحمت اٹھانی ہوگی۔ یا خدا یہ بھی کتنے عجیب لوگ ہیں، آج ہی تو ہم تڑکے تڑکے جاگے تھے۔ ہماری تو ابھی صبح بھی شروع نہیں ہوئی اور ان کی شام بھی ہو چلی۔ کیسا عجیب دفتر ہے یہ بھی، کھلا بھی ہے اور بند بھی۔ خیر ہم کل صبح واقعی میں جلدی جاگنے کا دل میں پکا ارادہ کر کے چل دیئے۔ چلتے ہوئے یہ محسوس ہوا گویا کوئی کوئی ہمارے پیچھے پیچھے آرہا ہے۔ مڑ کے دیکھا تو ایک صاحب نے بتیسی دکھائی اور کہا حضور آپ کیوں مایوس ہو

عورتوں کے ساتھ باتیں کرنے کو غزل کہا جاتا ہے۔۔۔ دُرست، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مردوں کے ساتھ بھی تو باتیں کی جاتی ہیں، مردوں کے ساتھ باتیں کرنے کو کوئی نام کیوں نہیں دیا گیا؟ زبید بھائی نے جو آج کل فنِ عروض کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق از سرِ نو مرتب کر رہے ہیں، عروض میں پائی جانے والی اس خامی کو خاص طور پر اہمیت دے رہے ہیں۔ ویسے ان کا ذاتی اندازہ ہے کہ شاعری چونکہ قبل از تاریخ کی چیز ہے لہذا ہوسکتا ہے کہ انسان اس کے ابتدائی اصناف کے نام اور اصول وغیرہ بھول بھال چکا ہو ایسے ہی جیسے اہرامِ مصر اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ آج بھی ہمارے سامنے موجود ہے مگر اُن کی تعمیر کا طریقہ اب ہمیں یاد نہیں رہا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نظم کا لفظ ابتدا میں مردوں کے ساتھ باتیں کرنے کے لئے ہی استعمال کیا گیا ہو۔ یوں بھی غزل کے مقابلے میں نظم لکھنے کے لئے جو آسانیاں رکھی گئی ہیں اُن کا تعلق مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی کم ذہنی صلاحیتوں سے ہی ہوسکتا ہے۔ ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اگرچہ عورت اور نظم کا باہمی تعلق شعور سے مٹ چکا ہے اس کے باوجود جب دورِ جدید میں عورتوں کی آزادی کے بارے میں سوچا جانے لگا لاشعوری طور پر ساتھ ساتھ نظم کی آزادی کی باتیں بھی ہونے لگیں اور غزل کے آج تک پابند رہنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ مردوں کی آزادی کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں گیا۔ گمانِ غالب یہ بھی ہے کہ ابتدائی شاعری کے مضامین کا تعلق چونکہ وارداتِ قلبی سے ہی رہا ہے اور وارداتِ قلبی کی ابتدا عام طور پر باتوں کے بجائے اشاروں سے ہوتی ہے لہذا عین ممکن ہے کہ مردوں کی طرف سے کیئے گئے اشارے کے لئے قطعہ کا لفظ اور عورتوں کی طرف سے جوابی اشارے کے لئے رُباعی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہو۔

اعظم نصر

بہت مشکل تھا جن کو ڈھونڈ نا میک اپ کے ملبے سے سو اندازے سے اُن کو بانکپن لکھنا پڑا مجھ کو (امیر الاسلام ہاشمی)

کے جارہے ہیں۔اس خادم کو موقع دیں آپ کا کام ابھی پانچ منٹ میں ہو جائے گا۔

"بھئی آپ کیسے جانتے ہیں ہمیں اور کس طرح کی خدمت کی بات کر رہے ہیں" ہماری یہ بات سن کر وہ شخص تھوڑا اور قریب ہوا اور جھکتے ہوئے بولا: "چوہدری صاحب ! جیسے ہی آپ گاڑی سے اترے میں سمجھ گیا کہ آپ کو میری خدمت کی ضرورت ہو گی میں نے تو آپ کو آواز بھی دی، مگر آپ جلدی سے آگے نکل گئے۔بس میں بھی یہ سوچ کے رہ گیا کہ بالآخر آنا تو آپ نے میرے پاس ہی ہے لہذا آپ کا انتظار کیا۔دیکھئے نا چوہدری صاحب ! ہمارے ہوتے ہوئے بھلا آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔" ہمیں کوئی چوہدری صاحب کہے اور وہ بھی دو، دوبار، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اس کی بات نہ مانیں۔مگر یہ فکر بھی دامن گیر کہ جب دفتر کا وقت ہی ختم ہو چکا ہے تو یہ آدمی کیسے ہماری مدد کر سکے گا۔

"چوہدری صاحب! سوچئے مت آپ کل پھر زحمت کریں گے، وقت اور پیٹرول دونوں ضائع کریں گے میں یہ

کام ابھی پانچ منٹ میں کروادوں گا بس آپ کو تھوڑی اضافی رقم دینا ہوگی، زیادہ بھی نہیں بس یہی دو سو روپے"

ایک تو ہمیں اس نے پھر چوہدری صاحب کہا اور کام بھی کرانے کی یقین دہانی کرائی۔سو ہم نے بنک فیس بمع اضافی رقم اس کو تھما دی اور بنک کے احاطے ہی میں اس کا انتظار کرنے لگے۔کچھ ہی دیر میں وہ مسکراتا ہوا ہماری طرف آیا اور رسید تھمادی۔ہم حیران بھی تھے اور مطمئن بھی کہ چلو ایک کام تو ہو گیا۔

اب اگلا مرحلہ پاسپورٹ آفس جانے کا تھا۔اگلے روز ہی علی الصبح ہم پاسپورٹ کے قریبی دفتر چل دیئے۔وہاں جا کے دیکھا کہ خلقِ خدا کا ایک ہجوم چلچلاتی دھوپ میں قطار اندر قطار کھڑا ایک دوسرے کو کوسے جا رہا تھا۔قریب پہنچے تو قطار میں موجود لوگوں کی آوازیں بھی سنائی پڑنے لگیں۔کوئی اہلِ دفتر کی "عزت افزائی" میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا تو کوئی شاہِ وقت کو کھری کھری سنا رہا تھا۔قطار میں موجود ہر ایک ہی کی یہی خواہش تھی کہ

آفندی نے گاؤں میں رنگ ریزی کی دکان کھولی اور گاؤں والوں کے کپڑے رنگنے شروع کر دیے۔لوگ اُن کی کاریگری کی تعریفیں کرنے لگے تو ایک سوداگر حسد سے جل بھن گیا۔آخر کچھ سوچ کر وہ کپڑے کا ایک ٹکڑا لیے آفندی کی دکان پر آیا اور کہا:

"آفندی، ذرا یہ کپڑا تو رنگ دو۔میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کیسے کاریگر ہو۔"

"جناب، آپ کو کون سا رنگ پسند ہے؟"

"رنگ؟ رنگ کے بارے میں میری کوئی خاص پسند نہیں۔بہر حال مجھے سفید، سرخ، زرد، سبز، نیلا، کالا، اور بینگنی رنگ قطعی اچھا نہیں لگتا۔سمجھ گئے!"

"سمجھ گیا، بالکل سمجھ گیا!" سوداگر کا یہ انداز دیکھ کر آفندی نے دل میں کچھ سوچا اور کپڑا لیتے ہوئے کہا، "جناب، اسے آپ کے من پسند رنگ میں رنگوں گا۔"

"اچھا، تو لینے کب آؤں" سوداگر نے پوچھا۔

آفندی نے کپڑا الماری میں رکھ کر تالا لگایا اور جواب دیا، "آپ پیر، منگل، بدھ، جمعرات، جمعہ، ہفتہ اور اتوار چھوڑ کر کسی بھی دن آجائیں!"

اس کا کام سب سے پہلے ہو۔جس کی وجہ سے معاملہ گالی گلوچ سے ہاتھا پائی تک پہنچ جاتا مگر کچھ ہی دیر بعد وہی لوگ بھائی بھائی بن کے شرافت سے قطار میں کھڑے ہو جاتے۔اچانک کسی کا کہیں سے دھکا لگتا تو دوبارہ جنگ کی سی فضا پیدا ہو جاتی۔ہم ابھی اسی شش و پنج میں تھے کہ آیا قطار میں لگ جائیں، ماموں جان کو فون کریں کہ وہ ہماری سفارش کر دیں جو خود بھی ایک اہم سرکاری محکمے میں "ڈائریکٹر" کے عہدۂ جلیلہ پر فائض ہیں یا کل صبح دوبارہ آیا جائے۔اتنے میں ایک سرگوشی سی سنائی دی۔"چوہدری صاحب سوچ کیا رہے ہیں، حکم کریں نا!

"بھئی آپ کیسے جانتے ہیں کہ ہم چوہدری صاحب ہیں اور دوسرا یہ کہ آپ ہماری کیا خدمت کر سکتے ہیں"

وہ بڑی لجاجت سے بولا:

''جی کون کہتا ہے کہ آپ چوہدری صاحب نہیں ہیں، یہ شان وشوکت، یہ قیمتی لباس اور یہ اتنا مہنگا موبائل فون، میں تو دیکھتے ہی آپ کو پہنچان گیا، چھوڑیۓ نا چوہدری صاحب! آپ کیوں اس قدر طویل قطار میں جلتے سورج تلے عام لوگوں کی طرح کھڑے ہونے کی زحمت اٹھاتے ہیں۔ بس مجھے آٹھ سو روپے عنایت کیجئے، پھر دیکھئے میں آپ کو سب سے پہلے نہ لے جاؤں تو کہئے گا، ویسے بھی صاحب آپ خود سوچئے اتنی بڑی خدمت کا اتنا سا حق تو بنتا ہی ہے نا''

ہم ابھی اس کی باتوں پر غور فرما رہے تھے کہ جب یہ آدمی اپنا کام کروا رہا ہے تو ماموں جان کو زحمت دینے کی کیا ضرورت ہے، آٹھ سو روپے ہی کی تو بات ہے۔

''جناب سوچئے مت، جلدی فیصلہ کیجئے یا پھر مجھے اجازت دیجئے''

وہ شاید کسی اور چوہدری کی تلاش میں جانا چاہتا تھا۔ ہم نے ایک بار پھر لمبی قطار میں کھڑے لوگوں کو پسینہ بہاتے دیکھا۔ بے ساختہ ہمارا دایاں ہاتھ جیب میں چلا گیا اور کچھ کرارے نوٹوں کے ساتھ برآمد ہوا۔

نتیجتاً ہم سب سے آگے مین دفتر کے دروازے کے سامنے موجود تھے۔ ابھی دفتر میں وقفہ تھا۔ کچھ ہی دیر میں دروازہ کھلا، کھلی تو کھڑکی ہی تھی مگر وہ تو قطار میں لگے لوگوں کے لئے ہمارے لئے تو دروازہ ہی کھلا اور ہم اندر تشریف لے گئے۔ اگر چہ کچھ نا معقول سے الفاظ بھی سننے کو ملے جو قطار میں کھڑے لوگوں کی ہرزہ رسائی تھی مگر ہم بھی کب تھے ان کی پروا کرنے والے۔ کمرے کے کم درجہ حرارت نے کچھ سکون بخشا۔ یہاں ہمارا پہلا سیشن تصویر بنوانا تھا۔ مگر فوٹو گرافر ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ اتنے میں چند اور لوگ بھی کمرے میں آدھمکے۔ شاید یہ بھی چوہدری صاحبان ہی تھے۔ پہلے دو، پھر تین، پھر تین اور چوہدری ہمارے ساتھ کمرے میں آٹھہرے۔ اس کھلے تضاد کے نتیجے میں قطار میں موجود لوگوں نے بے ہنگم آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ رہی سہی کسر گرمی نے نکال دی۔ ایک ہزار افراد کے بہتے قسم قسم کے پسینے نے وہ اثر چھوڑا کہ

صحیح رقم خوش نویس

پہلے کچھ اور کیا کرتے تھے۔ ایک دن جھنجھلا کر کاتب بن گئے۔ آپ کی لکھی ہوئی تحریر پر پروئے ہوئے موتیوں کا گماں گزرتا ہے۔ زبان کے پکے ہیں۔ جب وعدہ کرتے ہیں تو اُسی سال کام مکمل کر کے رہتے ہیں۔ لکھتے وقت موقعے (اور اپنے موڈ کے مطابق) عبارت میں ترمیم کرتے جاتے ہیں۔ عالمِ دلسوزی کو عالمِ ڈلہوزی، بچھڑا عاشق کو بچھڑا عاشق، سہروردی کو سر دردی، سماجی بہبودی کو سماجی بیہودگی، وادئ نیل کو وادئ بیل بنا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔

شفیق الرحمن

ہوش ٹھکانے آ گئے۔ مگر ہم بھی پیچھے ہٹنے والے نہ تھے، بھئی پیسہ خرچ کیا تھا آخر! خیر فوٹو گرافر آ پہنچا۔ ہم سے پہلے ہی کسی کو سٹول پر کیمرے کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ کیمرا مین بٹن دبانے ہی والا تھا کہ ایسا زوردار دھکا لگا کہ کوئی کیمرے کے سامنے بیٹھے سٹول پر آدمی سے جا ٹکرایا۔ مجبوراً کیمرہ مین رک گیا۔ چند موٹی موٹی گالیاں دیں (ہوا میں) اور دوبارا کیمرہ سیدھا کیا۔ اب کے سٹول پہ بیٹھے ہوئے شخص کے ساتھ ساتھ کیمرا اسکرین پر تین اور افراد بھی جلوہ نما تھے، کسی کا بازو تھا تو کسی کا سر۔ بار بار کی کوشش اور گزارش کے باوجود بھی معاملہ درست نہ ہوا تو کیمرا مین خفا ہو کر کہیں روپوش ہو گیا۔ ڈھونڈے سے ہی نہ ملا۔

آدھا گھنٹہ یوں ہی گزر گیا۔ بڑی مشکل سے اسے دریافت کر کے لایا گیا۔ اسی دوران کئی اور چوہدری بھی کمرے میں آ گئے۔ ایک قطار سی بن گئی، ساتھ ساتھ باہر کے لوگوں کا غم وغصہ بھی بڑھنے لگا اور ''مقدس کلمات'' کا تبادلہ بھی۔ اچانک ہماری نگاہ دیوار میں گڑھے ایک آئینے پر پڑی۔ پہلے تو اسے نظر کا دھوکہ سمجھ کر نظر انداز کر گئے۔ مگر لاشعوری طور پر ایک بار پھر نظر پڑی۔ نظر نظر میں لاکھوں سوال ابھرے۔ پھٹا ہوا کالر۔۔۔ گردن پہ رگڑ کا نشان۔۔۔ اور یہ نین نقش بھی تو ہمارے ہی ہیں مگر یہ ٹماٹر سا لال چہرہ کس کا ہو سکتا ہے، یقیناً ہمارا ہی۔

آئینہ آج سچ بول رہا تھا۔

یوسف عالمگیرین

بسکہ دشوار ہے

دنیا کے چند مشکل کاموں سے ایک کام کسی رسالے یا میگزین کا ایڈیٹر یعنی مدیر ہونا ہے۔ جیسے ہی آپ کسی رسالے کے ایڈیٹر مقرر ہوتے ہیں تو یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہے۔ کبھی کبھی یہ خبر اس طرح بھی پھیلتی ہے جیسے کسی دور میں برِ صغیر میں طاعون پھیلا تھا۔ نہ اس وقت لوگوں کے پاس طاعون کا علاج تھا نہ ایڈیٹر کے پاس ان تخلیقات کو رد کرنے کا کوئی ''اخلاقی جواز'' ہوتا ہے جو کسی نے انتہائی عرق ریزی کے بعد ارسال کی ہوتی ہے۔ بعض غزلیں اور نظمیں الحمد؟ اتنی بے وزن ہوتی ہیں کہ اُن کو پڑھ کر اور دیکھ کر مدیر کی جان نکل جاتی ہے۔ جان اس لئے نکل جاتی ہے کہ شاعر مذکورہ نے جس محبت اور اپنائیت کے ساتھ ڈیڑھ صفحے کے خط میں مدیر اور مجلّے کی تعریفوں کے پُل باندھے ہوتے ہیں اور ساتھ اپنی دو عدد بے وزن غزلیں ارسال فرمائی ہوتی ہیں مدیر کے لئے ان کو کھلے عام' بے وزن قرار دینا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ کام اُس وقت اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جب مدیر شاعری کے معاملے میں خود بھی وزن میں نہ ہو۔ مدیر کے نہاں خانے میں شاید کہیں یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر ان غزلوں کو غیر معیاری اور بوسیدہ قرار دے کر صاحبِ غیر معیار کو ناراض کر لیا تو اگر وہ ڈیڑھ صفحے کے خط میں تعریفوں کے پُل باندھ سکتے ہیں تو اڑھائی صفحے میں مدیرِ مذکور اور اس کے جملے کی دھجیاں بکھیرنا اُن کے لئے کون سا مشکل ہوگا۔

بعض شعرا اور نثر نگار صاحبان مہینے کی آخری تاریخوں میں اپنی تخلیقات ارسال کر کے یہ نتیجہ اخذ کر چکے ہوتے ہیں اب مدیر کہیں بچ کر نہیں جا سکتا اور وہ ہر صورت میں ان تخلیقات کو اگلے شمارے میں شامل کرے گا وگرنہ۔۔۔ اس کا شمارہ نامکمل رہ جائے گا۔ ظاہر ہے لیٹ اور بسا اوقات غیر معیاری ہونے پر وہ تخلیقات اگلے اور اُس کے بعد آنے والے کئی ''اگلے'' شماروں میں جگہ نہیں بنا پاتیں تو بعض تخلیق نگار بپھر جاتے ہیں اور تحکمانہ انداز میں فون کالز' میسجز اور خطوط کا تبادلہ کرتے ہیں جب مدیر انہیں گِلے لپٹے انداز میں جگہ کی کمی' پالیسی یا کسی اور چیز کا بہانہ بنا کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے تو تخلیق کار اُسے ''سخت سست'' کہتے ہوئے اُس پر دو حرف بھیج کر چپ ہو جاتا ہے۔ ہاں مدیر اُن سینئر اور کہنہ مشق تخلیق کاروں اور شعراء سے شرمندہ ضرور رہتا ہے جن کی تحاریر معیاری اور شاعری وزن پر پوری اُترنے کے باوجود صفحات کم ہونے اور بعض اوقات موضوع پُرانا ہو جانے کی بناء پر شائع نہیں ہو پاتیں۔

ہر مدیر یہ چاہتا ہے کہ اُس کے زیرِ ادارت شائع ہونے والے میگزین میں کسی نامور شخصیت اور معاشرے میں کسی نہ کسی حوالے سے شہرت حاصل کرنے والے افراد کے انٹرویوز شائع ہوں تاکہ ان کے خیالات سے قارئین مستفید ہوں اور رہنمائی حاصل کر سکیں لیکن بسا اوقات بہت سینئر شعرا اور ادیب انٹرویو کا وعدہ کر کے جب اپنی گونا گوں مصروفیت کی بناء پر عین وقت پر ''کئی کئی

پھڑکاتے'' (وقت نہیں دے پارہے ہوتے) تو مدیر کے لئے اُس اچانک صورت حال سے نمٹنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے سٹاف کو چند روز قبل فخریہ انداز میں خبر دے چکا ہوتا ہے کہ اس بار ہم فلاں شخصیت کا انٹرویو کررہے ہیں۔ پھر مدیر اپنے سٹاف کے سامنے مذکورہ شخصیت کا انٹرویو نہ ہو سکنے کی ایسی ایسی وجوہات اور توضیحات پیش کررہا ہوتا ہے جو خود اُس شخصیت کے ذہن میں بھی نہیں ہوتیں۔ گویا ایڈیٹرز (مدیران) کو مختلف تجربات درپیش آتے رہتے ہیں۔ پاکستان ٹائمز کے ڈپٹی ایڈیٹر اور ۹۱۔۱۹۹۰ میں پنجاب یونیورسٹی شعبہ صحافت میں ہمارے اُستاد جی ایم نقاش مرحوم اس واقعہ کے راوی ہیں کہ ایک وفد پاکستان ٹائمز کے نیوز روم میں دورے کے لئے آیا تو جو صاحب وفد کا سٹاف سے تعارف کروا رہے تھے کہنے لگے یہاں ایک ایڈیٹر ہے اور باقی ''سب ایڈیٹر'' ہیں تو وفد کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہاں سب کے سب لوگ ایڈیٹر کیسے ہو سکتے ہیں۔ ایڈیٹر کے ساتھ دیگر سٹاف بھی تو ہوتا ہوگا۔۔۔؟

ایڈیٹر کے لئے ایک اور مشکل بھی ہوتی ہے کہ وہ جس زبان کے میگزین کا ایڈیٹر ہو تو اُس کے بارے میں یہ قیاس کر لیا جاتا ہے کہ اُسے اُس زبان کے ہر لفظ کا مطلب آتا ہوگا اگر یہ ہوتا تو انگریز جن کی مادری زبان ہی انگریزی ہوتی ہے وہ انگریزی کی اتنی موٹی موٹی ڈکشنریاں کیوں بغل میں دبائے پھرتے۔ الغرض ایڈیٹر ''انڈر پریشر'' رہ کر کھیلنے کا عادی ہو جاتا ہے وہ نہ تو شاہد آفریدی کی طرح ''ٹھلے'' لگا سکتا ہے اور نہ ہی مصباح کی طرح ٹک ٹک کر سکتا ہے۔ بقول میر تقی میر

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

دوسرے لفظوں میں ایڈیٹر کی زندگی میں سکون نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ وہ دن ایڈیٹر کے لئے سب سے بھاری ہوتا ہے جس دن وہ اپنی کاپی پریس میں بھجوا کر اپنے سٹاف کو چھٹی دے چکا ہوتا ہے اور پھر پریس سے فون آتا ہے کہ اس میں کوئی مضمون یا مضمون پر لگی ہوئی اہم تصویر غائب ہے یا اُس کا لنک نہیں کھل رہا۔ اس کے بعد ایڈیٹر کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سٹاف ممبران اپنے اپنے موبائل سوئچ آف کر کے خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہوں گے۔

گویا ایڈیٹر کو اپنے میگزین کے لئے مختلف ایشوز پر لکھوانے' غیر معیاری تحاریر بھجوانے والوں کو یہ بتانا کہ آپ کی چیزیں غیر معیاری ہیں' اچھا لکھنے والوں کو یہ بتانا کہ جگہ کی کمی یا بعض اوقات پالیسی ایشو کی بنا پر آپ کی تخلیقات نہیں لگائی جا سکیں ایک کٹھن مرحلہ ہے۔ کسی سخت طبیعت تخلیق کار کو یہ بتانا کہ آپ کی تخلیق غیر معیاری ہے مصیبت کو دعوت دینے والی بات ہوتی ہے کہ تخلیق تو بچے کی طرح ہوتی ہے ہر ماں کو اپنا بچہ زیادہ پیارا لگتا ہے لہٰذا وہ لوگوں کو یہ کہنے کا حق نہیں دیتی کہ خدانخواستہ بچہ مناسب شکل کا واقع ہوا ہے۔

ہر ایڈیٹر کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اُس کے میگزین کے خریدار بنیں اور وہ بھی مستقل خریدار۔ اُس کے لئے میگزین میں طرح طرح کے اشتہار دیئے جاتے ہیں جو بالکل جینوئن ہوتے ہیں کہ سالانہ خریدار بننے سے خریدار کو چند سو روپوں کی بچت بھی ہو جاتی ہے لیکن اُن کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی کیونکہ بعض قارئین تو درسی کتب بھی خرید کر پڑھنے کے عادی نہیں ہوتے۔ بلاشبہ ایڈیٹر کے لئے باعثِ فخر ہوتا ہے کہ بعض شخصیات اُن کا میگزین ضرور پڑھیں لیکن اُن کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے۔ لہٰذا اُنھیں اعزازی شمارہ بھیجنا بھی اعزاز کی بات ہوتی ہے بہرکیف بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو صرف فری پرچہ منگوانے پر یقین رکھتے ہیں لیکن اُسے پڑھتے نہیں۔ جو قومیں ''پڑھتی'' ہیں پھر مستقبل اُنہی قوموں کا ہوا کرتا ہے۔ ہماری قوم تو ویسے ہی ایک عرصے سے ''پڑھنے پڑی'' (سوچ میں مبتلا) ہوئی ہے اور اپنے لئے کسی منزل کی تلاش میں ہے۔ قوم جیسے جیسے پڑھنا شروع کرے گی اس کی منزل بھی قریب سے قریب تر ہوتی چلی جائے گی۔ لیکن اس کے لئے شیشہ سموکنگ سپاٹس کی بجائے لائبریریاں آباد کرنا ہوں گی کہ لفظ بھی کسی درویش کے رقص کی طرح ہوتے ہیں جو خیالات اور امنگوں کو نئے معنوں سے روشناس کراتے ہیں۔

سکندر حیات بابا

جدید فیس بکی شاعرات اور نسائی ادب

نوٹ:-اگر آپ شاعر ہیں یا شاعری سمجھنے والے ہیں تو میری یہ تحریر نہ ہی پڑھیں تو بہتر ہے۔

حضور مانا کہ تحریکِ حقوقِ نسواں یا نسائی تحریک عورت کی حیثیت واہمیت، مساوی حقوق آزادیٔ رائے کے حصول اور اسے مکمل انسان تسلیم کرنے کے نقطہ نظر کا احاطہ کرتی ہوگی، یا پھر ہمیں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ ہر عہد میں عورت پر استحصالی قوتیں مذہبی، ریاستی اور خاندانی سطح پر حاوی رہیں ہیں، صنف نازک کے حقوق کی بات کرنے پر یا اس کے لئے عملی کوشش پر ہمیں کوئی اعتراض بھی نہیں بلکہ ہم آپ کے جذبہ خدمت انسانیت کو سراہتے ہوئے آپ کو نیک مقصد میں کامیابی کی دعا دیتے ہیں ،لیکن اب اس غمناک موضوع کی حقیقت کو ایسا بھی کیا رونا کہ افسانے اور حقیقت میں تمیز مشکل ہوجائے، ہم تو آج کے جدید فیس بکی دور میں عورت ذات کو کہیں اوپر پاتے ہیں، مرد ہنر مند ہوتے ہوئے بھی اپنی خالی "وال" کو حسرت بھری نظروں سے گھور رہا ہوتا ہے تو عورت صرف عورت ہونے کی بنا پر پرہجوم معتقدین کی جھرمٹ میں اتراتی پھرتی ہے۔

خاص کر میدان ادب میں جو بے ادبیانہ طوفان بدتمیزی جدید فیس بکی ادیباؤں نے مچا رکھا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، چند جینوئن اور اچھی خواتین کو چھوڑ کر یہ جدید بے ادب ادبائیں ہی ہیں جو بڑے اور پرانے مرد ادیبوں کی عقل پر پردہ ڈالے یہ لکھنے والے مرد ادیبوں کی حق تلفی کا سبب بنتی ہیں۔

کچھ اساتذہ اور کچھ نام نہاد اساتذہ کو ان "نئے لب و لہجے" کی ادیباؤں کی تعریف وتصیح سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ یہ لکھنے والے مرد ادیب کی کسی تخلیق پر ایک نظرِ محبت ڈال سکیں۔

پچھلے دنوں ایک اچھے شاعر دوست کو دل کا دورہ پڑنے کی خبر سن کر ہم بھاگے بھاگے ہسپتال پہنچے، موصوف ہوش وحواس سے بیگانہ تھے، چار گھنٹے بیہوش رہنے کے بعد انہوں نے روتے ہو؟ سنسنی خیز لہجے میں جو تفصیلات ہمیں بتائیں اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

بابا جی یار بس کیا کہوں میری بدقسمتی ہی تھی جو میرے تھری جی پیکج کے ختم ہونے میں آدھا گھنٹہ باقی رہ گیا تھا اور میں نے سوچا فیس بک کا ایک چکر لگا کر اپنی نئی غزل پر اساتذہ کی اصلاح ملاحظہ کرلی جائے،

میری وال تھر کے صحرا کی طرح سنسان اور غزل کے کمنٹس باکس پاکستانی انٹرنیشنل کرکٹ سٹیڈیم کی طرح ویران تھے، میں نے خوش گمانی سے کام لیتے ہوئے سوچا شاید کوئی صاحب ذوق قاری یا اساتذہ میں سے کوئی آن لائن ہی نہ آیا ہوگا، لیکن پھر لاگ آؤٹ ہونے سے پہلے دفعتاً میری نظر اس نئی لالی پوڈر چہرہ شاعرہ "بلقیس غمزدہ" کی غزل پر پڑی۔

غزل کے کمنٹس میں اپنے تمام شاعر دوستوں کی داد وتحسین

دیکھ کر میں نے اس غزل کو پڑھنے کی کوشش کی، پڑھنے کی کوشش اسلئے کہ غزل ایک معروف جرمن ماڈل کے نیم برہنہ تصویر پر بہت ہی مدھم فونٹ میں تحریر تھی۔

پہلا ہی شعر پڑھ کر مجھے اپنے ان دوستو پر غصہ آنے لگا جو اس غزل پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسا رہے تھے، شعر تھا:

تم جو چاہو تو مجھے روک سکتے ہو مگر

ہے یہ حالات کا تقاضہ چلتی ہوں خدا حافظ

اور پھر دوسرا شعر پڑھ کر تو مجھے اس غزل پر تعریفوں کے پل باندھنے والے شاعروں کی ذہنی حالت پر شک ہونے لگا، وہ شعر تھا:

ہم تو آئے تھے اس بزم میں صرف تیری خاطر

تجھے ہے اوروں کی پرواہ چلتی ہوں خدا حافظ

تیسرا شعر پڑھنے کی تاب مجھ میں نہیں تھی لیکن چونکہ کچھ معروف اساتذہ کی واہ واہ بھی کمنٹس میں درج تھی تو حوصلہ کر کے پڑھ ہی لیا۔

اچھا گزارا وقت تمھاری اس بزم میں !!

اب مجھ کو دو اجازت چلتی ہوں خدا حافظ

اتنا کہہ کر میرا شاعر دوست خاموش ہو گیا اسکا رنگ ایسے متغیر ہو گیا تھا جیسے کسی پاکستانی پولیس والے کی ایمانداری کی خبر سن کر کسی کا بھی ہو سکتا ہے۔

میں نے اٹھ کر اسے پانی پلایا ، چند منٹ بعد جب اسکی حالت کچھ سنبھلی تو میں نے دردناک واقعے کو جاری رکھنے کی گزارش کی۔

بس یار بابا جی! یہ سوچ کر میں نے آخری شعر بھی ہمت کر کے پڑھ لیا، کہ شاید آخری شعر میں ہی ایسی کوئی بات ہو جو ایک بڑے شاعر صاحب نے انہیں پروین شاکر ثانی کا خطاب دیا ہے۔

کیا تھا وہ آخری شعر؟

میرے پر اشتیاق لہجے پر میرے شاعر دوست نے ملامت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔

اتنا ہی اشتیاق ہو رہا ہے تو سن لو، شعر تھا:

میں نہ کہتی تھی ایک روز چلی جاؤں گی

اب کیا شکوہ کیا گلہ چلتی ہوں خدا حافظ

بدقسمتی سے چونکہ میں خود بھی ایک شاعر ہوں آخری شعر سن کر مجھ پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی، میں نے ایک نعرہ مستانہ بلند کیا، اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

اب میں ایک معروف دل کے ہسپتال میں اپنے دوست کے ساتھ والے بیڈ پر بطور سیریس پیشنٹ ایڈمٹ ہوں، اور وہیں سے یہ دل خراش سٹوری بذریعہ موبائل آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

ڈاکٹرز کی ہدایت کے مطابق ہمیں یعنی مجھے اور میرے دوست کو چرس سگرٹ شراب کسی بات کی ممانعت نہیں لیکن فیس بک ہمارے واسطے زہر قاتل ہے۔

خدا حافظ۔۔۔۔

گدھے

اس دنیا میں ہر انسان کا کسی نہ کسی گدھے سے ضرور پالا پڑتا ہے۔ اس لیے انسان کو گدھے کی سرشت سے روشناس کرانا تحصیل حاصل کی ناقابلِ برداشت کوشش ہے۔ دنیا میں گدھوں کی کہیں قلت نہیں۔ اس عالمِ آب و گل کے آبلہ پا مسافر جب ایک گدھے کو ڈھونڈنے نکلتے ہیں تو راہ میں ہزار ہا خر ہر طرف خراماں خراماں اپنی رُوسیاہی اور جگ ہنسائی کا عملی نمونہ پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ اس دنیا کے آئینہ خانے میں گدھے کو آئینہ دکھانا جوئے شیر لانے اور خود کو تماشا بنانے کے مترادف ہے۔ گدھے کو انگوری باغ، سبز باغ، حلوے پوری اور کستوری یا گل قند اور نصائح و پند کے بارے میں کوئی امتیازی بات سمجھانا بھینس کے آگے بین بجانے اور الفاظ حشرات سخن کا ٹینٹوا دبانے کی سعی ناکام ہے۔

غلام ابنِ سلطان (گفتنی ناگفتنی)

الطاف فیروز

ہائے او میری انگور زادی آئی

الطاف فیروز صاحب کی غیر مطبوعہ کتاب ”میری آنکھ میں کئی صورتیں“ کے اولین باب ”سیٹ زندگی“ سے اُڑایا گیا

آہستہ آہستہ میری اور دیگر ساتھیوں کی زندگی بھی سیٹ ہونے والی ڈگر پر چڑھتی چلی گئی اور ہم لوگ اپنی اپنی فیکٹریوں میں صبح آٹھ سے شام پانچ بجے تک بجنے کے بعد گھر پہنچتے اور پھر آپس میں بجتے، پاکستانیوں، ہندوستانیوں اور بنگال دیسیوں کو کسی ریکارڈ کی طرح اونچی سر میں بجنے کی بدعا شاید کسی ایک ہی بزرگ نے دی تھی دیگر لوگوں کے رہائشی علاقوں میں چلے جائیں تو لگتا ہے قبرستان میں آگئے تو میں عرض کر رہا تھا کہ پانچ کے بعد ہمیں کوئی اور کام تو ہوتا نہیں تھا تو ہم لوگ آپس میں بج کر وقت گزارتے اور کچھ ایسے بھی ہوتے جو اور ٹائم لگاتے اور رات کے دس گیارہ بجے تک کام کرتے البتہ ہفتے کی شام کو دوست میرے کمرے میں اکھٹے ہو جاتے جن میں لاہور کے عامر بٹ صاحب کراچی کے الیاس بھائی جسے جب کوئی الیاس چراندیا کہتا تو وہ آگے سے اپنے پان والے دانتوں کی نمائش کر کے آہستہ سے "حرامی" کہتا اور سننے والے کے بھی دانت نظر آنے لگتے، اس کے علاوہ میرے ساتھ کام کرنے والا ایک دوست جس کا نام تو کچھ اور تھا (نقضِ امن کے خوف سے اصل نام نہیں لوں گا اور اسی نام سے یاد کروں گا جو کہ اس کے پی سی پاسپورٹ پر تھا) مگر اکبر نام کے کسی پٹھان کے پاسپورٹ پر فوٹو تبدیل کر کے رہ رہا تھا ایسے پاسپورٹ کو یار لوگ پی سی پاسپورٹ کہتے ہیں اور اس کام میں برما کے لوگ بہت ماسٹر تھے اور وجہ اُس کی یہ کے برما حکومت وہاں سے مسلمانوں کو کسی طرح باہر نہیں نکلنے دیتی اور انھیں وہیں رکھ کر اُن کی نسل کشی کا ہر حربہ اختیار کیئے ہوئے ہے جیسا کہ ہمارے برمی دوستوں نے ہمیں بتایا اس لیئے ان کا پاسپورٹ بھی بہت مشکل سے بنتا ہے اور جب کسی ایک شخص کا پاسپورٹ بن جاتا ہے تو اسے پی سی یعنی پِچر چینج کر کے کئی برمی مسلمان باری باری برما سے باہر نکلتے ہیں چونکہ یہ اُن کی مجبوری ہے اس لیے اُنہوں نے اِس کام میں خود کو ماسٹر کرلیا ہے، تو بات ہو رہی تھی میرے اس دوست کی جو اکبر کے نام سے وہاں رہائش پذیر تھا اس کے ساتھ اسی کے محلے شاہ ولی کی تال قصہ خوانی بازار کا ایک اور بہت سمارٹ نظر آنے والا شخص منصور خان تھا، کبھی کبھار چند دوسرے دوست جن میں چنیوٹ کے حافظ امتیاز اور عبدالحیٔ، کراچی کے سلیم بھائی اور مظہر جنھیں اُن کی عمر کی وجہ سے سب دوست ماموں پکارتے اور بعض اوقات میرا چائنیز کرسچن دوست رچرڈ جس کی عمر کوئی پچپن سال کے لگ بھگ تھی ہمارے ساتھ آ بیٹھتے اور یوں خوب محفل جمتی ہر شخص اپنے زندگی کے تجربات اور واقعات بیان کرنے کو بے تاب ہوتا اور سننے والا اُن پر تنقید کرنے کو جسے واقعہ سنانے والا سنبھال کر رکھ لیتا اور اگلے کچھ لمحوں میں جب تنقید کرنے والا کوئی واقعہ بیان کرتا تو وہ اسی کی سنبھالی ہوئی تنقید کو اسکی بات پر دے مارتا، محفل کا رنگ کسی بھی ادبی تنقیدی محفل کی شکل اختیار کر لیتا جب ان لوگون کے مُنہ سے

جھاگ اُڑنے لگتی تو میں حیران رہ جاتا کہ یہ لوگ نہ تو قلم کار ہیں اور نہ ہی زیادہ پڑھے لکھے پھر کیوں یوں جھاگ اڑاتے لڑ رہے ہیں جو انہیں قطعی زیب نہیں دیتا مجھے ایسے موقع پر امریکہ صاحب بہادر کی طرح دخل اندازی کرنا پڑتی خدا ان سب کا بھلا کرے کہ میری سُن لیتے اور خاموش ہو جاتے وہ جانتے تھے کہ میں شاعری کرتا اور کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا ہوں اور اس نسبت سے شاید انہیں معلوم تھا کہ قلم کار گھرانے کا سپوت اگر کہیں بحث میں الجھ کر قائم ہو گیا تو پھر کیا دھوبی کا گدھا قائم ہوتا ہو گا جو ہمارا قبیلہ ہوتا ہے اور یوں وہ میرے قائم ہونے سے خائف خود ہی بحث ختم کر دیتے۔ محفل جب کبھی ایسی گرما گرم بحث میں الجھی ہوتی عجیب عجیب بولیاں سننے کو ملتیں ہر فریق اپنی مادری زبان کا بے دریغ استعمال کر رہا ہوتا۔ ہند کو میں سوال ہو رہا ہوتا تو پنجابی میں جواب دیا جاتا اور میں اُردو بولنے والے دوستوں کے لیے ٹرانسلیٹر کا کام کرتا اور اگر محفل میں رچرڈ بھی براجمان ہوتا تو اُس کی مُتجسسانہ طبعیت محفل میں اٹھنے والے قہقہوں کی وجہ سے مزید بھڑک اُٹھتی اور وہ آنکھیں سکڑتے ہوئے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھ کر بھنویں نچاتا ہوا بندر کی طرح ٹھوڑی کو اوپر کھینچ کر سر کو پیچھے کی طرف آہستہ ،آہستہ دو دفعہ جھٹکتا، یعنی لاہوری عامر بٹ کی زبان میں پوچھتا ہو ''کیا پنچائیت ہے بھئی'' اور میں اُسے انگلش میں ٹرانسلیٹ کر کے بتا تا کہ کیا بات چل رہی ہے اور کس شخص کی کیا رائے ہے وہ اس مزاحیہ بحث کو سُنتے ہی عینک اُتار کر ہاتھ میں پکڑ لیتا اور باقاعدہ ایک آدھ سکینڈ کے لیے استغراق میں جانے کے بعد اس مزاحیہ سچوئیشن پر نہایت سنجیدہ رائے دیتا جسے میں تو جیسے تیسے ضبط کر جاتا اور اُس کے بولنے کے دوران انتہائی انہماک سے گردن ہلا ہلا کر اُس کی تائید کرتا جیسے کسی گریڈ بائیس کی انتہائی تھرڈ کلاس سچائیشن پر کوئی سترہ گریڈ سے نیچے نیچے والا آفیسر سر ہلا ہلا کر اُسے قرآن کے لفظ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کی اے سی آر پر تو بہت مثبت اثرات ڈالتا ہے مگر ملک و قوم کے ریسورسیز کا بینڈ بجانے والے کو بے جا داد ثابت ہوتا ہے۔ میں بھی سر ہلا ہلا کر رچرڈ کی رائے سننے کے بعد اُسے دوستوں کے لیے اردو میں ٹرانسلیٹ کرنے کی ابتدا کو ہوتا کہ سب سے پہلے الیاس کی آواز آتی ''اے ہٹا سالا اُونٹ کا چیی دا، ابھی کچھ انٹ شنٹ ہی بکے گا اِبے سارے سرور کی ماں، بہن کر دیوے گا بھائی'' اور وہ اپنی بوتل اور گلاس اٹھا کر ایک طرف جا سادھی لگاتا، ادھر میں اردو کا ترجمہ پیش کرتا ادھر محفل میں لوٹنیاں شروع ہو جاتیں، اکبر جو حسب عادت شارٹ پہنے بانس سے پتلی ٹانگ دوسری ٹانگ میں پھنسائے سُرین سے گھٹنے تک کا علاقہ زمین سے ملائے انگلش کا ایکس بنا تکیے کو گول مٹول کر کے ران پر رکھے سر آگے لٹکائے میری بات سُن رہا ہوتا یکدم پیچھے کی طرف گرتے ہوئے قہقہہ لگاتا اور پھنسی پھنسی آواز میں کہتا ''او برباد کر چھوڑائے ای او مامے'' محفل میں پھوٹتے قہقہے جونہی زور پکڑتے رچرڈ بچارہ پریشان ہو جاتا، ہماری محفل میں اُس کا وہی کردار تھا جو دُنیا میں مسٹر امریکہ کا اور ہمارے قہقہوں پر اُسکی بوکھلاہٹ بھی ویسی ہوتی جیسے ہمارے ایٹمی دھماکوں پر مسٹر امریکہ بوکھلا گئے تھے۔ ہمارے دھماکوں کے ساتھ ساتھ اپنی سی آئی اے کی کارکردگی پر جو ملکِ خُداداد میں موجود چیونٹیوں کی سی کثیر تعداد میں موجود اپنے ایجنٹوں پر لاکھوں ڈالر صرف کر کے بھی کوئی کارنامہ نہ دکھا سکی اور ہم نے عین اُن کی ناک کے نیچے ہر کام کر دکھایا اور اس سے سی آئی اے کا وہ سارا امیج جو ہالی وڈ فلم انڈسٹری نے اپنی حسیناؤں پر اربوں ڈالر خرچ کر کے اپنی عوام کے دماغ میں بٹھایا تھا اسکو بھی خاک میں ملا دیا۔۔۔۔

محفل میں بعض اوقات مسٹر رچرڈ کو جب احساس ہوتا کہ اتنے سارے اُن بلیورز گاڈ نے اُس کے پلے یونہی تو نہیں باندھ دیئے اس کے لیئے وہ اپنے خُفیہ پلان میں اُس کا حصہ رکھتا ہے جسے پورا کرنا اور ان بھٹکی ہوئی بھیڑوں کی گلہ بانی خدا نے اس پر عین فرض کر دی ہے تو وہ ہم سب کو کوئی واعظ و نصیحت کا پروگرام بناتا اور ایسے میں حاضرین میں پائے جانے والے شرابیوں کی تعداد زیادہ ہونے کی بنا پر اُن کے حق میں قرعہ نکلتا چونکہ اس میں رچرڈ کا اپنا نشہ بھی پورا کرنا ہوتا تھا اور اللہ کو اتنا ذرا سا چھل دکھانے سے فرق ہی کیا پڑتا ہے یوں وہ اپنی خواہشِ مے نوشی کو شوقِ تبلیغ میں ملا کر گویا فراز کو انگلش میں گنگناتا:

نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

اور یوں رچرڈ خداوند کا مددگار بن کر خود کو خوش قسمت گردانتے ہوئے سوچتا قرعہ فال بنامِ من دیوانہ زدند۔ اور ان خوشی سے کودتے اور اُچھلتے شرابیوں کو متوجہ کرنے کے لیے کسی عالی جاہ کی طرح آدھی ہتھیلی کو آدھی ہتھیلی سے بہت آہستہ، آہستہ ٹکرا کر تالی بجاتا اور متانت سے آواز لگاتا "گو گو بریگ دانش اینڈ بیئر" اور ساتھ ہی اپنی دروازے پر لٹکی پینٹ سے سو دو سو رینگٹ (ملیشیا کی کرنسی) نکال کر دیتا ایسے میں الیاس چراندی کی مسکراہٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی، الیاس، منصور، اکبر، عبدالحئی، ماموں اور رچرڈ بلا کے شرابی تھے یا شاید سبھی شرابی بلا کے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی نفسیات خوب سمجھتے ہیں الیاس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلتے ہی رچرڈ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل جاتی اور بقیہ چاروں کے کان کھڑے ہو جاتے الیاس فوراً اپنے جوتے ڈھونڈنے شروع کر دیتا میں نے کبھی اسے سلیپر کے سوا کچھ پہنے نہیں دیکھا اس نے باتھ روم جانا ہو یا رچرڈ کے ساتھ کسی اچھے ہوٹل میں وہ انہی سلیپرز سے جھانکتے مور کے پاؤں جیسے پاؤں لیے گھسیٹ گھسیٹ کر چلتا ہر طرف سے گھوم آتا۔ جوتے ملتے ہی الیاس انہیں گھسیٹتا آن موجود ہوتا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی انگلش میں (اور خدا جانتا ہے کہ اس کے منہ سے نکلنے والی انگلش کے لیے ٹوٹی پھوٹی کا لفظ تو بہت ہی عالیشان ہوگا) جس کی شان بیان کرنے کے لیئے میں کوئی لفظ نہیں پاتا رچرڈ کو مخاطب کر کے کہتا، باس وہ میں۔۔۔ رچرڈ آئی گو۔۔۔۔ اور خاموشی، بس یوں سمجھیے کہ اس کی انگلش بولنے کی استطاعت یکدم یوں ختم ہو جاتی جیسے ہماری گورنمنٹوں کی ورلڈ بینک کا قرضہ اتارنے کی (اور بقول اکبر کے یہاں گورنمنٹوں کا لفظ اس لیئے استعمال کیا گیا کہ فوجی ہو یا جمہوری وہی ڈھاک کے تین پات والا معاملہ ہے) مگر رچرڈ چونکہ ایک مدت سے ہم لوگوں کے ساتھ رہ رہا ہے اس لیے وہ اُس کا مطلب سمجھ کر ایک ہی وقت میں فضا میں ہاتھ اور گردن پر سر ہلا کر یس، یس کہتا اور اس سے پہلے کہ الیاس خوشی خوشی روانہ ہوتا منصور کسی تیندوے کی طرح بلا آواز چھلانگ لگا کر اُس کی راہ میں کھڑا ہو جاتا اور گردن مٹکا کر کہتا، "اکلا تے نا جان دیسائیں ماما" (اکیلا تو نہیں جانے دوں گا ماموں) اور الیاس کھسیانی سی ہنسی ہنستا

زیرِلب ''ہرامی'' کہتا اور دونوں کھلکھلا کر ہنستے گویا اب مل کر رچرڈ کو چونا لگائیں گے۔ بعد میں ایک دن میرے استفسار پر منصور نے الیاس پر شک کی وجہ یہ بتائی '' فیروز شاہ اے بہوں حرامی یا ماڑا پیسے ٹک کے اپنے آستھے ھیک مہاراجا ناڈیا وکھرا آندا ئے ہورتے کدروں تھیں ٹک سکدا مچھی کھٹ آندا ئے'' (فیروز شاہ یہ بہت حرامی ہے بھیا پیسے مار کر اپنے لیے ایک عدد مہاراجہ کا آدھا الگ سے لاتا ہے اور جب کہیں سے پیسے مار نہیں سکتا مچھلی کم لاتا ہے) اور سچ پوچھیے تو یہ سُن کر میرا بھی خون کھولا یعنی ہمارے حق پر ڈاکہ۔

الیاس کی واپسی تک یار لوگوں کے تن میں بجلی بھر جاتی وہ ایک دم اِدھر اُدھر بکھرا سارا سامان لمحہ بھر میں سمیٹ کر فرش پر پوچا لگا کر گلاس ایک ترتیب سے رکھتے خالی پلیٹیں رکھ دی جاتیں اور لمحوں میں وہ کام کر گزرتے جسے کرنے پر انھیں گھنٹوں اُکسانا پڑتا ایسے میں مجھے وہ بالکل کسی گورنمنٹ ادارے کے ملازمین دکھائی دیتے جو اپنی آٹھ گھنٹے کی روزانہ کی ڈیوٹی کو کام کی بجائے ٹال مٹول میں گزار کر وہی کام اور ٹائم کے لیے بچا چھوڑتے ہیں اور اسی کام کے بہانے اور ٹائم لگا کر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس اِبتلا کے دور میں بھی اُس رحیم و کریم ذات نے اُن کے لیئے حلال رزق کا بندوبست کیا جسے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر حرام کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

الیاس اور منصور بئیر اور مچھلی لیکر آن پہنچتے تو یکدم سب ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ جاتے اور الیاس ایک طرف بیٹھا نہایت اہتمام سے ساقی کا کردار ادا کر رہا ہوتا وہ سب کے گلاس بھرتا اور اُن کے سامنے رکھتا چلا جاتا، پلیٹوں میں مزیدار نمکین دال ڈال دی جاتی اور ہمیں مچھلی پکڑا دی جاتی یہ ابتلا بھی اپنی ہی بے وقوفیوں کی کمائی تھی اب گلہ کرتے بھی تو کس سے وہ سیانے کہتے ہیں نا کہ ایک نہ سو سُکھ اگر تو پہلی دفعہ جب رچرڈ نے فرائی مچھلی لانے کا کہا تو میں لانے دیتا تو اب ہر مرتبہ یہ مچھلی تلنے کا کام میرے ذمہ نہ پڑتا مگر اب تو جو ہو گیا سو ہو گیا۔

مچھلی پکڑ کر کچن کی طرف جانے کی بجائے میں پل دو پل ان کا تماشہ دیکھنے رُکتا تو سب ایکا کر کے تیوری چڑھا کر میری جانب دیکھنا شروع کر دیتے اور اکبر یکدم اصیل مرُغ کی طرح گردن لمبی کر کے بولتا '' تک لالے ہُن مزہ نہ خراب کریں۔۔۔۔۔ہاں'' یہ سُن کر اس سے قبل کہ میں مچھلی تلنے کچن کی طرف جاتا منصور کمرے میں داخل ہوتا اور اپنے لمبے بالوں کو پیچھے کی طرف جھٹکتے ہوئے ٹراوزر پنڈلیوں تک کھینچ کر پاوں کے بل بئیر کی بوتلوں کے پاس بیٹھ گیا اور بوتل کو سہلاتے ہوئے انھیں پچکارنے اور پکارنے لگتا ''ہائے او میری انگور زادی آئی'' اور میں مسکرا کچن کی طرف چل پڑتا۔

محفل جب عروج پر ہوتی اور سب حضرات ایک، دو پیگ لگا چکے ہوتے تو رچرڈ پر تبلیغی دورہ پڑتا اور وہ اپنے خُداوند خُدا کی مدد کو میدان میں اتر آتا مگر چونکہ سب نے اپنا گوہرِ مقصود شراب، نمکین دال اور مچھلی کی صورت میں پا لیا ہوتا اس لیے اب اُس کی طرف کوئی توجہ نہ دیتا اور کچھ سننے کو تیار نہ ہوتا۔ الیاس چراندی کو اپنا صوفی یاد آنے لگتا وہ سب سے پہلے لورے میں آتا اور اس کی وجہ یہ ہوتی کہ وہ منصور کے ساتھ ساز باز کر کے ایک پاؤ وا مہاراجا کا نیفہ میں اُڑس لاتا جس میں سے اپنا حصہ بئیر کے ساتھ ملا کر پی جاتا اور باقی کا بوتل ہی میں اُس کے حوالے کر چھوڑتا، محفل جمتی اور الیاس سب سے پہلے ٹیک آف کرتا اس کا احساس ہمیں تب ہوتا جب وہ اپنے کسی صوفی کو یاد کر کے آہ و بکا کرتا اور اُس کے اُلٹے سیدھے فرمان ہمیں سُناتا اور قیامت کے حساب کتاب کا مرحلہ اپنے اُس سرابِ مستقیم میں پھنسے صوفی کی معیت میں صراطِ مستقیم پر چلنے والوں سے بھی پہلے طے کر کے جنت میں ٹہل لگا رہا ہوتا، عبدالحئی چُپ چاپ ایک کونے میں بیٹھے بیٹھے استغراق میں ڈوب جاتا محفل میں اُس کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوتا، اکبر اور منصور اِدھر اُدھر لپک جھپک کرتے ایک دوسرے کے واری صدقے ہوتے نظر آتے یوں تو دونوں ایک دوسرے کو سانپ کے نیچے کا بچھو بتاتے مگر یہاں وہ دونوں ہی کسی طرح ایک آدھا بوتل پار کرنے کے چکر میں اپنی حرکتوں سے سب کو گھمار ہے ہوتے اور ایک دوسرے کو ''لالا جی''۔۔۔''تے او جی کراں'' کہتے نہ تھکتے،

سلیم بھائی کو بھی کبھی کسی محفل میں پیتا ہوا نہ دیکھا گیا تھا لہذا وہ بھی باتیں کرتے اور کوک پیتے یا پان پرا کھاتے اور بور ہوتے رہتے جب تک میں اور حافظ امتیاز صاحب کھانا پکا کر فارغ نہ ہو جاتے مچھلی کی خوشبو پر دو کمرے پرے رہنے والا المحمود بنگالی اپنی تہبند سنبھالتا میرے سر پر آن کھڑا ہوتا اور عجیب حریصانہ نگاہوں سے مچھلی کے قتلوں کو گھورتا اور مجھے اپنے گھر کام کرنے والی زبیدہ آپا یاد آ جاتی جو ۱۹۶۸ء میں شادی ہو کر بنگلہ دیش سے پاکستان آئی تھیں پھر ۱۹۷۸ء میں اُن کا خاوند فوت ہوا تو سسرال والوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں اور وہ بچاری تیرے میرے گھر کا کام کر کے اپنے بچوں کو پالنے لگی سسرال والے اچھے کھاتے پیتے تھے مگر اس کے بچوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا تھا وہ جب سے ہمارے گھر میں کام کرنے لگی تھیں ہم بہت سی پریشانیوں سے چھوٹ گئے تھے بہت ایماندار اور سلیقہ مند عورت تھی مگر اُس کی ایک شے مجھے بہت تاؤ دیتی یہ کہ میں جب بھی گھر میں مچھلی، گوشت پھل وغیرہ لے کر آتا وہ فوراً ہر شے میں سے ایک ایک لقمہ کے برابر علیحدہ کر کے بلی کے برتن میں ڈال دیتی یا کوٹھے پر کوؤں کے لیے پھینکنے چلی جاتی ایک مرتبہ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو بولیں، ہائے بھیا ہمرے نبی جی کا فرمان نہیں ہیں کہ نجرعونٹھ (اونٹ) کو ہنڈیا میں اور بھلے چنگے بندے کو قبر میں ڈال دیویں ہے میں تو ہر شے پر سے لوگوں کی نجر اتارنے کو چھورت ناچھ (سورہ الناس) پڑھتی ایک ایک لقمہ اتار دیتی ہوں اور چونکہ یہ حدیث میں نے بھی سُن رکھی تھی سو میں چپ کر گیا کہ زبیدہ آپا ٹھیک ہی تو کرتی ہیں۔تو یوں میں المحمود بنگالی کی نظروں سے ٹپکتی بھوک سے ڈر کر زبیدہ آپا کے فارمولے پر عمل کرتا اور مجبوراً اسے کھانے کی دعوت دے بیٹھتا اور کھانے کے دوران جب وہ عجیب عجیب حرکتیں کرتا اور سب کا جی متلانے لگتا تو میں کسی پرانے شرابی کی طرح آئندہ کے لیے توبہ کرتا کہ پھر اسے کھانے پر نہیں بلاؤں گا۔

کھانا کھا چکنے کے بعد محفل جمتی یعنی باتوں کا دور شروع ہوتا اور آہستہ آہستہ کمرہ سگریٹ کے دھویں سے بھرنے لگتا ،شراب پی کر باتوں کی پٹاری کھول لینا اور سگریٹ کا تڑکا لگانا شاید

ماضی کی ایک حکومت کے دور میں حزب اختلاف کے ایک رکن اسمبلی اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے اسمبلی کی بلڈنگ پہنچے تو ان کی نسبتاً پرانی گاڑی کا سیکورٹی کے عملے نے شایان شان اور پرتپاک خیر مقدم نہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے فوراً ایک بیان داغ دیا کہ ان جیسے غریب ارکان اسمبلی کا سرکاری کارندے مناسب طور پر استقبال نہیں کرتے۔لہذا وہ کل احتجاجاً گدھا گاڑی پر سوار ہو کر اسمبلی ہال پہنچیں گے۔ چنانچہ موصوف اگلے روز بدست خود گدھا گاڑی ''ڈرائیو'' کرتے ہوئے اسمبلی پہنچے۔سیکورٹی کے عملے نے احتیاطاً ان کے ساتھ کسی کا کوئی سلوک نہیں کیا۔ چنانچہ انہوں نے قریب ہی ایک پول سے گدھا گاڑی کو باندھا اور اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے اندر چلے گئے۔ واضح رہے کہ انہوں نے جس ''پول'' سے گدھا گاڑی کو باندھا تھا وہ دراصل ''نو پارکنگ'' کا بورڈ تھا اور اس منظر کو ہمارے تمام قومی اخبارات نے اپنے صفحے کی زینت بنایا تھا۔

ایک انٹرنیشنل فیشن ہے یہاں بھی دسترخوان سمیٹتے ساتھ دوستوں کو سگریٹ کی طلب ہوتی اور مجھے چائے کی الیاس کو معلوم تھا کہ ایک تو چائے میری کمزوری ہے اور دوسرا کھانے کے بعد سست ہو کر قیلولے کے لیے لیٹ جانا۔۔۔ایسی محفل میں لیٹنا تو کسے نصیب ہوتا ہاں الیاس فوراً چائے بنا لاتا اور میں، حافظ امتیاز اور سلیم بھائی چائے کی چسکیاں لینے لگتے۔ ان محفلوں کی جان وہ واقعات ہوتے جو سب دوست اپنے اپنے علاقے کی سوغات کے طور پر سناتے جن میں وطن اور علاقے کی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی ہوتی۔ الیاس کو جوش آتا تو وہ اپنے صوفی صاحب کی تعریفیں شروع کر دیتا جو اُس کے محلے میں رہتے تھے اور بقول الیاس کے بہت پہنچے ہوئے تھے۔ ہمیں اپنے صوفی کی تعریفیں سنتا دیکھ کر اس کا حوصلہ بڑھتا اور محفل میں برکت کے پیش نظر ایک آدھ ان کی بات بیان کرتا جب بھی اُن کا ذکر کرتا ''میرا صوفی'' بڑے احترام اور عقیدت سے کہتا، زیادہ رقیق القلبی کی حالت میں ہوتا یعنی پاکستان میں اپنی اماں کی طرف پیسے نہ بھیج سکنے کا دکھ دل میں لیے

ایک اور تقریب کی بات سنئے۔اس موقع پر کسی ستم ظریف نے یہ اعلان کر دیا کہ جو اپنی بیوی سے نہیں ڈرتا اس کے لیے ایک ہزار روپے کا انعام رکھا جاتا ہے۔تمام مرد حضرات خاموش ہو گئے اور خواتین میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔اس ستم ظریف نے پھر کہا کہ اپنی بیوی سے ڈرنے والے تمام مرد حضرات اپنی اپنی بیوی کے قدموں میں بیٹھ جائیں۔دیکھتے ہی دیکھتے تمام مرد اپنی اپنی بیوی کے قدموں میں بیٹھ گئے مگر ایک دبلا پتلا شخص سہما سہما سا اپنی بیوی کے ہمراہ کھڑا رہا۔لوگوں نے اسے مبارکباد دی اور اس کی جرات کی تعریف کی کہ اتنے بڑے مجمع میں وہ واحد مرد ہے جو اپنی بیوی سے نہیں ڈرتا۔انعام کی رقم دینے سے قبل لوگوں نے اس کی بیوی سے تصدیق کی کہ کیا واقعی اس کا شوہر اس سے نہیں ڈرتا اور اسے کس بات سے اپنی بیوی کے قدموں میں بیٹھنے سے روکے رکھا۔بیوی نے ایک نظر اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور گویا ہوئی۔میں نے اس کے کان میں کہہ دیا تھا کہ خبردار جو تم میرے قدموں میں بیٹھے،بس سیدھے کھڑے رہو۔مجھے ایک ہزار روپے کی شدید ضرورت ہے۔

از: یوسف ثانی (یوسف کا بکا جانا)

بیٹھا ہوتا تو "میرا صوفی" کہنے کے بعد بازو سے بندھا امام ضامن کھول کر چومتا اور پھر بڑی دقت سے دوبارہ باندھنے کی مشقت اٹھاتا کیونکہ حافظ امتیاز نے سب دوستوں کو منع کر دیا تھا کہ یہ بدعت ہے اور شرک کے زمرے میں آتی ہے آپ اللہ کو اپنا ضامن نہیں مانتے مگر پیسے کو مانتے ہیں اور حافظ صاحب کی اس غلط بیانی سے ڈر کر اب کوئی بھی اُس کے بازو پر اسے باندھنے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔الیاس امام ضامن کو چوم کر اس کے فضائل اپنی زبان میں بیان کرنے لگتا اور منہ دبا کر ہنسنے کے باوجود جب اکبر یا عبدالحئی کی ہنسی چھوٹ جاتی تو وہ کسی مخنث کی طرح تالی بجا کر ہاتھ فضا میں اٹھا کر پنجا کھولتا اور یورپین فلائینگ کِک کی طرح فلائنگ لعنت ہنسنے والے کی طرف اچھال دیتا اس پر بھی اگر اس کی ہنسی نہ رکتی تو میری طرف منہ کر کے کہتا "اے بھائی لے سنبھال اس گھاس لیٹ کو"

اور پھر ایک نئے عزم کے ساتھ شروع ہوتا "ابے جاہل یہ میرے صوفی نے چلتے وقت مجھے دیا اور بولا جا ہر راستہ کھل گیا،جدھر جائے گا، کامیابی ہوگی"۔

"اور تُو ایک ایسا بے وقوف شخص ہے جو منہ اٹھا کر ادھر چلا آیا ۔۔۔ابے تجھے تو سیدھا پارلیمینٹ ہاؤس جانا تھا سینیٹر، بنتا موج کرتا ابھی بھی لوٹ جا ابھی سال دو سال جمہوریت اور چلے گی" حافظ امتیاز اُسے درمیان ہی میں لقمہ دیتا اور وہ اپنے سینگ اُن کی طرف موڑ دیتا اور ایک حسرت بھرے انداز میں کہتا "حافظ صاحب آپ بھی۔۔۔؟" اور مجھے رومن ڈکٹیٹر جولیس سیزر کا تاریخی جملہ "یُو ٹو بروٹس" یاد آ جاتا اور اس کی بات جاری رہتی "آپ تو خود حافظ ہیں آپ کو تو معلوم ہے اللہ کے کلام میں کتنی طاقت ہے"

"مگر میری جان تو نے تو بازو پر ۱۹۸۲ء کا بنا ہوا روپیہ اور ۱۹۷۲ء کی ٹکسال سے نکلی چونی باندھ رکھی ہے یہ کلام کب نازل ہوا مجھے تو خبر نہیں" حافظ صاحب مسکراتے ہوئے جواب دیتے۔

"مگر یہ پڑھا ہوا ہے" وہ تلملا کر کہتا۔

"بھئی تُو مجھے دُنیا کے کسی ملک کا کوئی ایک نوٹ ایسا دکھا جو ان پڑھ ہو،ساری دُنیا میں کرنسی ہی تو واحد شے ہے جو سب کی زبان سمجھتی ہے اور جسکی زبان سب سمجھتے ہیں اور جو سب سے زیادہ پڑھی لکھی ہے" وہ اُسے زچ کرنے کے لیے مسکرا کر توجیح پیش کرتے۔

"مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ ۱۹۸۲ء کا بنا ہوا روپیہ اور ۱۹۷۲ء کی چونی ہے" اُسے خیال آیا کہ حافظ صاحب تو اندر کا حال بھی جانتے ہیں تو فوراً پوچھا۔

"شکر کر یہ رینگٹ نہیں تھا ورنہ تو تو گیا تھا،اُس دن اکبر ہر کونے کھدرے سے شیلنگ اکٹھی کر رہا تھا اُس کی نظر تیرے اس تعویز پر پڑ گئی بس پھر کیا تھا یوں جھپٹا جیسے چیل چوزے پر اور لمحہ بھر میں اسے ادھیڑ کر رکھ دیا اُس نے سوچا تھا کیا خبر تیرا صوفی کوئی ماڈرن شخص ہو، ڈالر رکھا ہو اس میں۔مگر اندر سے روپیہ نکلا، تیری قسمت اچھی تھی نہیں تو اُس نے سگریٹ پی کر فلو تیری اس کالی جھنڈی میں باندھ دینا تھا اور ٹونشئی ڈرائیور کی طرح اس فلٹر کے

ایک طالبہ اپنے استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیئے بیٹھی تھی اور استادِ محترم تنگنائے غزل کی گتھیاں سلجھا رہے تھے کہ یکا یک کچھ سوچ کر بولے: تمہیں معلوم ہے کہ غزل کے اصل معنی کیا ہیں؟ فرمانبردار شاگردہ کیا جواب دیتی سوالیہ نگاہوں سے استاد کی شکل تکنے لگی۔ استاد نے مسکراتے ہوئے کہا: بھئی! غزل کے لغوی معنی ہیں۔ ''عورتوں سے باتیں کرنا'' طالبہ جو ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ شوخ بھی تھی اپنی سیاہ چمکدار آنکھیں گھماتے ہوئے بولی: ''استادِ محترم'' ایک بات تو بتائیں یہ آپ مجھے پڑھا رہے ہیں یا غزل سرائی فرما رہے ہیں۔

سہارے اپنی گاڑی چلتا رہتا!''

''دیکھیں دیکھیں! آپ مُجھ سے بات کریں میرے صُوفی کو کچھ مت کہیں'' وہ نشے مین جھومتے ہوئے بولا۔

''اَبے چل یار تیرا صُوفی اتنا اچھا تھا تو اُس نے تُجھے شراب پینے سے منع نہ کیا ہوتا؟''

"غلط، غلط۔۔۔ الیاس نے کھڑے ہو کر دائیں ہاتھ کی انگلی فضا میں نہ نہ کے انداز میں لہرا کے بولا۔۔۔ اُس نے کیا۔۔۔ وہ کہتا تھا، دیکھ الیاس شراب مَتی پیا کر اس کو قرآن میں نشہ قرار دیا گیا ہے ہاں چرس بھلے ہی پی لیا کر اس سے منع نہیں فرمایا گیا ،فقیری نشہ ہے اور پکڑ بھی زیادہ کرتا ہے"

حافظ صاحب اُس کا یہ بیان سُن کر چپ سادھ گئے اور پھر یکدم بولے ''دسوہُن کون منج اگے بین وجاوے؟''

اس بیان سے ہمارے علم میں بھی اضافہ ہو جاتا کہ کیوں زیارتوں پر چرسی بے تحاشا پائے جاتے ہیں اور کھلے عام چرس چل رہی ہوتی ہے اب پتہ چلا کہ وہ اپنی پکڑ پکی کر رہے ہوتے ہیں اسی طرح الیاس کا صوفی بھی کوئی ایسا صوفی ہو گا جس کے لیے پنجابی والے کہتے ہیں کہ ''نوی فقیری تے دوپہری ٹونا'' وہ بھی کوئی چرسی ہو گا اُس نے سوچا شراب تو پیتا ہی ہے اس کو بھی چرس پر لگا لو یہ لاتا رہے گا اور دونوں مل کر پیتے رہیں گے۔

''اَبے تیرا صوفی تو جہاد کے بھی خلاف ہے'' اکبر نے الیاس کو مخاطب کر کے کہا اور اُس کی طبعیت پھر مچل پڑتی ''نہیں ،بالکل نہیں غلط بالکل غلط میرا صوفی جہاد پر تو سب سے زیادہ زور دیتا تھا وہ کہتا تھا کہ سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ خود پر قابو ڈالا جائے!''

''بذریعہ چرس''۔۔۔ کسی نے فقرہ کسا اور وہ پھر اڑ گیا ''غلط غلط، غلط۔۔۔۔۔ آپ میرے ساتھ بات کیجئے بھائی جان! مگر میرے صوفی کے بارے میں ایسی غلط بات مت کیجئے۔''

اُس کی مادری زبان گجراتی ہونے کے کارن اُس کا لہجہ بھی ذرا منفرد تھا اور اُسے عجیب و غریب گالیوں پر دسترس تھی مثلاً اگر کسی دوست پر پیار آتا تو اُسے کہتا ''چل ہٹ ہرامی'' کسی پہ غصہ ہوتا تو کہتا ''ابے او کتے کے پیشاب'' یا پھر ''ابے او بلی کے حضم'' یعنی ایک ہی گالی کی لپیٹ میں، بیوی، بچے سب باندھ دیتا، اور کچھ گالیاں ایسی کہ جو نا قابلِ تحریر ہیں کہ اُن کے سننے کے لیئے میں دعا گو ہوں کہ اللہ کرے آپکی الیاس چراندی کے ساتھ دوستی ہو جائے پھر آپ خود دیکھیں گے کہ گالی اُن کے مُنہ سے نکلتے ہی کیسے سامنے والے کی سٹی گم ہو جاتی ہے۔

لین دین

مامون عباسی کے زمانے میں ناپ تول میں کمی کرنے والے کسی تاجر کو پچاس کوڑوں کی سزا سنائی گئی۔

اس نے جلاد کو ایک ہزار درہم رشوت دے کر کہا کہ وہ کوڑے اس کے بدن پر مارنے کی بجائے زمین پر مارے۔

جلاد نے ۴۹ کوڑے زمین پر مارے کے بعد آخری کوڑا پوری قوت سے تاجر پر دے مارا۔

اُس کو شدید تکلیف ہوئی تو اس نے جلاد سے کہا ''میں نے تجھے اس لیے رشوت دی تھی کہ مجھے کوڑے نہ لگائے تا کہ مجھے کوئی گزند نہ پہنچے۔ آخر تو نے مجھے ایک کوڑا کیوں مارا؟''

جلاد نے کہا ''میں تمہیں احساس دلانا چاہتا تھا کہ اس لین دین میں تم کتنے فائدے میں رہے ہو!''

تصویر چوری ہوگئی

حماد احمد، لاہور

چھوٹے قد والے دل چھوٹا نہ کریں

یار حماد۔۔۔! ایک بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ کیا چھوٹے قد والوں کا ذہن چھوٹا ہوتا ہے یا ان کی صلاحیتیں محدود ہوتی ہیں؟۔ کیا پستہ قد لوگوں کا عزم، ولولہ اور حوصلہ چھوٹا ہوتا ہے یا ان کی قسمت ہی کھوٹی ہوتی ہے؟۔ آخر کیا وجہ ہے کہ بہت سے سرکاری محکموں میں محض چند انچ کم قد ہونے کی وجہ سے لوگوں کو نوکری سے محروم کر دیا جاتا ہے؟۔''

منیب کا یہ سوال بالکل بجا تھا۔ اس کا قد سوا پانچ فٹ کے قریب تھا اور محض چند انچ چھوٹا قد ہونے کی بدولت وہ ایک اہم سرکاری عہدے پر تقرری کے لئے ''نااہل'' قرار دے دیا گیا تھا۔ حالانکہ تحریری امتحان سمیت دیگر تمام مراحل میں وہ باقی امیدواروں سے بہت آگے اور بہت بہتر تھا۔ منیب کے لئے یہ پریشانی کے لمحات تھے لہذا اس کی حوصلہ افزائی کرنا بہت ضروری تھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں جامع بات کرتے ہوئے کہا کہ ''منیب بھائی ہمت نہ ہاریں۔ اللہ کے ہر فیصلے میں کوئی نہ کوئی بہتری اور حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ ان شاء اللہ العزیز اللہ پاک اپنی رحمتوں کی بدولت آپ کو زندگی میں بہت سی ترقیاں اور کامیابیاں عطا فرمائیں گے۔''

منیب بولا ''یار۔۔۔! اگر محض یہی ایک پریشانی ہوتی تو جیسے تیسے برداشت کر ہی لیتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ چھوٹے قد والوں کو زندگی کے ہر میدان میں ہی لاتعداد اور عجیب و غریب انداز کی پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں۔

میں نے استفسار کیا: ''مثال کے طور پر کیسی پریشانیاں؟۔ میرے علم میں بھی تو اضافہ کرو!''

منیب نے جواب میں پریشانیوں کی ایک لمبی لسٹ ''تقریری صورت'' میں بیان کر دی۔۔۔ ''دیکھو یار! اگر چھوٹے قد والے لوگ کرسی پر بیٹھیں تو پاؤں زمین تک نہیں پہنچتے بلکہ ہوا میں ہی معلق ہو جاتے ہیں۔۔۔۔ کرسی پر چڑھنے کے لئے بھی چھلانگ لگانا پڑتی ہے۔۔۔۔ سٹور یا کچن میں اوپر والے کیبنٹ / شیلف سے سامان اتارتے وقت نیچے والی شیلف کو (یا پھر کسی میز کو) کھڑے ہونے کے لئے بطور فرش استعمال کرنا پڑ جاتا ہے۔۔۔۔ اگر کوئی میز اور سٹول دستیاب نہ ہو تو پنجوں کے بل کھڑے ہو کر چھلانگیں لگانا پڑتی ہیں تاکہ اوپر والی چیز تک رسائی ممکن ہو سکے۔۔۔۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے متعدد بار سامان رکھنے والی ''موونگ ٹرالی'' کے اندر بھی کھڑا ہونا پڑ جاتا ہے اور ساتھ ہی کسی اجنبی شخص سے بھی درخواست کرنی پڑ جاتی ہے کہ برائے مہربانی اس ٹرالی کو دھکا لگا کر گھسیٹیے اور آگے کی طرف لیتے چلے جایئے تاکہ میں ساتھ ساتھ اوپر والی شیلف سے اپنی تمام پسندیدہ چیزیں اٹھاتا چلا جاؤں۔۔۔ کئی مرتبہ دکاندار اور کسٹمر سروس والے غور نہیں کر پاتے کہ پستہ قد شخص دکان کے اندر تشریف فرما ہو چکا ہے۔ پھر سیکورٹی کیمرہ کے لائیو مناظر دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ سٹور کے اندر فلاں جگہ پر ایک عدد ''ننھا منھا سا تحفہ'' یعنی گاہک خریداری میں مصروف ہے۔۔۔ کئی دکانداروں

نے تو لاپرواہی کی انتہا کرتے ہوئے لمبے قد والوں کے کپڑے سب سے نیچے والے شیلف میں اور چھوٹے قد والوں کے کپڑے سب سے اوپر والی شیلف میں رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسے میں طویل القامت لوگ تو جیسے تیسے نیچے جھک کر اپنے پسندیدہ کپڑے حاصل کر ہی لیتے ہیں لیکن چھوٹے قد والوں کو اوپر والی شیلف سے کپڑے اٹھانے کی کوششوں میں دانتوں پسینے آجاتے ہیں۔۔۔ چھوٹے قد والے لوگ اگر سوئمنگ کے لئے کسی چار فٹ گہرے پول میں بھی چلے جائیں تو انہیں وہاں اپنے آپ کو ڈوبنے سے بچانے کے لئے سخت محنت کرنا پڑتی ہے، جب کہ اسی پول میں دیگر لوگ بے فکری سے پول کے فرش پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔۔۔ پستہ قد لوگوں کو ہر محفل یا گروپ میں سب سے اگلی قطار میں کھڑا ہونا پڑتا ہے تاکہ منظرِ عام سے غائب ہی نہ ہو جائیں۔۔ اگر چھوٹے قد والے لوگ دورانِ محفل غلطی سے کسی اوسط یا لمبے قد والے فرد کے پیچھے بیٹھ جائیں تو ان کے لاپتہ ہونے کا سنگین ترین خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ موصوف محفل میں موجود بھی ہیں یا نہیں۔۔۔ اگر چھوٹے قد کے لوگ اپنے دوستوں اور عزیز واقارب کے ساتھ پیدل چل رہے ہوں تو انہیں اپنے دوستوں کا ساتھ دینے کیلئے اور قدم سے قدم ملانے کے لئے باقاعدہ بھاگنا پڑتا ہے۔ جو مسافت باقی لوگ اپنے ایک قدم سے طے کر لیتے ہیں، وہی مسافت چھوٹے قد والے لوگ تین قدموں میں بھی بمشکل طے کر پاتے ہیں۔۔ پستہ قد لوگوں کو گھر میں اور گھر سے باہر متعدد جگھوں پر سٹول اپنے ساتھ لے کے پھرنا پڑتا ہے کہ مبادا کس وقت، کس مقام پر اور کن حالات میں ضرورت پڑ جائے؟۔۔۔ چھوٹے قد والے شخص کی گاڑی کو اگر کسی طویل القامت شخص نے ڈرائیو کیا ہو تو ایسے میں عام طور پر ڈرائیونگ سیٹ بھی کافی نیچے سیٹ ہو چکی ہوتی ہے۔ اگر چھوٹے قد والا شخص ڈرائیونگ سیٹ کو ری ایڈجسٹ کرنا بھول جائے تو اسے ڈرائیونگ کے دوران بار بار اپنی سیٹ سے اٹھ کر باہر دیکھنا پڑتا ہے۔ بصورت دیگر باہر کا منظر صاف دکھائی نہیں دیتا۔۔ کپڑے دھونے کے لئے واشنگ مشین استعمال کرنی ہو تو چھوٹے قد والوں کو عجیب وغریب انداز سے مشین کے اندر منہ کرنا پڑتا ہے۔ منظر نامہ کچھ یوں ہوتا ہے کہ پیٹ مبارک مشین کی دیوار کے ساتھ ٹکا ہوتا ہے جب کہ سَر اور پاؤں بالترتیب مشین کے اندر اور باہر ہوا میں ہی معلق نظر آتے ہیں۔۔۔ گھر میں اور پبلک پلیسز میں لگے ہوئے شیشے چھوٹے قد والوں کے لئے محض شو پیس ہی ثابت ہوتے ہیں۔۔۔ اگر انہیں غلطی سے شیشے میں کچھ نظر آ بھی جائے تو وہ زیادہ سے زیادہ اپنا ہیئر سٹائل ہی ہوتا ہے۔ دانت صاف کرنے کے دوران اور سن گلاسز لگانے کے دوران شیشہ دیکھنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ نہ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیا دانت چیری بلاسم کی طرح سفید اور چمکدار ہو گئے یا نہیں؟ اور نہ ہی یہ معلوم ہو پاتا ہے کہ کیا چشمہ لگا کر دو ہزار پندرہ کا پہلا سرٹیفائیڈ سپر ہیرو لگ رہا ہوں یا نہیں؟۔۔۔ چھوٹے قد والے لوگوں کو آرام کی غرض سے اپنا "بیڈ فتح کرنے کے لئے" بھی سٹول کی خدمات مستعار لینا پڑ جاتی ہیں۔۔۔ خوراک کے معاملے میں ذرا سی بھی بے احتیاطی ہو جائے اور وزن میں ایک کلوگرام اضافہ ہو جائے تو یہ فرق سب دیکھنے والوں کو باآسانی نظر آ جاتا ہے اور اگر بدقسمتی سے وزن میں اضافہ دس کلوگرام تک بڑھ جائے تو دیکھنے والے کو یوں گمان ہوتا ہے کہ جیسے موصوف نے ایک ہی نشست میں مکمل اونٹ نوش فرمالیا ہے۔۔۔ چھوٹے قد والا شخص اگر اپنے کسی طویل القامت دوست کے ساتھ پیدل چل رہا ہو تو لمبا دوست بالکل اسی طرح چھوٹے قد والے شخص کے سر اور کاندھوں پر اپنا بازو ٹکا لیتا ہے جیسے مہران کار میں سفر کے دوران دروازے کا شیشہ نیچے کر کے وہاں بازو ٹکا لیا جاتا ہے۔۔۔ کوئی لمبے قد کا عزیز یا دوست ساتھ چل رہا ہو تو چھوٹے قد والوں کو ہر وقت یہی خطرہ اور دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں اس کی انتہائی تیزی سے حرکت کرتی بازو اور کہنیاں ہمارے منہ پر آ کے نہ لگیں۔۔۔ مصافحے کے دوران پستہ قد شخص کے ہاتھ لمبے شخص کے ہاتھ کے اندر یوں سما جاتے ہیں جیسے کہ کسی بڑے سے پتیلے کے اندر ایک چھوٹی سی پلیٹ رکھ دی گئی ہو۔ اور جب مصافحے کے بعد معانقے کا معاملہ سامنے آتا ہے تو لمبے لوگ چھوٹے قد والے کو یوں اوپر اٹھا لیتے ہیں جیسے وہ ان کی

''بے بی ڈول'' ہو۔۔۔کئی چھوٹے قد کی لڑکیاں لمبا نظر آنے کے لئے ہیل والی جوتی بھی پہن لیتی ہیں لیکن ایسے میں اگر ان کی لمبے قد والی سہیلیاں بھی ہیل پہن کر آ جائیں تو ان کی یہ محنت رائگاں چلی جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر چھوٹے قد والی لڑکیاں غلطی سے ہیل پہننا بھول جائیں اور ان کی لمبے قد والی سہیلیاں بدستور ہیل پہن آئیں تو یہ ''گرتی دیوار کو ایک دھکا اور دو'' والا معاملہ ہو جاتا ہے۔۔۔ بیچارے چھوٹے قد والے لوگ تو کسی نارمل قد والے شخص کو مذاق میں بھی یہ دھمکی نہیں دے سکتے کہ میں نے تمہارے سر کے بال نوچ لینے ہیں۔۔۔۔۔ یہ لوگ اگر کسی دعوت میں چلے جائیں اور میزبان انہیں پہلے نہ جانتا ہو تو وہ ''ظاہری حلیہ'' دیکھ کر یہ تصور کر لیتا ہے کہ یہ ''بچہ'' زیادہ سے زیادہ ایک ہی روٹی کھا پائے گا۔۔۔ چھوٹے قد والے لوگ اگر اپنی فیملی کے ہمراہ کسی ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے چلے جائیں تو ویٹر مینیو میں سے بچوں کی سپیشل ڈشز بھی دکھانا شروع کر دیتا ہے اور خاندان کے بڑے افراد سے لازمی پوچھتا ہے کہ آپ کا یہ بچہ کیا چیز لے گا؟۔۔۔ چھوٹے قد والے لوگ اگر اپنے دوستوں کے ساتھ مخاطب ہوں تو انہیں ہمیشہ اپنی نظروں کو اونچا رکھنا پڑتا ہے۔ بصورت دیگر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات چیت کرنا ممکن نہیں رہتا۔ بیچارے سارا دن اپنی گردن اٹھا اٹھا کر لوگوں کو دیکھنے کے بعد رات کو گردن پر مساج کرواتے نظر آتے ہیں۔۔۔ تمام جیکٹیں اور جرسیاں چھوٹے قد والوں کے لئے ''گاؤن'' کا درجہ رکھتی ہیں کیونکہ انہیں زیب تن کر لینے سے گھٹنے با آسانی ڈھک جاتے ہیں۔۔۔۔ چھوٹے قد والوں کے لئے پکڑن پکڑائی کھیلنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے کیونکہ قانون کے لمبے ہاتھ۔۔۔ اوہ سوری۔۔۔ طویل القامت دوستوں کے لمبے ہاتھ با آسانی ان کی گردنوں تک پہنچ جاتے ہیں۔۔۔ بیچارے چھوٹے قد والے اگر کسی بھیڑ اور رش میں اپنوں سے بچھڑ جائیں اور موبائل کے ذریعے بھی رابطہ کرنا ممکن نہ ہو تو چھوٹا قد ہونے کی وجہ سے تلاش کا یہ مرحلہ انتہائی دشوار گزار ہو جاتا ہے''۔

منیب کی تقریر اختتام پذیر ہوئی تو میں نے اسے پانی سے

آدھا بھرا ہوا گلاس تھما دیا اور ''حفظ ماتقدم'' کے طور پر خود بھی دو گلاس اپنے معدے میں انڈیل لئے۔ دراصل مجھے اس تقریر کا خاطر خواہ جواب دینا تھا۔

میں نے کہا کہ ''منیب بھائی آپ کے ہاتھ میں جو گلاس پکڑا ہوا ہے، اسے دیکھ کر بہت سے منفی سوچ والے لوگ یہ کہیں گے کہ یہ آدھا گلاس خالی ہے۔ جب کہ اس کے برعکس مثبت سوچ والے لوگ اسے آدھا بھرا ہوا گلاس تصور کریں گے۔ اگر ہم چیزوں کو منفی انداز سے دیکھنے کی کوشش کریں تو ہمیشہ مایوسی ہی پھیلے گی۔ اگر مثبت انداز سے اپنے ذہن اور سوچ کو استعمال کیا جائے تو خیر اور بہتری کے آثار فوری طور پر واضح نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

منیب بولا ''آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ کیا چھوٹا قد ہونے کے فوائد بھی ہو سکتے ہیں؟''

مشہور مزاح گو شاعر احمق پھپھوندوی ایک مشاعرے میں بلائے گئے جس میں بہت سے شاعران کے ناپسندیدہ تھے۔ انہوں نے اپنے تخلص کا سہارا لے کران پر یہ چوٹ کی۔

ادب نوازیٔ اہلِ ادب کا کیا کہنا
مشاعروں میں اب احمق بلائے جاتے ہیں

میں نے کہا کہ: ''یہ بتاؤ، کیوں نہیں ہو سکتے؟''
ساتھ ہی میں نے منیب کو چھوٹے قد کے فوائد پر لیکچر دینا شروع کر دیا۔

''منیب بھائی۔۔۔! آپ نے لڑکیوں کی ہیل والی جوتی کی بات کی تھی۔ لمبے قد کی لڑکیاں ہیل والی جوتی پہنیں تو یہ عام طور پر انہیں جچتا نہیں جب کہ چھوٹے قد کی لڑکیاں اونچی ہیل پہن کر بھی اپنے آپ کو انتہائی کمفرٹیبل محسوس کرتی ہیں۔۔۔ آپ نے کہا تھا کہ چھوٹے قد والے لوگ پکڑن پکڑائی نہیں کھیل سکتے تو یہ پھر یہ بھی تو سوچیے کہ ایسے لوگ جس قدر عمدگی سے چھپن چھپائی کھیل سکتے ہیں کہ لمبے قد والے ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جس چھوٹی اور معمولی سی جگہ میں بھی ان کا چھپنے کا دل کرے، با آسانی چھپ سکتے ہیں۔۔۔ دنیا بھر کے محققین اس بات پر متفق ہیں کہ پستہ قد لوگوں کی اوسط عمر لمبے قد والوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ (اگر چہ اوسط عمر کا ہر انسان کی انفرادی عمر سے کوئی بھی تعلق نہیں مگر اوسط عمر بہر حال ایک اہم فیکٹر ہے)۔۔۔ اکثر لوگوں کو اپنی عمر چھپانے یا کم ظاہر کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ چھوٹے قد والے لوگ بغیر کسی محنت و تردد کے اپنی عمر سے چھوٹے ہی دکھائی دیتے ہیں۔۔۔ چھوٹے قد والے لوگ اگر بسوں، ویگنوں، ٹرینوں اور جہازوں وغیرہ میں سفر کریں تو یہ اپنی ٹانگیں جتنا بھی آگے تک پھیلانا چاہیں، پھیلا سکتے ہیں۔ بسوں کی پچھلی سیٹوں کے درمیان پیر پھیلانے کی گنجائش عام طور پر اگلی سیٹوں کی نسبت انتہائی کم ہوتی ہے اور اس وجہ سے زیادہ تر لوگ اگلی سیٹوں پر بیٹھنا پسند کرتے ہیں۔ ایسے میں اگر چھوٹے قد والے لوگ رضا کارانہ طور پر پچھلی سیٹوں پر بیٹھ جائیں تو باقی لوگ ان کی تعریفیں کرتے اور دعائیں دیتے نہیں تھکتے۔۔۔ چھوٹے قد والوں کیلئے بس کی پچھلی سیٹیں بھی فرسٹ کلاس یا وی آئی پی سیٹوں ہی کی طرح ہوتی ہیں۔۔۔۔ پبلک ویگن میں سفر کے دوران اگر سیٹ دستیاب نہ ہو تو چھوٹے قد والے لوگ مرغا بنے اور رکوع کئے بغیر با آسانی اس میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔۔۔ بچے عام طور پر چھوٹے قد والوں سے بہت پیار کرتے ہیں۔ دراصل وہ یہ جانتے ہیں کہ پستہ قد لوگ بھی ان ہی کی طرح بچے ہیں۔۔۔ جن دکانوں میں بچوں کی خریداری کے لئے سپیشل ڈسکاؤنٹس ہوں وہاں چھوٹے قد والوں کو ''بحیثیت بچہ'' شاپنگ کرتے ہوئے بہت سی رعایت مل سکتی ہے۔۔۔ چھوٹے قد کے لوگ مناسب سائز کے کمبل میں بھی با آسانی مکمل طور پر سما سکتے ہیں۔ لمبے لوگوں کی طرح انہیں یہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ اگر سر کمبل کے اندر کر لیا تو پاؤں باہر نکل آئیں گے، پاؤں کمبل کے اندر کر لئے تو سر باہر نکل آئے گا اور اگر دونوں (سر اور پیر) ایک ساتھ کمبل کے اندر کر لئے تو بالکل سیدھا ہو کر نہیں لیٹ پائیں گے۔۔۔ جن کمروں کے دروازے اور چھتیں کافی نیچے ہوں وہاں چھوٹے قد والوں کو یہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ ان کا سر دروازے/چھت سے ٹکرا سکتا ہے۔۔۔ ایک مناسب سائز کے عام سے بیڈ پر چھوٹے قد کے لوگ با آسانی آرام کر سکتے ہیں۔ نہ ہی انہیں نیچے گرنے کا ڈر ہوتا ہے اور نہ ہی لمبے لوگوں کی طرح یہ پریشانی ہوتی ہے کہ سوتے ہوئے اپنے پاؤں بیڈ سے نیچے لٹکانے پڑیں گے۔ ڈیپارٹمنٹل سٹورز پر لوگ چھوٹے قد والوں کی مدد کرنا بھی پسند کرتے ہیں کہ چونکہ ان کا قد چھوٹا ہے لہٰذا اہم خود انہیں اوپر والی شیلف سے چیزیں اتار دیتے ہیں۔۔۔ اگر طبیعت چاہے تو چھوٹے قد والے لوگ حسب چاہت و حسب ضرورت با آسانی کسی صوفہ یا بینچ وغیرہ پر لیٹ کے بھی آرام کر سکتے ہیں۔۔۔ چھوٹے قد والے لوگ اگر سکول کے زمانے میں کوئی چیز ہمیشہ شوق سے زیب تن کرتے رہتے ہوں تو قد بڑا نہ ہونے کی وجہ سے اسی پسندیدہ چیز کو ساری زندگی بھی زیب تن کر سکتے ہیں۔۔۔ اگر چھوٹے قد کے لوگ چھتری پکڑے کسی کے ساتھ جا رہے ہوں تو

دوسرا شخص نسبتاً لمبا ہونے کی وجہ سے رضا کارانہ طور پر خود ہی چھتری تھام لیتا ہے۔ یوں پستہ قد لوگوں کو چھتری اٹھانے کی زحمت نہیں کرنا پڑتی۔۔۔ کوئی لمبے قد والا شخص غلطی سے بھی چھوٹے قد والے کے ناک کو غور سے نہیں دیکھ سکتا اور اس بات پر ''عزت افزائی'' نہیں کر سکتا کہ آپ کے ناک کے اردگرد ''چوبا'' (ناک سے نکلا ہوا کرائے دار) لگا ہوا ہے۔۔۔ چھوٹے قد کے لوگوں نے اگر اپنے کپڑے سلائی کروانے ہوں تو انہیں تھوڑا سا ہی کپڑا خریدنا پڑتا ہے اور سلائیاں بھی اسی مناسبت سے مختصر ہی لگانا پڑتی ہیں۔ یوں وقت اور پیسے کی بیک وقت بچت ہو جاتی ہے۔۔۔ چھوٹے قد والے لوگ اگر چاہیں تو چھوٹے سے چھوٹے سائز کے کپڑے بھی پہن سکتے ہیں۔ کوئی بھی کپڑا ان کی جسامت کے حوالے سے چھوٹا نہیں لگتا۔۔۔ انسان کی جسامت جتنی بڑی ہو، اتنی ہی اسے طاقت کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ جتنی طاقت درکار ہو، اتنی ہی خوراک کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چھوٹی جسامت ہونے کی وجہ سے پستہ قد لوگوں کا مجموعی طور پر خوراک کا انتہائی کم خرچہ ہوتا ہے۔۔۔۔۔ والدین عموماً اپنے بچوں/بچیوں کے رشتے کے لئے لمبے قد والے بچے/بچیوں کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ چھوٹے قد کے بچوں کے لئے یہ ریکوائرمنٹ بھی با آسانی پوری ہو سکتی ہے کیونکہ ''مناسب قد و قامت'' کے بچے/بچیاں بھی ان کے چھوٹے قد کے بچے/بچیوں کی نسبت ''طویل القامت'' ہی معلوم ہوں گے۔۔۔ چھوٹے قد والے لوگ حسب ضرورت اپنے ہاتھوں اور پیروں پر بچوں کی جرابیں اور دستانے تک زیب تن کر سکتے ہیں۔ چھوٹے قد والے لوگ گھر کے اندر بھی انتہائی وی آئی پی ہوتے ہیں۔ انہیں اونچائی پر موجود کسی جگہ پر کوئی بھی چیز چڑھانی یا اتارنی نہیں پڑتی۔ اور تو اور بلب ہولڈرز میں بلب یا انرجی سیور بھی تبدیل کرنا ہو تو انہیں زحمت نہیں دی جاتی۔۔۔۔ یہ تو ہو گیا تمہاری باتوں کا جواب۔ اس کے علاوہ اب میں تمہیں اسلامی حوالے سے چھوٹے قد کی اہمیت سے آگاہ کرتا ہوں''

میں نے دو گھونٹ پانی پیا اور پھر اپنی بات جاری رکھی

''منیب بھائی! روایات میں ایک واقعہ لکھا ہوا ہے جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت علی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ایک ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ درمیان میں تھے اور دائیں بائیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ ان دونوں صحابہ کرام کے قد اونچے تھے جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قد نسبتاً چھوٹا تھا۔ دونوں اصحاب میں سے ایک (غالباً حضرت عمر رضی اللہ عنہ) یہ حالت دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا کہ: ''علی تم ہمارے درمیان ایسے ہو جیسے ''لنا'' میں ''ن'' ہوتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مسکرا کر برجستہ جواب دیا کہ: ''اگر میں ہٹ جاؤں تو ''لا'' رہ جائے گا۔ (یاد رہے کہ ''لا'' کا مطلب عربی میں ''نہیں'' یا ''کچھ نہیں'' ہوتا ہے)۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے علاوہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا قد بھی نسبتاً چھوٹا تھا اور تو اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قد بھی نسبتاً پست تھا مگر ان کی جملہ صفاتِ حسنہ ساری دنیا کے سامنے عیاں ہیں۔ مسند احمد کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ: ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کمزور پنڈلیاں اللہ کے نزدیک احد پہاڑ سے بھی زیادہ وزنی ہیں صحیح بخاری شریف کے ایک مشہور و معروف راوی کا نام ''حمید الطویل'' ہے۔ اگرچہ طویل سے مراد لمبے قد والا ہوتا ہے لیکن بذات خود ''حمید الطویل'' اپنے نام کے برعکس چھوٹے قد کے تھے۔ چونکہ ''حمید الطویل'' کا ایک ہمسایہ ان سے بھی پستہ قد تھا، لہٰذا انہیں اس ہمسائے سے نسبت کی وجہ سے ''طویل'' کہا جاتا تھا۔۔ الغرض یہ کہ منیب بھائی! چھوٹے قد والوں کو اپنا دل کبھی بھی چھوٹا نہیں کرنا چاہئے۔ قد و قامت کا چھوٹا یا بڑا ہونا اللہ کی دین ہے۔ ہر حال میں اس کی رضا میں راضی رہنا چاہئے۔ اس کے ہر فیصلے میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔۔ اور اپنی باطن کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کرنا چاہئے۔ دماغی صلاحیتوں کو مثبت اور اچھی طرح استعمال کرنے کی جستجو کرتے رہنا چاہئے۔ ان شاء اللہ آپ اور آپ جیسے دیگر پستہ قد لوگ اگر یہ سوچ اپنا لیں تو دنیا کے کسی بھی میدان میں کبھی بھی ناکام نہیں ہو پائیں گے۔''

ہمیں روٹی نہیں ملتی اُنہیں حلوہ میسر ہے
یہ اپنی بد نصیبی ہے، وہ غیروں کا مقدر ہے
(احمق)

نعیم طارق

مُنّے کے ابّا

شادی سے پہلے بھلے آپ کا نام ''پرنس زریاب شیخ'' ہی کیوں نہ ہو،شادی کے بعد زوجہ محترمہ آپ کا نام بدل کر ''مُنے کے ابا'' رکھ دے گی۔یہ اس کی ''پاور آف اٹارنی'' کا پہلا استعمال ہے۔شوہر بے چارہ زمانہ قدیم سے اپنے لئے ''مسکین حجازی''، ''صوفی تبسم'' اور ''مولوی عبدالحق'' جیسے خاکساری اور عاجزی سے لبریز نام تجویز کرتا چلا آیا ہے لیکن اپنی زوجہ محترمہ کے ہاتھوں ہمیشہ "مُنے کے ابا" کے نام سے لکھا اور پکارا جاتا رہا۔بارہا ایسا ہوا کہ آپ بن ٹھن کر کسی دور پار کے عزیز کی شادی کی تقریب میرج ہال میں حسینوں کی محفل جمائے بیٹھے ہیں۔آپ کے برجستہ جملوں اور چٹکلوں نے ''کشت زعفران'' کی سی فضا پیدا کر رکھی ہے۔مترنم قہقہے آپ کی بتیسی کو اور نمایاں تر کرتے چلے جا رہے ہیں۔کوئی ''حسنِ دلربا'' بس پوچھنے ہی والی ہوتی ہے کہ ''کیا آپ کی شادی ہوئی ہے؟'' کہ اچانک چند گز کے فاصلے سے ایک ''توبہ شکن'' نسوانی آواز گونجتی ہے کہ'' اجی! مُنے کے ابا، ذرا بات تو سنئے'' اور آپ ''مٹھی بھینچتے ،دانت پیستے'' چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجائے ''بھاری قدموں'' کے ساتھ دل ہی دل میں داغ دہلوی کا یہ مصرعہ دہراتے کہ

سنانے کے قابل جو تھی بات اُن کو
وہی رہ گئی درمیاں آتے آتے

محفل سے برخاست ہو جاتے ہیں۔اور آپ کے پیچھے ہی قبل از وقت خطرے سے آگاہی پر گہری سانسوں اور لاحول ولا قوۃ کا ایک دبا سا شور ماحول کو سوگوار بناتا چلا جاتا ہے۔دوسری طرف دیگر شرکائے محفل ''مُنے کے ابا'' کے نام سے پکارے جانے پر ''رشین سلاد'' کی منولیس میں چھپے نادیدہ آئٹم کی طرح ''مُنے'' کی عمر اور نمبر کا اندازہ آپ کی توند کے سائز اور کنپٹی کے بالوں سے کرتے جاتے ہیں۔ایسے میں اپنی ہی بلی کے ہاتھوں کھسیانا ہو کر یا تو آپ نوچنے کے لئے کسی کھمبے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں یا پھر حفظِ ماتقدم کے طور پر اگلی مرتبہ مرکزی جلسہ گاہ کو چھوڑ کر دور کونے میں چھوٹے سائز کی زنانہ ٹکڑیوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

انجمن حقوق آزادی نسواں کی پالیسی کے مطابق ''مُنے کے ابا'' کہنے میں جہاں خواتین کو اپنے شوہر کے متعلق ''جملہ حقوق بحق سرکار محفوظ ہیں'' کا احساس سرشار رکھتا ہے وہاں اُنہیں ''موقع بے موقع'' امی کے گھر جانے میں ''مُنے کے ابا'' کی سرکاری گاڑی کے استعمال میں بھی سہولت رہتی ہے اور یوں ٹرانسپورٹ کی مد میں ہونے والی بچت سے ''بیوٹی پارلرز'' اور ''بوطیق سنٹرز'' کے اخراجات پورے کرتی ہے۔۔۔۔ بقول سید ضمیر جعفری مرحوم کے:

ہم کو صاحب کی خوش کلامی نے متاثر کیا تو عرض کی "جناب آپ کو معلوم ہے کہ میرؔ نے کیا کہا ہے؟"

"کون سا میر؟ کرنل ارشد میر؟"

"نہیں صاحب، میر تقی میرؔ!"

"میر تقی میرؔ؟ کبھی نام نہیں سُنا! کس پلٹن کا ہے؟ کیا رینک ہے؟؟"

"جرنیل ہے جناب، شاعروں کی پلٹن کا جرنیل، اس نے کہا ہے:

صورت آئینے میں تک دیکھ تو کیا صورت ہے
بدزبانی تجھے اس منہ پہ سزاوار نہیں

شعر فہمی آپ کی ذاتی بلکہ خاندانی کمزوری بھی نہ تھی۔ یہ شعر بھی آپ کو کسی مقام پر چھوئے بغیر کہیں بادلوں کی سمت میں نکل گیا۔ لیکن آپ نے جواب میں کچھ کہنا تو تھا، ارشاد فرمایا "جرنل میرا اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے!"

ہمارے پاس تائید کے بغیر چارہ نہ تھا، عرض کیا "سگرٹ تک نہ پیتا تھا!!"

اور خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا

از کرنل محمد خان (بسلامت روی)

جانِ محفل تھا خدا بخشے ضمیر
اب تو اِک مدت سے شوہر ہو گیا

گرائمر کی رو سے "منے کے ابا" نہ تو "روزمرہ" ہے نہ ہی محاورہ۔ یہ خالصتاً "ہندوستانی ایجاد" ہے۔ یہ اصطلاح یا تو "دبستان لکھنو" کی کسی "مہرالنسا" نے اپنے بگڑے ہوئے "نواب نما شوہر" کو "امراؤ جان ادا" کے کوٹھے پر جانے سے روکنے کے لیے اضطراری طور پر گھڑی ہے کہ چلو اس بہانے نواب صاحب میرا نہ سہی اپنے "منے" کا ہی کچھ خیال کر لیں گے۔ یا پھر یہ "دبستان دہلی" کی کسی دخترِ نیک اختر "جمیلہ پروین" نامی خاتون خانہ کا ادبی کارنامہ ہے، جو "گوری گھونگھٹ میں شرمائے" کے مصداق، درجن بھر بچوں کی گھر میں موجودگی کے باوجود ازراہِ شرم و حجاب اپنے شوہر نامدار کو ان کے اصل نام کی بجائے رسمی طور پر "منے کے ابا" کہنے پر مجبور ہوگی۔ وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو بہرحال یہ تو ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ "آتشک اور سوزاک" کی طرح یہ روگ بھی انگریز اپنے ساتھ برصغیر لایا تھا۔

ہم نہ تو مغرب زدہ ہیں اور نہ ہی کسی "اپوا" نامی تنظیم کے رکن ہیں لیکن اس بات کے حیرانگی کی حد تک ضرور قائل ہیں کہ "الیگزینڈر فلیمنگ"، "جیمز واٹسن" اور "سر ونسٹن چرچل" جیسے سخت گیر اور "ہراسمنٹ" سے بھرپور ناموں کے باوجود آج تک کسی یورپی یا امریکی خاتون نے اپنے شوہر کو "منے کے ابا" نہیں کہا۔ یہ سن کر میرے دوست "رن مرید" فوراً بھڑک اٹھے، فرمانے لگے آپ انگریز میموں کے اتنے طرف دار نہ بنیے، اول تو انگریز "منا" نامی کسی مخلوق کو گھر پر پالنے کے روادار ہی نہیں۔ ان کے ہاں زیادہ سے زیادہ "جمی" یا "ٹومی" وغیرہ ہی ہوتے ہیں۔ دوسرا جن اوقات میں ان کے شوہر گھر پر ہوتے ہیں، خاتون خانہ گھر تشریف لانا ہی پسند نہیں کرتیں، ایسے میں ان انگریز شوہروں کو کوئی خاک "منے کے ابا" کہہ کر پکارے گا۔ یہ تو ہم مشرقی گھریلو قسم کے شوہروں کا خاصہ ہے کہ جب تک خود "منا" بالغ ہو کر ہمیں گھر سے باہر نہ نکال دے، ہم زوجہ محترمہ کے ساتھ ایک ہی رکابی میں کھانا کھاتے ہی۔ ایسے میں ازراہ محبت دن میں دو چار بار "منے کے ابا" کہلوانے میں حرج ہی کیا ہے، ویسے بھی اس سے شوہر کی گھر کے کاموں پر توجہ مرکوز رہتی ہے۔

ہر طرف سے مایوس ہو کر ہم اپنا مسئلہ لے کر استاد "حلیم شیروانی" کے پاس گئے۔ سنتے ہی فرمانے لگے "ارے برخوردار، جہاں وزیراعظم اور وزیر خزانہ اپنے ناموں کے ساتھ "میاں" اور "سرتاج" کا سابقہ لگانے کے باوجود "منے کے ابا" کہلوانے سے نہ بچ سکے تمہاری کیا حیثیت ہے"۔ مستنصر حسین تارڑ صاحب بھی اپنے کنجلگ نام کی بناء پر ٹریفک سارجنٹ سے چالان ہونے سے تو بچ گئے تھے، "منے کے ابا" کہلوانے سے نہیں۔ تمہیں وہم ہو گیا ہے بچے، جس کا کوئی علاج نہیں۔۔۔۔۔۔ حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں۔

کے ایم خالد

پیر دھمال سائیں

یہ ۸۳ء کا گرم جون تھا۔ جب بونگا بغلول یہ خبر لایا کہ آج رات مامے بوٹے کے ڈیرے پر ''محفل'' ہو گی جس میں ان کے پیر دھمال سائیں تشریف لائیں گے، محفل سماع اور ساتھ میں خصوصی دھمال بھی ہو گی۔

''جو بات بتانے والی ہے وہ نہیں بتا رہا'' میں نے بے چینی سے گرمی سے بچنے کے لئے دیسی نسخہ بڑا گیلا رومال پانی میں بھگو کر دوبارہ سر پر لپیٹتے ہوئے کہا۔

''ہاں لنگر میں مرغ، نان اور آخر میں ٹھنڈی پیپسی کولا بھی دی جائے گی''۔

مرغ، نان کے بعد پیپسی کی عیاشی ابھی سے چس دے رہی تھی سو دوپہر سے ہی بھوکا رہ کر میں اور بغلول نے رات کے لنگر کی تیاری شروع کر دی۔

ماما بوٹا میرا کوئی ماما نہیں تھا بلکہ وہ پورے علاقے میں مامے کے نام سے مشہور تھا اور وہ اس نام کا برا بھی نہیں مناتا تھا اس کا مرغیوں کا کام تھا اور سال میں تین چار مرتبہ وہ اپنے ڈیرے پر ''محفل'' ضرور کرواتا تھا۔ جس میں اس کے پیر صاحب اپنے درشن کرواتے تھے جس میں سارے علاقے کو دعوت نہ ہونے کے باوجود دعوت ہوتی تھی۔ دن کی گرمی میں ہی پیپسی کولا کی ٹھنڈ دل کو عجیب سے طراوت دے رہی تھی۔

رات کو میں اور بونگا بغلول رش کی وجہ سے وقت سے کافی دیر پہلے ہی مامے کے ڈیرے پہنچ چکے تھے لیکن وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ ہم شائد آخر میں پہنچے ہیں پیر صاحب کی ''محبت اور عقیدت'' میں بہت سے لوگ دریوں پر جگہ نہ ہونے کے باوجود کچی مٹی پر براجمان تھے۔ ابھی اسپیکر پر ریکارڈڈ قوالیوں سے ماحول کو گرمایا جا رہا تھا

''اوئے بونگے! لنگر پہلے کھلے گا یا آخر میں''۔ میری کان میں کی جانے والی سرگوشی کا بونگے بغلول نے اپنا گلا پھاڑ کر جواب دیا جس سے کئی قریبی لوگوں کو پتہ چلا کہ پچھلی دفعہ تو لنگر پہلے ہی کھول دیا تھا اس دفعہ دیکھو ماما بوٹا کیا کرتا ہے۔

سازندوں نے اپنے آلات موسیقی سیٹ کرنے شروع کئے آخر کار اسپیکر سے علاقے کے مشہور کوڈو قوال کی آواز ابھری پہلے تو انہوں نے مامے بوٹے اور پھر دھمال سائیں کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی وجہ سے نظر کرم کی وجہ سے ہی ان کا علاقے میں نام ہے اور وہ کھلا رزق کھا رہے ہیں جبکہ میں نے اور بونگے بغلول نے کوڈو قوال کو بار ہا مرغیوں کی ٹانگوں، پوٹا کلیجی، گردن جیسی آئٹم کے لئے بھی مامے بوٹے کی گھنٹوں منتیں کرتے دیکھا تھا۔

قوالی شروع ہو چکی تھی کوڈو قوال کے ہمنوا خوب ساتھ نبھا کر شور مچا چکے تھے ماما بوٹا خود بھی ہاتھوں پر گھنگھرو باندھ چکا تھا۔

''سب لوگ دھمال کے لئے تیار ہو جائیں کیونکہ پیر دھمال سائیں تشریف لا رہے ہیں'' کوڈو قوال، قوالی کے ساتھ ساتھ

اعلان بھی کر رہا ہے۔

"اس دفعہ لنگر دھمال کے بعد کھولا جائے گا" یہ مامے بوٹے کی آواز تھی۔

"یار بونگے یہ زیادتی ہے۔"

لوگ پہلے لنگر کھا کر نکل جاتے تھے دھمال میں بہت کم لوگ شامل ہوتے تھے اس لئے مامے اس دفعہ تبدیلی کی ہے۔نتھنوں سے چرس اور سستے نشوں کی بدبو ٹکرانا شروع ہو چکی تھی مامے کے ڈیرے پر دھواں یوں اٹھ رہا تھا جیسے آگ لگ گئی ہو پیر دھمال سائیں کی آمد ہو چکی تھی کیونکہ کوڈو قوال اور دھمالیوں کے دھمال میں تیزی آ چکی تھی پیر دھمال سائیں کو چند لوگ نے سہارا یوں دے رکھا جیسے اٹھا رکھا ہو وہ اپنی مسند پر تشریف فرما ہو گئے ان کے لمبے لمبے بال یوں آپس میں جڑے ہوئے تھے جیسے بونگے بغلول کی والدہ سے اکثر عید کے موقع پر سویاں جڑ جاتی تھیں انہوں نے آتے ہی کوڈو کے کان میں جو کہا، کوڈو نے وہی اسی طرح اسپیکر میں دہرا دیا "پیر صاحب کہندے نیں جیہڑا دھمال نہ پاوے او۔۔۔"

"اوئے یہ تو گالیاں دے رہا ہے"۔"یہ ان کو دے رہا ہے جو دھمال نہیں ڈال رہے ہم تو ڈال رہے ہیں" میں نے دھمال کا ایک ہلکا سا سٹپ دیتے ہوئے کہا۔

پیر دھمال سائیں کو شائد فالج تھا کیونکہ وہ تخت پر بیٹھے بیٹھے بس ہلکا ہلکا دھمال کا مزہ لے رہے تھے۔پیر صاحب نے پھر کوڈو کے کان میں کچھ کہا کوڈو نے پھر اسپیکر میں کہا "پیر صاحب فرماندے نیں جیہڑا دھمال نہ پاوے او۔۔۔" اب کے گالی پہلی گالی سے بڑی تھی۔

بونگا بغلول غصے سے لال ہو رہا تھا میں نے اسے کے کان میں سمجھایا ہم تو دھمال ڈال رہے ہیں پیر سائیں خود نہیں ڈال رہا، یہ ساری گالیاں اسے خود لگ رہی ہے"

میری یہ بات بونگے کے بونگے سے دماغ میں آ گئی اس نے بلند آواز میں کہا "یہ ساری گالیاں پیر صاحب کو لگ رہی ہے!"

یہ شکر ہے کہ اس وقت کوڈو قوال جوش میں پیر صاحب کا تیسرا اعلان کر رہا تھا، دوسرا میں نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

پیر دھمال سائیں کے مرید دھمال سے زیادہ نشوں سے ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ایک بڑے ٹب میں پیپسی کولا کی بوتلوں میں برف ڈال کر رکھا گیا تھا۔پیر سائیں کے سامنے مرغ سالن کی ایک بھری ہوئی پلیٹ لائی گئی جس میں سے اس نے ایک لیگ پیس اٹھا کر منہ میں ڈالا اور "چگلا" ہوا پلیٹ میں ڈال دیا جسے مامے بوٹے نے دوبارہ دیگ میں ڈال دیا۔

"او یہ تو جھوٹا ہو گیا" بونگے کی آواز تھی جو دور تک سنی گئی مامے بوٹے نے بھی ایک نظر اٹھا کر بونگے کی طرف دیکھا تھا۔

ساتھ میں بیٹھے ایک بزرگ نے اسے سمجھایا یہ تو بزرگوں کا تبرک ہوتا ہے اب میں اور بونگا یہ دعا کر رہے تھے کہ جھوٹے والی دیگ سے ہمارا سالن نہ آئے۔مریدوں اور پیر صاحب کے لئے سالن بڑی ٹرے میں دیا گیا تھا جن میں لیگ پیس ہی زیادہ نظر آ رہے تھے۔ہڑبونگ اتنی مچ چکی تھی کہ ہمیں پتہ ہی نہیں چلا کہ ہماری طرف آنے والا سالن کس دیگ سے ہے۔سالن دیکھ کر بونگے کا منہ بن چکا تھا، ہماری دونوں پلیٹوں میں مرغ کی گردنیں ہمیں اٹھ اٹھ کر دیکھ رہی تھیں۔اس سے پہلے کہ میں بونگا کا ارادہ بھانپتا وہ کھڑا ہو گیا اس نے زور سے کہا "ماما جی۔! ہماری پلیٹوں میں گردنیں ہیں"۔

'مامے بوٹے کے ہاتھ کے گھنگھرو سالن ڈالتے ہوئے چھنکے اس نے بونگے کی سمت دیکھا اور کہا "بیٹا۔۔! مرغ میں دو ہی تو لیگ ہوتے ہیں کس کس کو دوں"

"لیکن ماما جی گردن تو ایک ہوتی ہے وہ ہمارے قریب بارہ چودہ پلیٹوں میں نظر آ رہی ہے"۔

"گستاخ، پکڑو اسے جانے نہ پائے" یہ پیر سائیں کی اسپیکر میں آواز تھی۔بونگے اور میں نے دو ہی چھلانگیں لگائی تھیں اور دروازے سے باہر تھے کچھ دور جا کر میں نے ہانپتے ہوئے مڑ کر دیکھا ہمارے پیچھے کوئی نہیں تھا لیکن دو چیزیں ہمارا پیچھا کر رہی تھیں مرغ کے سالن کی خوشبو اور ٹھنڈی بوتل کی چس۔۔۔

ذہین احمق آبادی'' سے ایک دن بعد عرصہ دراز ایک چائے خانے میں ملاقات ہوئی... بہت بجھا بجھا سا لگ رہا تھا... احمق کہیں کا... بلکہ احمق یہیں کا... اتنا فکر مند تھا کہ ڈھیر ساری سوڈا واٹر کی بوتلیں چڑھا گیا تھا۔۔۔ سگریٹ سے گھر والوں نے منع جو کِیا ہوا تھا۔۔۔ اور وہ ٹھہرا سدا کا تابعدار۔۔۔ مگر اس سب کے باوجود کچھ بھی بتانے میں متامّل تھا۔۔۔ ذرا کھکھوڑ کرنے پر بالآخر کھل ہی گیا۔۔۔ روتے ہوئے میری آستین سے ناک پونچھنے کی کوشش کی جو میں نے ناکام بنا دی، گھور کر دیکھنے پر ''ذہین'' نے اپنی داستانِ طلسمِ کُشا شروع کی! بولنے لگا۔۔۔!

''جب سے وادیِ بلوغت میں مابدولت نے قدم رنجہ فرمائے ہیں تب سے ڈبل بیڈ پر استراحت موقوف ہے بلکہ نوبت بہ ایں جا رسید کہ سوتے ہوئے گھوڑے گدھے بیچنے کا کاروبار بھی کافی گھاٹے میں جا رہا ہے۔ اب کیا کیجیے کہ اسکے بعد ہی سمجھ میں آیا کہ کیوں ابنِ انشا دیارِ غیر میں مسافت کے دوران شبِ فرقت میں ڈبل بستر کے خالی قطعے کو حسرت سے تکا کرتے تھے۔ اب میں کیا بتاؤں۔۔۔ تجھ سے تو چھپا ہوا نہیں ہے کہ اندر کا مکان کرائے پر چڑھا چکا ہوں مگر اس میں صنفِ نازک کیلئے تشویش کی کوئی بات نہیں کیونکہ دل کے مکان کی چار منزلیں ہیں۔۔۔ ابھی ایک دو ہی بھری ہیں۔۔۔ بکِنگ جاری ہے۔۔۔... پہلے آیئے پہلے پایئے۔ اگر کوئی زیادہ ہی اچھی کرائے دارنی ہوئی تو پچھلی والی کو نوٹس دے کر بیدخل بھی کِیا جا سکتا ہے۔ جناب اقبال بھی اسی بابت وادیِ بلوغت میں قدم دھرتے ہی غالباً فرما گئے تھے کہ

حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی
مکاں نکلا ہمارے خانۂ دل کے مکینوں میں

بلکہ میں نے تو جناب داغؔ دہلوی کے شعر سے نتیجہ نکال کر اپنا دل بھی اجاڑ کر رکھ دیا کہ

بُتانِ ماہوِش اُجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں
کہ جسکی جان جاتی ہے اسی اِک دِل میں رہتے ہیں

مگر مجال ہے جو بتِ ماہوِش نے نگاہِ ناز سے تکنے کی زحمت بھی گوارہ کی ہو۔ اب اپنی حسرت کی اس سے بڑی تشریح اور کیا ہوگی کہ انشاء جی تو ڈبل بیڈ کو حسرت سے دیکھتے تھے اور اسی پر اکتفا کر رہتے تھے مگر اب کیا کِیا جائے کہ ٹرِپل بیڈ کی کوئی رِیت رسم نہیں ادھر تو پھر پانچ بندوں کی گنجائش کہاں نکلے گی، بس پھر چار ڈبل بستروں پر ہی گزارہ کیا جا سکتا ہے اور فی الحال تو ڈبل بستروں پر نیند آتی نہیں، زمین پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے جو لامحدود ہے۔ اسے ہی دیکھ کر خوش ہوتا رہتا ہوں۔ ایک دن کرنا یہ ہوا کہ نازنینِ نیند کی بانہوں میں آتے ہی عالمِ رویا کو پرواز کر گیا، ادھر اپنا پرانا کام آوارہ گردی تھا۔ یونہی چلتے پھرتے عالمِ رویا کے سلسلۂ کوہ کے ایک دیو قامت پہاڑ پر چڑھ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ہرایرے غیرے کے خواب بادلوں کی مانند اڑتے نظر آ رہے ہیں۔ آخر کو عالمِ رویا ٹھہرا، جدھر ''ڈاکٹر شیخ الاسلام'' آ کر زانوئے تلمّذ تہ

یہ بُرائی ایک ہی دم ختم ہو ساتھ اپنے آشنا کے ڈوب مر (محمد کمال اظہر)

کرتے ہیں، وہ بھی نظر آئے۔ ایک جگہ امام ابو حنیفہ سے ڈنڈے کھا رہے تھے بیٹھے ہوئے، امام صاحب انھیں مرغا بنانے کو تھے کہ ہم نے بدمزہ ہو کر رُخ بدلا تو "محترم اوٹ پٹانگ" محوِ خواب نظر آیا بلکہ اسکے خواب کا رنگین بادل سرکتا ہوا نظر میں آیا۔ مٹھاس اسکے خواب سے چھلکی پڑ رہی تھی۔۔۔ اس خوب کی وجہ وہ مکالمہ بنا جو اسی شام اسکے گھر میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ وہ بھائیوں کے ساتھ مل کر شادی شدہ لوگوں کا بیوی سے درگت بننے پر ٹھٹھا اُڑا رہا تھا کہ اس کی ماں ان سب سے بولی "جب تمہاری بیویاں آئینگی نا تب تم سے پوچھونگی! اس بات میں "محترم" کیلئے جو سب سے خوش کُن نکتہ تھا وہ تھا 'شادیوں، یعنی جمع کا صیغہ۔۔۔ خیر، خواب میں اب نکاح پڑھایا جا رہا تھا جناب کا۔۔۔ نوبت اس کی اس طرح آئی کہ ایک دفعہ جناب گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک حسنِ ناشکیب، ناظورۂ دلفریب آ کھڑی ہوئیں۔ نشستوں کی کمی کے باعث بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی، جناب نے اپنی نشست بارگاہِ حسن میں پیش کی جو قبول کر لی گئی۔ ہمارے ہاں اچھی بات یہ ہے کہ اگر کوئی خوبصورت لڑکی کھڑی نظر آتی ہے تو اس کو نہ صرف نشست پر جگہ دے دیتے ہیں بلکہ دل میں بھی جگہ دینے میں کوئی قباحت نہیں محسوس کرتے بلکہ نشست تو بعد میں پیش کرتے ہیں اس سے پہلے ہی دل میں مسند نشینی ہو چکی ہوتی ہے جبھی تو کہتے ہیں مرد کا دل وسیع ہوتا ہے۔۔۔ خیر، پھر جو آنکھ جھپکی تو اسکا "آدھا ایمان" اُسے مل چکا تھا۔ اسکے بعد جناب سکوٹر پر نصف بہتر کے ساتھ پھر رہے ہیں۔ اگلے منظر میں دوسرا نکاح پڑھایا جا رہا ہے اور جناب اپنے "آدھے آدھے ایمانوں" کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں کہ بالآخر ایمان کی تکمیل ہوگئی۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہو رہا تھا کہ بائیک پر دونوں میں سے کوئی بھی پیچھے بیٹھنے پر رضامند نہیں تھی۔ اللہ اللہ کر کے ایک رضامند ہو ہی گئی اور بائیک چلنی شروع ہوئی۔ ابھی بڑی سڑک پر پہنچے ہی تھے کہ آگے والی نے بیٹھے بیٹھے ہی سڑک پر غوطہ لگا دیا! بائیک لہرا کر رہ گئی "محترم" نے چنداں کوشش کی اور خود تو بچ گیا مگر پیچھے والے دونوں آدھے ایمان سڑک پر آ رہے، جیسے ہم اپنی زندگیوں سے ایمان نکال پھینکتے ہیں کہ خود بچ جائیں۔۔۔ ایمان تو آنی جانی چیز ہے کہ یہ سب تو رسمِ دنیا بھی ہے، موقع بھی ہے، دستور بھی ہے والا چکّر ہے۔ خیر، وہ تو پیچھے والی نے بعد میں خود کو بھی چوٹ لگنے پر دل جلا عقدہ کھولا کہ موصوفہ نے آگے والی کا عبایا بائیک کے پہیے میں دے دیا تھا اور نتیجتاً بائیک نے "سرِ بازار می رقصم" کا عملی نمونہ پیش کیا تھا۔ پھر اس نے تنگ آ کر گاڑی ہی کر لی کہیں نہ کہیں سے، اب پھر وہی مسئلہ کہ آگے کون بیٹھے گا، "محترم" بلا کا ذہین واقع ہوا ہے۔ دونوں کو پیچھے بٹھایا اور چل پڑا۔ گھر جا کر جو دیکھا تو دونوں کے چہروں پر خراشیں تھیں۔ پھر اسکا حل یہ نکالا اس نے کہ ان دونوں کو آگے بٹھایا اور خود مزے سے پیچھے ڈھائی من کی لاش بنا رہا، تھوڑا اور وقت گزرا کہ خواب میں ایک گھنٹے کی نیند میں بھی انسان سالوں کے خواب بیک وقت پھانک کر جگالی کر سکتا ہے۔ وقت اور نیند کی کمی کم ہی خواب کی طوالت پر اثر انداز ہوتی ہے، ہاں کبھی کبھی بالکل مقصود تک پہنچ کر جو آنکھ کھلتی ہے نا، تو انسان ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے کہ پانچ منٹ اور خواب آنے میں کیا مضائقہ تھا۔ خیر، "محترم" جناب اگلے منظر میں بیک وقت تیسرا اور چوتھا نکاح بھگتاتے نظر آئے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ انھیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ چھ دفعہ "قبول ہے" ہانکنا ہے یا تین دفعہ سے ہی کام نکالا جا سکتا ہے۔ پھر وہ بھی نمٹ گیا اور جناب خوشی خوشی سے (اوپر اوپر سے کہ اندر کا حال وہ خود ہی جانتے تھے) پھر رہے تھے۔ مسئلہ تو اس وقت ہوا جب چاروں کو بیک وقت گاڑی میں سوار کرنا پڑ گیا، اب خود کدھر بیٹھیں اور آگے کون بیٹھے۔ کافی غور و خوض کے بعد ہوا یہ کہ چاروں پاؤ آدھے پونے ڈیڑھ ایمان (کہ "حصہ بقدرِ جثہ" مثل کے مصداق) تو گاڑی میں منزل کی جانب رواں دواں ہو گئے اور جناب خود بائیک پر وارد ہو رہے ہیں! بس اتنا ہی خواب جھانکا تھا کہ آنکھ کھل گئی یار!"

ذہین اذیت سے بولا تو میں نے استفسار کیا کہ اس میں اتنی تشویش کی کیا بات ہے؟

مجھے آنکھیں دکھاتے گویا ہوا "اچھا...! تو اس میں تشویش کی کوئی بات ہی نہیں ہے، مطلب آج کل کون شیریں گل اپنے اوپر

سوکن آنے دیتی ہے؟''

''ہاں یہ تو ہے!'' میں تھوڑی کھجاتا ہوا فکر مندی سے بولا کہ آخر مجھے ہم تینوں کا چار چار والا خواب چکنا چور ہوتا نظر آرہا تھا... میں نے پھر اسکو کچھ احساس دلانے کیلئے کہ ''پڑھائی تو کرلے پوری پہلے، وہ آکر تیرے باوا جان نے مکمل کرنی ہے بے کیا؟''

''اَمے جا بے! تجھے ایک بات بتاتا ہوں، میرے ساتھ پڑھنے والوں میں سے کچھ کے پاس اتنی پشتینی جائیداد موجود ہے کہ آرام سے بیٹھ کر کھاتے رہیں مگر وہ محض اس وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی تگ و دو میں ہیں تاکہ شادی کرسکیں۔ میں بھی سوچ رہا ہوں کہ شادی کرلوں تاکہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکوں! اب دیکھنا تو مہد (گود) سے لحد (قبر) تک سیکھنے کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ بندہ اپنے حصے کے لڈو نہ کھائے!''

''ذہین'' فلسفیانہ انداز میں بولا تو میں نے بھی کہہ دیا کہ تیری ایسی نرالی مُنھ کالی منطقیں اگر تیرے اباواجداد نے قبروں میں نئے واردشدگان پڑوسیوں سے سُن لیں نا تو انھوں نے تو خودکشی ہی کرلینی ہے۔"

''ذہین'' نظر انداز کرتا بولا

''اوپر سے جب ''محترم'' کو میں نے یہ خواب سنایا تو آنکھیں مٹکاتا دانت نکالتا بولا کہ بس میرے خواب کے بعد مُنھ دھو رکھو اور اس سے عبرت پکڑلو!"

''تو پکڑلو نا عبرت اور مُنھ دھو رکھو! کیا مضائقہ ہے!!'' میں نے دِلگرفتہ انداز میں مُفت مشورہ دے مارا۔

''بس یہی تو مسئلہ ہے، وہی ''عبرت'' تو ہاتھ نہیں آرہی، پڑوس میں رہتی ہے، بہت نخرے دکھاتی ہے حالانکہ میں جب بھی جاتا ہوں ''محترم'' کے مشورے کے مطابق مُنھ دھو کر جاتا ہوں مگر وہ ہے کہ ہاتھ آکے ہی نہیں دے رہی۔ بس اب تُو ہی بتا کہ ''عبرت'' کو کیسے 'پکڑوں۔''

اُس نے بیچارگی سے کہا تو میں یہ کہتا سر پیٹتا وہاں سے چل پڑا۔

''دھت تیرے کی!''

شاداب ملک

کہتے ہیں کہ دنیا میں جھینگروں کی ۲۴۰۰ اقسام ہیں۔لیکن میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے گھر میں پائے جانے والے جھینگر دنیا کی ضدی اور ہٹ دھرم ترین قسم ہے۔یعنی جن پر کسی قسم کی دوا کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔میرا خیال ہے کہ ہر باشعور آدمی کو جھینگر کی آواز سے وحشت ہوتی ہے،اور ہونی بھی چاہیئے کہ اس کی آواز سے نیند کہاں آسکتی ہے۔لیکن تعجب ہوتا ہے جب کہیں یہ پڑھتا ہوں کہ جھینگر کی آواز کو موسیقی سے تشبیہہ دی جاتی ہے،حتیٰ کہ بعضے ناہنجار تو جھینگر کی آواز سن کر وجد میں آجاتے ہیں۔یعنی کوڑھ ذوقی کی بھی حد ہوتی ہے، جھینگر کی منحوس آواز۔۔۔(آواز کہاں،وہ تو اس کے سفلی جذبات کا بدمعاشانہ سالامتناہی اعلان ہوتا ہے)سن کر ہماری نیند کا بیڑہ غرق ہوجاتا ہے،یوں لگتا ہے جیسے کان کے پردوں پر کوئی مسلسل سوئیاں چبھوئے جارہا ہو۔کروٹیں بدل بدل کر کندھے دکھنے لگتے ہیں، صاحب! یقین فرمائیے،ایک کان کو تکیے میں دبا کر اور دوسرے پر ہاتھ رکھ کر سونے کی متعدد بار اداکاری کی،کانوں میں انگلیاں دے کر سونے کی بارہا کوشش کی،لیکن ذرا نیند کے جھونکے سے انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑی اور پھر اسی باریک تیز خنجر کے وار قطرہ قطرہ دماغ میں اترنے لگے۔اس موقع کے لیے کئی مرتبہ روئی کا استعمال کرچکا ہوں لیکن سوائے کانوں کی صفائی کے کوئی فائدہ نہ ہوا کہ جھینگر کی آواز اتنی باریک ہوتی ہے جو روئی کے درمیان سے بآسانی گزر کر سیدھی دماغ سے جاٹکراتی ہے۔

جب سے یہ معلوم ہوا ہے کہ نر جھینگر اپنی مادہ کو مائل کرنے کے لیے یہ مہین آواز ایک بے ہنگم تواتر کے ساتھ نکالتا ہے،تب سے ہماری نفرت میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے کیونکہ ہم تو محلے کے لڑکوں کو بھی شرافت اور پاکدامنی کا درس دیتے ہیں۔کجا یہ کہ ایک معمولی کیڑہ بہانگ دہل ہمارے عین سرہانے بیٹھ کر عشق والفت کا پاپ گانا گاتا رہے اور ہم چپکے لیٹے سنتے رہیں۔

چنانچہ اکثر رات کو بستر سے بھنا کر اٹھتے ہیں اور جھاڑو ہاتھ میں لے کر ہمہ تن گوش ہو کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس آواز کا مخرج اور مخزن کہاں ہے؟ شروع میں کافی دقت ہوتی تھی لیکن اب تو اتنے عادی ہوچکے ہیں کہ بستر سے نیچے اتر کر تھوڑا جھک کر حالت رکوع میں گئے، کہ بغور سننے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے، پھر دائیں سے بائیں گھومے اور آخر میں بائیں سے دائیں۔اس مشق کے بعد ہماری نظریں عادی مجرم کے خفیہ ٹھکانے پر جم چکی ہوتی ہیں جو عموماً بیڈ سے ملحقہ الماری یا دیوار یا چھت پر موجود کسی نادیدہ سوراخ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

سوراخ ہونے کی صورت میں جھاڑو کی ایک تیلی نکال کر اسے سوراخ میں ڈالا،اگر جھینگر باہر نکلا تو پوری قوت سے جھاڑو اس پہ دے مارا،اور ایک منحوس آواز سے جان چھوٹی۔لیکن اگر وہ باہر نکلنے کی بجائے مزید اندر گھس جائے تو اپنے کانوں سے روئی نکال

ترقی کے لئے ہم نے لیا تھا لون سرکاری — ترقی ہو چکی اب بیچ کر گھربار دیتے ہیں (ظفر کمالوی)

مالوی مدن یا مولوی مدن

معروف ہندو رہنما مدن موہن مالویہ کی بے ہنگم ڈاڑھی پر ایک شاعر نے پھبتی کسی تھی:

ہزار شیخ نے ڈاڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مالوی مدن کی سی

اس شعر کے ساتھ ''حسن سلوک'' یہ ہوا کہ بعد کے دور میں کسی کاتب نے اس کی ''اصلاح'' کردی اور مالوی کو مولوی کر دیا۔ اس نے سوچا ہوگا، ایک مولوی ہوتا ہے ایک مولانا، یہ مالوی تو سنا نہیں۔ ضرور پہلے والے کاتب کی غلطی ہے۔ چنانچہ اب یہ شعر یوں لکھا جاتا ہے:

ہزار شیخ نے ڈاڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

حالانکہ بے چارے ''مدن'' نام کا کوئی مولوی کبھی تھا ہی نہیں۔

کر اسی سوراخ میں ٹھونس دی۔

ہمارے گھر والے ہماری اس عادت سے سخت نالاں ہیں۔ رات کے دو تین بجے کی اٹھا پٹخ کی وجہ سے ان کی نیند میں بھی خلل آتا ہے۔ کوئی کہتا ہے اتنی نازک دماغی بھی نہ ہو کہ وبال جان بن جائے۔ میں کہتا ہوں کہ اتنی خرد ماغی بھی نہ ہو کہ چار پائی کے ارد گرد ہونے والے عجیب واقعات کا شعور بھی نہ ہو۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ ہوا، اصل وجہ تو جھینگر کی باریک اور تیز آواز ہے جسے ہمارا دماغ بالکل بھی برداشت نہیں کرتا۔ بیگم نے کچھ دن پہلے مشورہ دیا کہ گاؤں میں آرمی سے ریٹائرڈ مشہور ماہر نفسیات آئے ہوئے ہیں۔ ان سے چیک اپ کرانے میں کوئی حرج نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ باتوں ہی باتوں میں یہ مسئلہ حل ہوجائے۔ چنانچہ ان سے وقت لینے کی خاطر فون کر دیا۔ اتفاق سے موصوف اس وقت ہمارے ہی گھر کے سامنے سے گزر رہے تھے، فوراً اندر آدھمکے۔ برآمدے میں چار پائیاں بچھی تھیں، دعا سلام کے بعد چند ثانیے وہ ان چار پائیوں کو بغور دیکھتے رہے۔ پھر کہنے لگے، "دیکھئے شاداب صاحب، یہ دو چار پائیاں تو شمالاً جنوباً متوازی ہیں لیکن تیسری چار پائی تھوڑی ٹیڑھی کیوں ڈالی ہوئی ہے؟" میں نے بھی غور سے دیکھا لیکن تینوں کے زاویوں میں کوئی فرق نظر نہ آیا۔

موصوف نے تیسری چار پائی کا ایک سرا اٹھا کر تھوڑا پرے سرکایا اور فرمایا، "جی اب متوازن ہوگئیں"

میں نے ان کا بے حد شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے کتنے لطیف پیرائے میں میرے اس مسئلے کو بھی متوازن کر دیا جو میں نے انہیں ابھی بتایا بھی نہیں تھا۔

جھینگروں سے نمٹنے کے لیے آخری حربے کے طور پہ ہم انسیکٹ کلر سپرے خرید لائے۔ اس دن اتفاق سے ہمارے ماموں اور ممانی صاحبہ ہمارے گھر بطور مہمان آئے ہوئے تھے۔ رات کو سبھی چار پائیاں صحن میں ڈالی گئیں، اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا، یعنی بیگم کی لاکھ نصیحتوں کے باوجود ہم جھینگروں کی مختلف النوع آوازیں محض دو گھنٹے ہی برداشت کر پائے۔ رات کے کوئی دو کا عمل ہوگا، ہم سپرے کی بوتل ہاتھ میں پکڑے دیوار پر تھوڑا چڑھ کر ایک شدید مجنوں قسم کے جھینگر کے سوراخ میں سپرے کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ اس وقت ہماری ہیئت کذائی کچھ یوں تھی کہ ایک ٹانگ پاس پڑے خالی ڈرم پہ رکھی تھی، اور دوسری دیوار پہ، ایک ہاتھ میں سپرے کی بوتل تھی اور دوسرے سے برآمدے کے شیڈ کو پکڑ رکھا تھا کہ شومئی قسمت، ہماری ممانی جان کی آنکھ کھل گئی۔

رات کے اندھیرے میں انہوں نے دیوار پر لٹکتے بندر نما انسان کو دیکھا تو ان کی ہیبت ناک چیخ کی آواز سے گھر تو کیا، پورا محلہ جاگ اٹھا۔ یہ وہی منحوس رات تھی جب محلے کے بچے بچے کو علم ہوگیا کہ ہم جھینگروں سے ڈرتے ہیں۔

صاحبو۔۔۔ اب یہ عالم ہے کہ جھینگروں کو بالکلیہ ختم کرنے کے واسطے تعویذ دھاگہ، جادو منتر، گوبھی کی فصل پر کیا جانے والا سپرے سمیت تمام ممکنہ کوششیں بروئے کار لا چکا ہوں۔ لیکن اس منحوس آواز سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔ کاش میرے اندر اتنی ہمت ہوتی کہ میں جھینگروں کی آواز کے ساتھ مفاہمت کر سکتا۔

زریاب شیخ

چورن اور پاکستانی عوام

کچھ عرصہ پہلے میرے سر میں درد ہوا تو گھر کے پاس ہی ایک حکیم صاحب تھے ان کے مطب مین چلا گیا، کچھ دیر بعد مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ حکیم صاحب سب کو تین پڑیاں چورن کی دے رہے تھے چاہے کسی کے سر میں درد تھی یا جگر خراب تھا یا دل کی دھڑکن آہستہ چل رہی تھی، جب وہ اور میں ہی رہ گئے تو بے صبرے انداز میں پوچھا کہ بابا جی یہ سب کو ہی ایک دوائی پر ٹرخا رہے ہیں آخر ماجرا کیا ہے تو مسکرا کر بولے کہ یہ سب بیوقوف لوگ ہیں اور ان کو میں چورن کی پڑیاں دے رہا ہوں کھائیں گے تو ٹھیک ہوجائیں گے، میں ہنس کر بولا کہ جناب اگر ان کو پتہ چل گیا کہ آپ نے چورن لگایا ہے تو دکان کا بھی اور ساتھ میں آپ کا بھی حشر نشر کردیں گیتو کہنے لگے دیکھو حکومتیں اتنے برسوں سے عوام کو چورن دے رہی ہیں کسی کا کوئی بال برابر بھی نقصان نہیں کرسکا، میں تائید میں سر ہلاتا رہا پھر بولے کہ بجلی مہنگی ہوتی ہے عوام سڑکوں پر نکل آتی ہے، مہنگائی ہوتی ہے عوام چیختی چلاتی ہے، پٹرول کی قیمتیں بڑھتی ہین عوام کا دماغ خراب ہوجاتا ہے لیکن حکومت آرام سے چورن دیتی ہے اور سب مطمئین ہوکر گھر بیٹھ جاتے ہیں تھوڑے عرصے کیلئے سب کچھ ٹھیک رہتا ہے، وہ بولے کہ کچھ عرصے تک یہ لوگ بھی ٹھیک رہیں گے اور دوبارہ تکلیف ہوگی تو آکر کہیں گے کہ آپ کی دوائی سے ہم بہت ٹھیک رہے تھے دوبارہ دے دیں اس طرح ساری زندگی میں چورن بیچ بیچ کر کتنے ہی گھروں کا مالک بن گیا ہوں اور مزے کی زندگی گزر رہی ہے، باتیں کرتے کرتے انہوں نے مجھے بھی چورن کی پڑیاں دیں اور کہا کہ یہ میری طرف سے گفٹ سمجھ کر رکھ لو، حکیم صاحب کی بات بالکل صحیح تھی ہم ایک بے وقوف قوم ہیں ہمارے اندر سوچنے سمجھنے کی حس ہی ختم ہوگئی ہے، گھر کے پاس ہی پہنچا تھا کہ ایک دوست مل گیا کہنے لگا کہ بس میرے یار اب ہمارے دن پھرنے والے ہیں، میں نے پوچھا کیا ہوا ابا کی لاٹری نکل آئی تو بولا کہ نہیں عمران خان نے دھرنے کا اعلان کیا ہے، بس اب حکومت کی بینڈ بجادے گا، میں ہنس پڑا اور بولا کہ یار وہ بھی چورن دے گا تم لوگوں کو، جس پر وہ منہ بنا کر چلا گیا، کچھ دن پہلے اسی دوست سے ملاقات ہوئی میں مسکرا کر بولا کہ یار وہ انقلاب کا کیا ہوا، کہنے لگا کہ بس یار قسمت ہی خراب ہے، کاش پشاور والا واقعہ نہ ہوتا تو انقلاب آنے ہی والا تھا، میں نے کہا کہ انقلاب آیا یا نہیں لیکن نئی خاتون اول ضرور ملک کو مل گئی ہیں، اگر دیکھا جائے تو ۶۲ سال میں اس قوم کو سب نے چورن دیا اور ابھی تک دے رہی ہے سب کو ہی ایک مسیحا کی تلاش ہے، ایک رشوت خور اور ملاوٹ کرنے والا بھی ایسے مسیحا کا انتظار کررہا ہے جو اس کو آکر بتائے کہ جناب آپ غلط کام چھوڑ دیں، وہ مسیحا لوگوں کو تمیز سکھائے لیکن ایسا مسیحا کب آئے گا یہ کوئی نہیں جانتا، حال ہی میں قصور واقعہ کا سن کر مجھے حکمرانوں پر بہت غصہ آیا، دل میں نہ جانے کیسے کسے القابات سے میں نے نواز دیا، کچھ تو ان بچوں کے والدین پر غصہ تھا کہ تین سال سے خاموشی کی بانسری بجارہے تھے لیکن بھلا ہو حکیم صاحب کے چورن کا ایک پھکی کھاتے ہی میرا دل اپنے حکمرانوں کیلئے جان بھی قربان کرنے کا تیار ہوگیا۔

سید فہیم الدین

تمہاری دو رُخی آنکھوں کو ہم نے جھیل کرنا ہے
یہاں ہر شخص کو مکھن لگا کر ڈیل کرنا ہے

ہماری ساس کو اللہ نہ بخشے اس حیاتی میں
فقط مقصد یہی، داماد کی تذلیل کرنا ہے

ہمارے واسطے سرکار ہے سسرال بھی اپنا
ہمارا کام ہے اِتنا کہ بس تعمیل کرنا ہے

حسیناؤں کو جب بھی دیکھنے پر آئیں یہ لڑکے
تو یہ لگتا ہے نظروں سے اُنہیں تحلیل کرنا ہے

ہماری آنکھ سے نکلے ہوئے آنسو جمع کر لو
کہ ہم نے ایک دن اس کی گلی کو نیل کرنا ہے

سید فہیم الدین

شادی کی ساٹھ سال میں ٹھانی کسی طرح
قابو میں ہی نہیں ہے جوانی کسی طرح

محبوب پہلے پوچھ تو لیتا تھا چائے کو
اب پوچھتا نہیں ہے وہ پانی کسی طرح

فلموں میں اس کو رقص بپا دیکھتے ہیں ہم
لگتی ہے وہ جو ہیرو کی نانی کسی طرح

وعدے تو ہو رہے ہیں زبانی کسی طرح
بڑھتی ہی جا رہی ہے گرانی کسی طرح

بڑھتے ہی جا رہے ہیں تمہارے مطالبے
تم جان کا ہی روگ ہو جانی کسی طرح

تنویر پھوؔل

اِک قصائی نے دیا بکرا پچھاڑ
دیکھتے تم اُس جری کی چیر پھاڑ
بلّی کہلاتی ہے خالہ شیر کی
وہ نہیں سنتی کبھی اُس کی دہاڑ
اپنی بیگم سے نہ لو "پنگا" کبھی
شیشۂ دل میں نہ آ جائے دراڑ
یاد کرتے ہم پہاڑے کس طرح
سامنے آیا پہاڑوں کا پہاڑ
درد کے مارے پھٹا پیٹو کا پیٹ
چیخ ایسی ، فیل کی گویا چنگھاڑ
ریش کی رسّی بنا ، باندھیں گے وہ
مولوی صاحب سے مت رکھنا بگاڑ
شاعری کرنے لگے ہیں خاکروب
شاعری کے نام پر کوڑا کباڑ
ہار مانے گا رقیبِ رُو سیاہ
ڈال کر آنکھوں میں آنکھیں تُو لتاڑ
بیت بازی کے لئے بے مثل پھوؔل!
"ڑ" کے سائے میں ملی ہے کیسی آڑ

تنویر پھول

کہنی ہے اِک غزل کہ ہو جس کی ردیف "سانپ"
موٹا بہت ہو سانپ یا بالکل نحیف سانپ
شکلِ بشر میں سانپ ملے مارِ آستیں
لیکن گھنے بنوں میں ملے ہیں شریف سانپ
چشمہ لگا کے خوب لگاتا تھا قہقہے
دیکھا تھا ہم نے خواب میں کل اِک ظریف سانپ
پالا ہے ایک سانپ یہاں گوری میم نے
"چکن" وہ کھا رہی تھی تو کھاتا تھا "بیف" سانپ
جو سانپ، سانپ گھر میں ہیں بے حد نفیس ہیں
بیت الخلا میں آتے نظر ہیں کثیف سانپ
میدانِ جنگ ایک تھا زیرِ زمیں نہاں
فوجیں تھیں کنکھجوروں کی اور اُن کا "چیف" سانپ
ہوتے تھے پاؤں سانپ کے 'تورات' یہ کہے
وہ چھِن گئے ، بنا جو بدی کا حلیف سانپ
فصلِ ربیع اس کو پسند آ گئی مگر
دیکھو! بنا نشانۂ فصلِ خریف سانپ
بیگم بہت نحیف تھی ، بل میں تھی وہ پڑی
اُس کو پلانا "سُوپ" تھا، لایا تھا قیف سانپ
یارو! سمجھ لو دونوں میں کیا ہیں تعلقات
ڈاکو تھا اژدہا تو بنا ایک "تھیف" سانپ
عہدِ شباب یاد کیا تو اُداس ہے
پہلے جوان سانپ تھا ، اب ہے ضعیف سانپ
اے پھوؔل! تیرے پہلو میں رانی ہے رات کی
ہشیار ہو کہ بن گیا تیرا حریف سانپ

چونچال خوب گزریں گے دن اپنے جیل میں روٹی پکی پکائی ملے گی تنور کی (بشیر احمد چونچاؔل)

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

جس لڑکی سے مار وہ اکثر کھاتا ہے
اُس کے ابا سے پٹی کرواتا ہے

اک دن اُس کے نقشِ پا کو چوما تھا
وہ سمجھی یہ اب بھی مٹی کھاتا ہے

اُس نے ہر لڑکی کو ٹوٹ کے چاہا تھا
اب وہ دل کے ٹکڑے ویلڈ کراتا ہے

وہ شوگر ہونے سے ڈرتا ہے اِتنا
میٹھی باتوں سے ہی دل بہلاتا ہے

آج کی ہیر تو بھینسوں سے ناواقف ہے
رانجھا اب اُس کی گاڑی نہلاتا ہے

اُس کی ایک سہیلی مجھ سے کہتی تھی
کیوں بھینسوں کے آگے بین بجاتا ہے

سعدؔی سا بزدل کس کھیت کی مولی ہے
بیوی سے تو رستم بھی ڈر جاتا ہے

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

پہلے چوری کی ہر چیز چھپاتا ہے
پھر یاروں کو دعوت میں بلواتا ہے

کہتا ہے بیگم کو جوتی پاؤں کی
گھر میں بیگم کے پاؤں پر جاتا ہے

شاپنگ کی گرمی سے وہ کچھ پگھلی ہے
پیسہ پتھر کو بھی موم بناتا ہے

اب تو چابی والے ٹیکے لگتے ہیں
اب تالے کو چابی کون لگاتا ہے

ویزے کے لالچ میں جا کر امریکہ
اب وہ بیگم کے کتے نہلاتا ہے

ایک سے بڑھ کر ایک لفنٹر گاؤں کا
سرکاری اسکولوں میں پڑھاتا ہے

وہ بھی میرے ہجر میں کم کم سوتی ہے
کہہ دیتی ہے اُس کو مچھر کھاتا ہے

ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ

اُس لڑکی سے جو بھی آنکھ لڑاتا ہے
اُس کی آنکھوں کو یہ کیا ہو جاتا ہے

آج کا رانجھا اپنی ہیر سے ملنے کو
بکتر بند گاڑی میں آتا جاتا ہے

خط لکھتا ہے وہ ہی اُس کی بیوی کو
ملاّ جس سے جا کر خط کرواتا ہے

اُس کے عشق میں پستی کیسے ممکن ہے
بیسویں منزل پر جو ملنے جاتا ہے

ویزہ شو کرنے پر ہنس کر مانے گا
جھینگی جان کے جو اُس سے گھبراتا ہے

سُن کر پاپ میوزک ناخواندہ لڑکا
گلیوں میں اب انگلش گانے گاتا ہے

بوڑھے اکثر ڈھونڈتے رہتے ہیں اُس کو
سعدیؔ اُس کو کیا نسخہ لکھواتا ہے

عبدالحکیم ناصفؔ

سرِ دیوار بیٹھے ہیں، پسِ دیوار بیٹھے ہیں
مُجھ اِکلوتے کا دِل لینے بہت دِلدار بیٹھے ہیں

میں ہُوں بیمار، میرے پاس میرے یار بیٹھے ہیں
یہ پُرسی کر چکے، پُرسے کو اب تیّار بیٹھے ہیں

یہ عزرائیل سے کہہ دو، ابھی واپس چلے جائیں
نہ چھیڑیں ہم کو، ہم خود جان سے بیزار بیٹھے ہیں

کوئی اُلّو نہیں بنتا، کوئی مُرغا نہیں پھنستا
یہ توتا اور ہم، فُٹ پاتھ پر بے کار بیٹھے ہیں

تجھے اے ساقی! اب تک دُھر بنانا ہی نہیں آیا
یہ کیسی مے پلائی ہے کہ سب ہُشیار بیٹھے ہیں

کبھی تو گرم ہَو کر نرم ہَو گا حُسن کا لوہا
ہتھوڑا عشق کا تھامے کئی لوہار بیٹھے ہیں

جو ہو آرام سے جینا، نہ اَڑنا اپنی زوجہ سے
یہ گُر سمجھایئے اُن کو جو زوجہ دار بیٹھے ہیں

خلیفہ ٹاوروں والو! خلیفہ گیریاں چھوڑو!
ہمارے بادشاہوں کے قُطب مینار بیٹھے ہیں

عزیز آباد میں ہم کو مکاں دِلوا کے وہ ہمدرد
خود اپنا بیچ کر گھر، گلشنِ معمار بیٹھے ہیں

یہ عُقدہ صبح سے حل کر رہی ہیں بیگمات ان کی
پہن کر شام سے اُلٹی وہ کیوں شلوار بیٹھے ہیں

مری سمدھن پہ ڈورے ڈالتے رہتے ہیں دریا خاں
مرے سمدھی سمندر خاں، سمندر پار بیٹھے ہیں

ڈرامے جو مرے گھر بن رہے ہیں ایک مدّت سے
وہاں سسرال میں ان کے ہدایت کار بیٹھے ہیں

یہی ہے اِنقلاباتِ جہاں پر تبصرہ ناصف
کہ جتنے کار والے تھے وہ سب بے کار بیٹھے ہیں

عبدالحکیم ناصفؔ

"منظور" ہے "کاکا" کو یہ درزی کا ہُنر بھی
دھرتی کی "کٹنگ" کرتا ہے یہ "چاپئنا گر" بھی
ملتا نہیں میں اُن سے سرِ راہ گزر بھی
ڈرتا ہُوں نہ آ جائیں کہیں وہ مرے گھر بھی
اِک میں ہُوں مرے ساتھ ہیں اٹھارہ پسر بھی
ہر لختِ جگر کی ہے الگ ایک مُدر بھی
دُھلوانی ہو دولت کی کثافت تو مرے بھائی!
اعیان علی نام کی دھوبن ہے اِدھر بھی
ہر شخص سمجھتا ہے مجھے دیکھ رہا ہے
کیا خوب ہے اے جانِ جہاں بھینگی نظر بھی
معلوم تجھے ہو گی تماشے کی حقیقت
بازیچۂ اطفال سے اِک بار گزر بھی
میں اِس لیے تحفے میں اُنھیں دیتا ہُوں ساڑھی
چہرہ بھی نظر آتا ہے، بازو بھی، کمر بھی
کھانی ہے اگر "گرل فرینڈوں" کی کمائی
لازم ہے بہت دوستو! "چیٹنگ" کا ہُنر بھی
اِن "نیٹ" کے چہروں میں نجاست ہے بَلا کی
اے "فیس بُکی" مُڑ کے کبھی دیکھ لے گھر بھی
ہم ڈوبنے جائیں بھی تو دریا ہی پہ کیوں جائیں
آغوش میں لے لیتے ہیں سڑکوں پہ گٹر بھی
اے حُسنِ سلوک آ ! کسی اخبار میں مِل جا
ڈھونڈھے سے نہیں ملتی کہیں تیری خبر بھی
ہے چشم کُشا دورِ ترقّی کا یہ منظر
چشمے میں نظر آتے ہیں اربابِ نظر بھی
ناصفؔ کا عدد پانچ ہے وہ "پانچ" کا طالب
اعداد سے لیتا ہے مدد علمِ جفر بھی

عبدالحکیم ناصفؔ

اُس کو پٹا پٹا کے، کہیں بھی بُلا کے مِل
ساتھ آئے اُس کی والدہ تو سُٹپٹا کے مِل
لب، گال،کان، ناک، گلا سب کو تنگ کر
کینٹے میں، مکھیوں کی طرح بھنبھنا کے مِل
جانی ! نکلنی چاہئیں ناپاک حسرتیں
یہ پاک سرزمیں ہے یہاں پی پلا کے مِل
پہلے تو تین بار اُسے کہہ ہلالِ عید
پھر عید کے بہانے گلے بھی لگا کے مِل
گر، چار بیگموں سے تجھے غم ملے ہوں کم
باہر کی بیگمات سے بھی مات کھا کے مِل
شیشے میں گر اتارنا چاہے تو بات سُن
کینٹے میں اس حسین کو شیشہ پلا کے مِل
پتّی کا پان کھا کے وہ آتی ہے تیرے پاس
تُو بھی کسی پٹھان سے نسوار کھا کے مِل
کس کس کو اس پری نے وہاں کِس نہیں دیا
کس نے تجھے کہا تھا اُسے پیاز کھا کے مِل
جاتا رہے گا شوقِ ملاقات، ننگے پاؤں
تُو دوپہر کی دُھوپ میں، کوٹھے پہ جا کے مِل
غالب اگر وہ ہونے لگے تجھ پہ دِلربا
غالب کی کوئی "تازہ" غزل گنگنا کے مِل
نظریں نہ گاڑ اس کے نشیب و فراز پر
احمد فرازؔ کی اسے غزلیں سُنا کے مِل
دونوں جہاں کی نعمتیں مِل جائیں گی تجھے
اپنے "پیو" کے پاؤں پکڑ، جا کے "کاکے" مِل
لازم ہے ساس اور سُسر کا بھی احترام
ناصفؔ تُو ان کی "دِھی" سے بھی گردن جُھکا کے مِل

مرے رعب میں تو وہ آ گیا، مرے سامنے تو وہ جھک گیا ۔۔۔ مجھے لات کھا کے ہوئی خبر، مجھے پیٹتا کوئی اور ہے ۔۔۔ (ضیاء الحق قاسمی)

عبدالحکیم ناصفؔ

سو فیصدی شریک ِ سفر ، ہے بھی اور نہیں
بیگم ہماری یعنی صفر ، ہے بھی اور نہیں
اپنے جگر کو دے دیا گُردہ نِکال کر
حالانکہ وہ ہمارا جگر، ہے بھی اور نہیں
بزمِ سخن میں آتی ہیں چشمہ پہن کے وہ
"نیناں" کی ہم پہ خاص نظر، ہے بھی اور نہیں
کھٹ میٹھی یہ غزل تو ہے مُشکل ردیف میں
یہ "سیکرین" ہے جو شکر ، ہے بھی اور نہیں
جس دن سے یہ جھکا ہے "سپر پار" کے حضور
اِس دھڑ پہ جو رکھا ہے وہ سر، ہے بھی اور نہیں
داماد جو کہ رہتا ہے سسرال کے قریب
دنیا میں اس غریب کا گھر ، ہے بھی اور نہیں
بلڈنگ اگر، میاں ہے تو بیوی بھی ہے پلر
بلڈنگ کا وہ ضروری پلر ، ہے بھی اور نہیں
برگد کا ہے تنا تو کبھی گُل کی شاخ ہے
قمرالنسا ! تمھاری کمر ، ہے بھی اور نہیں
کمپیوٹروں میں ہو گیا دو بار اِندراج
یہ تیسری جو جنس ہے "نر" ، ہے بھی اور نہیں
اِس سے گزر کے جاتی ہے وہ ڈیٹ مارنے کھڑکی
ہے جس کا نام، وہ دَر، ہے بھی اور نہیں ہیرو کا
"رول" فلم میں کرنے لگا ہُوں میں
اور ہیروئن میری "لور" ، ہے بھی اور نہیں
جن جن کے طعنے سُن کے مجھے آ رہا ہے طیش
جن جانتا ہے جن کا اثر ، ہے بھی اور نہیں
انڈے کے ساتھ اُبلتے ہیں ، انسان اور گٹر
انسان دیکھنے میں گٹر ، ہے بھی اور نہیں

عبدالحکیم ناصفؔ

نوکری کا جگاڑ کر بابا!
وہ بھی کسٹم میں تاڑ کر بابا!
جیبیں کاٹوں میں آتے جاتوں کی
اِس قدر بھیڑ بھاڑ کر بابا!
پکڑے جانے کا ہو جہاں خطرہ
تُو وہاں اپنی آڑ کر بابا!
ہر بُرائی کو، رائی کر کے دِکھا
میری نیکی پہاڑ کر بابا!
چاندی، سونا بنا کے مجھ کو دے
اِن پہاڑوں کو گاڑ کر بابا!
میں پہنچ جاؤں اعلیٰ عہدے پر
افسروں کو پچھاڑ کر بابا!
میری ہیبت کا تذکرہ سُن کر
شیر مر جائیں دھاڑ کر بابا!
جو ہوں حائل مری ترقی میں
اُن سے تُو چھیڑ چھاڑ کر بابا!
کُھل نہ جائے ضمیر کا رستہ
میرے آگے کواڑ کر بابا!
ڈال دے میری ساری جیبوں میں
نوٹ سب موڑ ماڑ کر بابا!
واسطہ جب پڑے غریبوں سے
ڈانٹ دوں منہ بگاڑ کر بابا!
بھیگی بلّی بنا دوں بیگم کو
بے سبب ہی لتاڑ کر بابا!
مجھ کو شاعر سے اب بنا افسر
یوں بنا دے بگاڑ کر بابا!

ریاض احمد قادری

کیسا ہے شخص خوب نہایا ہے عید پر
یوں رنگِ حسن اس نے دکھایا ہے عید پر
پورا برس نصیب میں بوٹی نہیں ہو ئی
مرغا بھی سال بعد ہی کھایا ہے عید پر
بارہ مہینے دور رہا وہ نماز سے
مسجد میں آج چل کے وہ آیا ہے عید پر
بچے رہے ہیں گھر میں مقید جو پورا سال
اب ان کو چڑیا گھر میں وہ لایا ہے عید پر
سرخی نہ لالی اور نہ شیمپو وہ لے سکا
بیگم نے اس کی منہ کو سجایا ہے عید پر
پورا برس ہے پہنا پرانا لباس ہی
اب اس نے ایک سوٹ سلایا ہے عید پر
بیگم کو اس نے سیر کرا ئی نہیں کبھی
اب اس کو لے کے شہر میں آیا ہے عید پر
بچے ہمیشہ ٹکڑوں پہ پلتے رہے تمام
کسٹرڈ کے ساتھ حلوہ دلایا ہے عید پر
کھاتے رہے ہیں جھڑکیاں بچے جو سال بھر
لیکن اب عید کیک کھلایا ہے عید پر
چپ چاپ منہ پھلا کے جو بیٹھا رہا ریاض
اس نے خوشی کا گیت بھی گایا ہے عید پر

اسلام الدین اسلام

ترے واسطے دو جہاں چھوڑ آئے
محلے کی سب لڑکیاں چھوڑ آئے

تمہاری گلی میں لگایا ہے کھوکھا
وہ چلتی چلاتی دکاں چھوڑ آئے

سڑک پار کرتے ہوئے بولی بھائی
سڑک کے جسے درمیاں چھوڑ آئے

حقیقت کھلی کل کہ خواجہ سرا تھا
وہ گھر تک جسے دو جواں چھوڑ آئے

نہیں ڈالتی گھاس بھی اب ہمیں وہ
وہ جس کے لئے اپنی گاں چھوڑ آئے

حسینہ کی شادی پہ مہندی کے دن ہم
سلینسر کا اپنے دھواں چھوڑ آئے

پلٹتی جھپٹتی رہی پہلی بیوی
یہ شیروں کی خالہ جہاں چھوڑ آئے

جو اماں تھی گھر میں تو بیوی تھی میکے
جو بیوی کو لائے تو ماں چھوڑ آئے

ہمیں دوسری شادی کر کے ملا کیا
یہ منجھ لے کے آئے وہ گاں چھوڑ آئے

مروڑیں پڑی ہیں رقیبوں کے ٹڈ میں
کل اسلام لمبی جہاں چھوڑ آئے

شہباز چوہان

اسی لئے تو صاحب اُس نے چھنڈا تھا
اُس نے اس کو پورے شہر میں پنڈا تھا

سوہنی مر گئی ماہیوال کی سستی سے
دیر سے ماری چھال کہ پانی ٹھنڈا تھا

رانجھا دیر سے پہنچا ہیر کی شادی میں
چھوڑ دی اُس نے کار تو لے لیا سنڈا تھا

پنوں چھوڑ گیا جو سوتی سسی کو
اُس کو واپس کے وڈے بھاہ نے پھنڈا تھا

مرزے جٹ کی گھوڑی راہ میں بیٹھ گئی
پانی پیا نہ کھایا اُس نے ونڈا تھا

کیدو دشمن کبھی نہ ہوتا رانجھے کا
نہیں تھی اپنی بیوی اُس کی رنڈا تھا

شہباز چوہان

شادی غیر ضروری بھی ہو سکتی ہے
عاشق کی مجبوری بھی ہو سکتی ہے

بند ٹفن تھی جس کو تم نے دیکھا تھا
اس کے اندر چُوری بھی ہو سکتی ہے

کبھی کبھی کا ہجر بھی چنگا نہیں جاناں!
پرمانٹ یہ دوری بھی ہو سکتی ہے

اُس کے ہاتھ میں ڈنڈا بھی ہو سکتا ہے
موت کی خواہش پوری بھی ہو سکتی ہے

لازم نہیں کہ مارے اور وہ ٹُٹ جائے
جُتی کوئی پسروری بھی ہو سکتی ہے

ہاں وہ لڑکی ہو سکتی ہے سوہنی بھی
یا اُس کی مشہوری بھی ہو سکتی ہے

لفٹ کا مطلب چاہت بھی ہو سکتا ہے
یا میری مزدوری بھی ہو سکتی ہے

لازم ہے وہ ہنس دے میری غزل کے بعد
اُس کے ماتھے گھوری بھی ہو سکتی ہے

خوش ہو کر دروازہ کھولا اگیوں میٹر ریڈر نکلا
وہ سمجھی تھی شائد آج بھی سامنے والا لڑکا ہوگا (خالد مسعود)

نوید ظفر کیانی

غیر کو اپنا بناتے ہو، غضب کرتے ہو
اور پھر جان چھڑاتے ہو، غضب کرتے ہو

اِن سے گلقند بناتے تو افادہ ہوتا
پھول جوڑے میں سجاتے ہو، غضب کرتے ہو

اور ہر جنس میں حاصل ہو کفالت جیسے
میٹرو بس ہی اُگاتے ہو، غضب کرتے ہو

یاد رکھنا تھا تمھیں شیر کہا جاتا ہے
ڈھینچوں ڈھینچوں کیے جاتے ہو، غضب کرتے ہو

اپنے چہرے کی جو کالک ہے، اُسے بھی دیکھو!
آئینہ سب کو دکھاتے ہو، غضب کرتے ہو

کاٹ کھانے کے لئے ڈھونڈتے ہو موقع بھی
ساتھ میں دُم بھی ہلاتے ہو، غضب کرتے ہو

سر میں افکار کی خشکی ہے یا کلفت کی جوئیں
ہر سے تم جو کھجاتے ہو، غضب کرتے ہو

زن مریدی کا بھی مل سکتا ہے طعنہ تم کو
ہاتھ بیوی کا بٹاتے ہو، غضب کرتے ہو

فرق کشکول میں اور توند میں کچھ تو رکھتے
اپنی بھد آپ اُڑاتے ہو، غضب کرتے ہو

اُس کو ہر لفظ کا مطلب بھی بتانا ہو گا
یہ غزل کس کو سناتے ہو، غضب کرتے ہو

نوید ظفر کیانی

یارو میرا احوال اُسے جا کے سُنا دو
میں اُس کی جدائی میں ہوا "ایک بٹا دو"

کل طعنہ نہ مل جائے تمھیں "ماٹھے پنے" کا
جو بھی ہو سبک گام، اُسے ٹانگ اڑا دو

دینی ہیں اگر سخت رقیبوں کو سزائیں
کہہ سُن کے اُنھیں عقد کی سُولی پہ چڑھا دو

کمزور ہے دشمن تو چبالوں گا میں کچا
تگڑا ہے تو کچھ وعظ کرو، خوفِ خدا دو

دیتے ہیں یہ کوے کسی مہمان کی دھمکی
شیطان کے چیلوں کو منڈیروں سے اُڑا دو

کچھ لوگوں کی ٹنڈ ایسی چمکدار ہے، واللہ
ہاتھوں میں ہو کھجلی کہ چپت اس پہ لگا دو

آ جائے اگر باس برابر سرِ راہے
کچھ خیر سگالی کے لئے دُم ہی ہلا دو

اچھی نہیں ہوتی کسی صورت بھی خوشامد
اور ایسی کہ کوے کو کبوتر ہی بنادو

یوٹرن لیا ہے تیرے یاروں نے جہاں پر
تم اپنے فسانے کو وہیں موڑ نیا دو

ڈاکٹر عزیزؔ فیصل

وہ کالے انجن سے ہے پرانی بقول شخصے
جو بنتی پھرتی ہے بنو رانی بقول شخصے

وہ مونہہ بولے جو اتنے رشتے بنا چکا ہے
یہ سب ڈرامہ ہے منہ زبانی بقول شخصے

تمیز شوہر کو جو سکھاتی ہے جوتیوں سے
یہاں پہ بیٹھی ہے وہ زنانی بقول شخصے

بیاض ہر وقت اپنے ہمراہ اٹھائے پھرنا
یہ بدتمیزی کی ہے نشانی بقول شخصے

ملول رانجھ ؟وں کو فون پر وہ رلا چکی ہے
سنا کے فرضی دکھی کہانی بقول شخصے

ہمارے دل پھینک شہر کی ہر گلی میں فیصل
فلاں کے چکر میں ہے فلانی بقول شخصے

ڈاکٹر عزیزؔ فیصل

خود کو میک اپ سے داغدار نہ کر
کاسمیٹک سے منہ پہ وار نہ کر

دل کے رکشے میں تین سیٹیں ہیں
اس پہ چوتھی کو بھی سوار نہ کر

میں ہوں پہلے ہی بیویوں والا
تو مجھے اور سوگوار نہ کر

زن مریدوں کی ٹاپ رینکنگ میں
ہو سکے تو مرا شمار نہ کر

اپنا دیوان سب کا سب ہی سنا
یہ کرم مجھ پہ قسط وار نہ کر

وصل منگل کو طے ہوا تھا اگر
جان من اس کو سوموار نہ کر

اس کو آشوب چشم ہے ہگلے
اپنی آنکھیں تو اس سے چار نہ کر

عشق دو فٹ ہی گہرا نالہ سہی
اس کو کچے گھڑے پہ پار نہ کر

اس پہ کوے بھی بیٹھ سکتے ہیں
خود کو اتنا بھی شاخ دار نہ کر

انجینئر عتیق الرحمن

سامنے جو جمال ہوتا ہے
اُس کے پیچھے کمال ہوتا ہے

ہجر کی آگ سے گزرتے ہیں
تب ہی جا کر وصال ہوتا ہے

حد سے بڑھ کر مٹھاس کے پیچھے
خوبصورت سا جال ہوتا ہے

جو یہ کہتا ہے مال کچھ بھی نہیں
جیب میں اُس کی مال ہوتا ہے

ہے ضرورت کے واسطے پیسہ
حد سے بڑھ کر وبال ہوتا ہے

پوچھیے حال اُس غریب کا بھی
بھوک سے جو نڈھال ہوتا ہے

اب تو بیدار ہو کے مانگو عتیقؔ
آخرِ شب سوال ہوتا ہے

احمد علی

چکنی چپڑی بات کر کے لوٹ لے سارا جہاں
خصلتیں بنئے سی رکھ اور نام ''دینا ناتھ'' رکھ

سب جرائم پر تو اپنے ڈال پردہ اس طرح
دوسرے اور تیسرے کندھے پہ اپنا ہاتھ رکھ

جھوٹ پر مبنی کہانی سچ بنانے کے لئے
ساتھ رکھ طبلہ نواز اور ہم نوا بھی ساتھ رکھ

سامنے ہمدردیاں کر، پیٹھ میں خنجر گھسیڑ
اس طرح مصروفِ کار اپنے تو دونوں ہاتھ رکھ

رشتوں کو چارہ بنا کے پھانس لے اگلا شکار
ساتھ میں مظلومیت کی بھی تو اپنی ناتھ رکھ

روبینہ شاہین بیناؔ

مجھے کیا دے گا عطائے نگار کا موسم
یہ اِک انار کا اور سو بیمار کا موسم

تمام قومی خزانے تجوریوں میں بھریں
گزر نہ جائے کہیں لوٹ مار کا موسم

مہینہ اینڈ پہ۔۔۔ بجلی کا بل ہزاروں میں
لو پھر ہے چالو ہمارے ادھار کا موسم

میں لے کے بیٹھی ہوئی تھی کتابِ علمِ عروض
تمام رات رہا ہے خمار کا موسم

میاں کے سر کو دبانا پڑا تو ہے لیکن
یہ دردِ سر تو ہے جوتوں کی مار کا موسم

جو بارشوں میں نہانے کا لے لیا پنگا
بھگت رہی ہوں ابھی تک بخار کا موسم

مقابلہ ہے بھلا حُسن کا یا میک اپ کا
عروج پر ہے گلیمر کی وار کا موسم

سنور رہے ہیں جو دولہا دُلہن سے زیادہ لوگ
یہ شادیاں ہیں کہ بیناؔ سنگھار کا موسم

روبینہ شاہین بیناؔ

اصلی ہو یا نقلی سائیں
ڈگری تو ہے ڈگری سائیں

مجھ سے پنگا مت لینا تو
ورنہ قسمت بگڑی سائیں

اردو ٹھیک سے بول نہ پاؤں
کیسے بولوں عربی سائیں

کھو جا قوم کے لفڑے میں تو
کچھ تو پگھلے چربی سائیں

کتے کو یوں دیکھ کے بھاگا
جیسے ہو کوئی گولی سائیں

اک بھی بال نہیں ہے سر پہ
اور ہے جیب میں کنگھی سائیں

ظرف میں نیویں نیویں دیکھے
کلغی جن کی اونچی سائیں

تم کو لوٹا کہہ بیٹھی ہوں
آئی ایم ویری سوری سائیں

نہ پکڑو تو بزنس میرا
پکڑو تو پھر چوری سائیں

اس پہ کیا پھڑ ٹیں ٹیں کرنا
جس کی کھانا چوری سائیں

کھولی کیا این جی او بیناؔ
ہوگئی ان کی چاندی سائیں

خاوری

کھانے کو مرے گھر میں الگ خاک نہیں ہے
اور جسم پہ مہنگائی میں پوشاک نہیں ہے

رشوت سے سبھی کام بنے جاتے ہیں بھیا!
اس دیس میں یہ کام شرمناک نہیں ہے

بیگم نے دبایا ہے بڑی شان سے اس کو
اس دور میں شوہر کی کوئی دھاک نہیں ہے

فیشن بھی کرو خوب مگر دھیان میں رکھنا
یہ اپنا وطن ہے کوئی بینکاک نہیں ہے

مہمان جو بنا ہے تو آجاؤ خوشی سے
کھانے کو مگر دال تو ہے کاک نہیں ہے

اک وہ ہے کہ ٹوتھ پیسٹ سے دانتوں کو ہے مانجھے
اک ہم ہیں ہمارے لیے مسواک نہیں ہے

دولت ہے فقط لیڈرِ جانباز کی میراث
لیڈر نہیں جو صاحبِ املاک نہیں ہے

خاوری

تیغِ چشمِ یار کے آگے نہ آ
دیکھ اس تلوار کے آگے نہ آ

تو نے مرنا ہے تو جاکر مر کہیں
میری موٹر کار کے آگے نہ آ

قوم کے معمار کی تعریف کر
قوم کے معمار کے آگے نہ آ

اپنے کپڑوں کا نہ ستیاناس کر
پان کے نسوار کے آگے نہ آ

افسر بے کار سے کترا کئی
افسر بے کار کے آگے نہ آ

حسن کے سگنل تو دل تک آنے دے
تو مرے راڈار کے آگے نہ آ

بھیڑ میں رکھ اپنی جیبوں کا خیال
بس میں پاکٹ مار کے آگے نہ آ

پلسیوں سے بھول کر اُلجھا نہ کر
یعنی کہ سرکار کے آگے نہ آ

اِسی سے تم نے میرے دل میں پھیر دی جھاڑو
تری نظر نہیں کنجی ہے مال خانے کی (عبدالمغنی سبرنگ)

محمد عاطف مرزا

ماجے لگے ہوئے کہیں گامے لگے ہوئے
چاچے اِدھر ہیں اور اُدھر مامے لگے ہوئے

یوں آج کل ہمارے ہیں کھابے لگے ہوئے
چھٹتے نہیں ہیں منہ سے پراٹھے لگے ہوئے

خوشبو سی ہے فضا میں تو منظر دھواں دھواں
سیخوں پہ کتنی شان سے دنبے لگے ہوئے

تندور میں جو نان تھے لگتے تھے مزے دار
اچھے لگے تھے آگ میں پوچے لگے ہوئے

باتیں عجیب ہوتی ہیں شیمپو کی ایڈ میں
بالوں کے نیچے دیکھ لو گنجے لگے ہوئے

مالی نے باغ کا یہ عجب حال کر دیا
ہیں سیب کے درخت پہ ٹینڈے لگے ہوئے

اوپر گِدھوں کا راج ہے، دیمک تنے میں ہے
نیچے جڑوں کو کاٹنے چوہے لگے ہوئے

محمد ظہیر قندیل

جواں ہوگا مرا گلزار پرسوں
فدا ہوگی تری گلنار پرسوں
بہت مصروف ہے کیوں آج کل وہ
کرے گا اس پہ کچھ گفتار پرسوں
کمیٹی ڈھونڈ لے گی چاند کو جب
کروں گا خوب پھر دیدار پرسوں
الیکشن کا نتیجہ بھی پتا ہے
ذرا سننا مری للکار پرسوں
بیوٹی پارلر والے کہے ہیں
دلھن ہوگی میاں تیار پرسوں
ضرورت آج ہیں رشوت کے پیسے
کروں گا ان سے میں ، انکار پرسوں
وہ دو دن تک مرا مہمان ہو گا
لکھوں گا پھر نئے اشعار پرسوں
وہ تھپڑ مسکرا کر کھا لیا آج
مگر سہلاؤں گا رخسار پرسوں
بہت اچھا ہوا بادل تو برسے
مگر گائی گئی ملہار پرسوں
یہاں کل بھی نہیں دیکھی کسی نے
تمھارا وعدہ ہے ہر بار پرسوں
کہاں ابلیس تنہا قید میں ہے
کھلے گا ساتھ ہی دیں دار پرسوں

دعا اتنی سی ہے یا رب مرے مرنے سے کچھ پہلے
ترا دوزخ گناہ گاروں سے بھر جائے تو اچھا ہے (سحرؔ شیخوپوری)

عتیق الرحمن صفی

اگر مگر کی نہ رٹ لگاؤ تو بات ہو گی
فقط محبت سے مان جاؤ تو بات ہو گی

مٹن کڑاہی اگر کھلاؤ تو بات ہو گی
سدا رکھو گے یہ رکھ کھاؤ تو بات ہو گی

کمال نسخے میں اِس غزل میں بتا رہا ہوں
سمجھ کے اِن کو تم آزماؤ تو بات ہو گی

جو اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر پکارے تجھ کو
اگر تم اُس کو بھی دو لگاؤ تو بات ہو گی

ٹریفکانہ سی حرکتیں ہیں تمھاری ہر دم
مرے بھی سگنل پہ ٹھہر جاؤ تو بات ہو گی

ہماری کھٹ پٹ سے آج منا پھر اُٹھ گیا ہے
سحر تلک اب اِسے سُلاؤ تو بات ہو گی

اگر نہ شوہر ڈرون حملوں سے باز آئے
یہ توپ اپنی بھی تم چلاؤ تو بات ہو گی

کئی دنوں سے تمھارے میسج ہی آ رہے ہیں
مرا یہ نمبر کبھی ملاؤ تو بات ہو گی

یقین جانو کہ ہوش یوں بھی اُڑیں گے سب کے
بغیر میک اپ جھلک دکھاؤ تو بات ہو گی

محبتوں میں بھی دور رہنا چہ معنی دارد
یہ کیپو چینو کبھی پلاؤ تو بات ہو گی

کہا ہے یہ لیلی نے حال مجنوں کا دیکھتے ہی
پلیز جا کر نہا کے آؤ تو بات ہو گی

خبر ملی ہے کہ ہیر رانجھے سے کہہ رہی تھی
بجا کے مُرلی نہ کان کھاؤ تو بات ہو گی

میاں ! یہ دل تم فری میں دو گے تو لاس ہو گا
جو کر لیا کوئی بھاؤ تاؤ تو بات ہو گی

خمارِ گندم، بجنگ آمد، مزاحِ پطرس
یہ نسلِ نو کو اگر پڑھاؤ تو بات ہو گی

مشاعرے میں تمام شاعر ہی آ گئے ہیں
دو چار سامع بھی ڈھونڈ لاؤ تو بات ہو گی

خموش رہنے سے دوریاں ہی صفی بڑھیں گی
ملو جلو تم ہنسو ہنساؤ تو بات ہو گی

وہ بھول کر کبھی جو میرے خواب میں آیا
تو اُس کے والدِ ماجد بھی خواب میں آئے
(محمد یوسف پاپا)

ہاشم علی خان ہمدمؔ

سلفیاں چور کے انداز میں فلمانے کا
شکریہ! آپ کا یوں ساتھ نظر آنے کا

ڈیوٹیاں خوب نبھاتا ہے بڑی بیگم کی
نیک شوہر بھی سپاہی ہے کسی تھانے کا

دال کھانے سے طبیعت میں گرانی سی ہے
آج پھر موڈ ہے پی سی میں ڈنر کھانے کا

خوب پردہ ہے کہ ہاتھوں کو چھپا رکھا ہے
جینز پہ جچتا ہے فیشن ترے دستانے کا

شاپ کیپر نے جو شوکیس میں لا رکھا ہے
وہ سٹیچو ہے مرے دل کے صنم خانے کا

جا بجا شہر میں قائم ہیں سموکنگ سنٹر
یہ نیا دور ہے شیشے کو بھی چلمانے کا

جس کو تم خاص تغافل کی ادا کہتے ہو
وہ تو انداز ہے گل خان کے شرمانے کا

یہ تری آخری ٹکر ہے گلی کے بکرے
عید کا دن ہے تجھے پیٹ میں ڈکرانے کا

ہاشم علی خان ہمدمؔ

کیا حقیقی خوبیاں شوہر میں ہوں
جب مجازی بیویاں دفتر میں ہوں

کیوں نہ مسٹر پیار کے چکر میں ہوں
لڑکیاں جب ان کے پس منظر میں ہوں

شیر جیسی پھرتیاں گیدڑ میں ہوں
خوبیاں ایسی مرے لیڈر میں ہوں

یوں میاں کی ظاہری صورت نہ دیکھ
مے بی اس کے بال گنجے سر میں ہوں

نیسلے کا ملک ہے پہلی غذا
کیا وٹامن پیار کے فیڈر میں ہوں

کہہ رہا تھا ایک مجنوں خواب میں
اس طرح کی بیویاں گھر گھر میں ہوں

فیس بک پر عام ہے وہ اس لیے
رابطے کچھ خاص میسنجر میں ہوں

عقد ثانی کے لیے درکار ہے
سب ادائیں مہ جبیں اختر میں ہوں

کون جائے گا سمندر دیکھنے
بجلیاں جب کاغذی پیکر میں ہوں

جل پری کو دیکھنے کے واسطے
خوبیاں کچھ خاص دیدہ ور میں ہوں

بات سچی ہو مگر کوٹڈ بھی ہو
تلخیاں ہمدمؔ سبھی شوگر میں ہوں

مراد پوری ہوئی آج چل بسے زاہد — سنائے جاتے تھے رہ رہ کے حُور کا قصہ — (ظریفؔ دہلوی)

نویدؔ صدیقی

بہ فیضِ رکشہ پہنچ تو گیا سٹیشن پر
لگا ہوا ہے بدن سارا وائبریشن پر

وہ میرے شوقِ سخن سے خفا نہیں ہوتی
میں اعتراض نہیں کرتا اُس کے فیشن پر

طعام اس کے بھی گھنٹوں کے بعد ملتا ہے
پرنٹ ہوتا ہے جو وقت انویٹیشن پر

وہ چار بیویاں اک گھر میں لے کے بیٹھا ہے
زمانہ گنگ ہے اس آدمی کے پیشن پر

لو! نون ہارگیا ، پی ٹی آئی جیت گئی
مگر پڑے گا کہاں فرق کوئی نیشن پر

معاملات کیے جارہے ہیں طے سارے
سوال اٹھے گا کراچی میں آپریشن پر

کوئی محکمہ نہ جاہل وزیر کو بھایا
سو اس نے ہاتھ رکھا جا کے ایجوکیشن پر

نویدؔ صدیقی

دل کیوں روز بلکتا ہے
شادی ہے یا سکتہ ہے

جلی ہوئی ہانڈی کی بُو
دسترخوان مہکتا ہے

بچہ وزن میں بیس کلو
ساٹھ کلو کا بستہ ہے

بل پے کر دینے کے بعد
گھر میں فاقہ بچتا ہے

فرماتا ہے بس افسر
باقی ہر کوئی "بکتا ہے"

پیسا ہے تو موبائل
لاکھوں میں بھی سستا ہے

ہر شوہر تصویر نما
دور خلا میں تکتا ہے

بوجھ سے درجن بچوں کے
پاؤں نہیں دل تھکتا ہے

تو میکے جائے بیگم
کیا ایسا ہو سکتا ہے

غضنفر علی

گر وہی اور نہیں اور نہیں اور نہیں
پھر کوئی اور نہیں اور نہیں اور نہیں

مجھ کو تاریکی کی عادت ہے شبِ فرقت میں
روشنی اور نہیں اور نہیں اور نہیں

چل چکی تیری بہت دل پہ حکومت میرے
اب تری اور نہیں اور نہیں اور نہیں

ساقیا! درد سے پھٹ جائے گا سینہ میرا
گر ملی اور نہیں اور نہیں اور نہیں

بے زبانی نے گلا گھونٹ کے رکھا تھا میرا
خامشی اور نہیں اور نہیں اور نہیں

توڑنا ہے تو ابھی توڑ دو زنجیروں کو
بے بسی اور نہیں اور نہیں اور نہیں

جس قدر جان لیا تم کو وہی کافی ہے
آگہی اور نہیں اور نہیں اور نہیں

نیاز احمد مجآز انصاری

اِس صدی میں یہ کیسا وبال آگیا
ماہ گزرے نہیں اور سال آگیا

دودھ کی نہر کا جب سوال آ گیا
میں بھی ہاتھوں میں لے کر کدال آگیا

سارے روزے رکھے کے رکھے رہ گئے
سامنے جب وہ رُوئے ہلال آگیا

رکھ کے دس بیس کاندھوں پہ بندوق پھر
کوئی میداں میں مردِ کمال آگیا

جانے کیسی سواری رکھی تھی وہاں
بند کمرے میں بابا کو حال آ گیا

یہ بڑھاپے میں جوشِ جوانی غضب
کیسے باسی کڑھی میں اُبال آ گیا

آج کے عشق کی دین ایسی بھی ہے
مہندی سوکھی نہیں ، نونہال آ گیا

اُس کو جاگیر کیا مفت میں مل گئی
مُردو صورت پہ رنگِ جلال آ گیا

ہے مجآز ایک گنجے کی یہ ٹینشن
کس طرح اُس کے شیشے میں بال آگیا

تب تلک مجھ کو نہ مانے وہ کھلاڑی کھیل کا
جب تلک میری نہ تن سو ساٹھ رنزاں ہو گئیں (امام دین گجراتی)

محمد قمر شہزاد آسی

ہے الرجی اسے نہانے سے
کیوں نہ روکوں میں پاس آنے سے

لوگ بے ہوش ہی نہ ہوجائیں
آپ کے ایسے مسکرانے سے

ہوں میں عاجز انہیں بھگانے سے
ٹک کے بیٹھا ہے زوج کا میکہ

کانپنے لگ گیا جواں کڑیل
آئی آواز جب زنانے سے

فائدہ ہو گیا ہے گانے سے
ہوئے موصول دو عدد جوتے

ہنس رہے ہیں مرے سخن پر وہ
گھر میں رہتے ہیں جو نمانے سے

آئی بیگم سو چپکا رہ آسی
گو تو ڈرتا نہیں زمانے سے

محمد قمر شہزاد آسی

دیکھتا ہوں جدھر سر کٹی لڑکیاں
ہیں گھماتی وہ سر ، سرکٹی لڑکیاں

کھولتا ہوں بڑے شوق سے فیس بک
پر ڈرائیں اُدھر سر کٹی لڑکیاں

سر کٹا کر لگاتی ہیں تصویر کو
دھڑ چھپائیں نہ پر سر کٹی لڑکیاں

کون جاکر انہیں بات سمجھائے گا
خود ہیں اہلِ ہنر سر کٹی لڑکیاں

درجنوں آرہے ہیں کمنٹ منٹ میں
ہیں بڑی معتبر سر کٹی لڑکیاں

دیکھ مت اس طرح دیدوں کو پھاڑ کر
اے میرے دیدہ ور سر کٹی لڑکیاں

خیر اپنی منا میرے سادہ قمر
چھیڑ بیٹھا ہے گر سر کٹی لڑکیاں

عرفان قادر

گر پیش وہ دیدار کا شربت نہیں کرتا
میں اُس سے کبھی ملنے کی حسرت نہیں کرتا!

کھانا تو چلو کھا لے، نہ کھا جائے تو برتن
اے پیٹو! تبھی میں تری دعوت نہیں کرتا

"پُیری ہیں 'وہ' اک دوسرے کے"، مثل ہے مشہور
وہ اس لیے پچو ?لوں کی حمایت نہیں کرتا

ہر کام کیا کرتا ہے وہ وقت پہ بالکل
برتن بھی کبھی دھونے میں غفلت نہیں کرتا

لے آتا ہے مسجد سے نیا اور ہی جا کے
جوتا کبھی ٹوٹے تو مرمت نہیں کرتا

دو جمع دو ہیں چار، یہ رانجھے نے کہا ہے
لگتا ہے ریاضی میں ریاضت نہیں کرتا

ہو اُن کا مقدمہ تو نبٹے دیتا ہے فوراً
میرا ہو مقدمہ تو سماعت نہیں کرتا

سہما ہوا بیٹھا ہے، ابھی ڈانٹ پڑی ہے
سر اپنا کھجانے کو بھی حرکت نہیں کرتا

گھس جائے زباں، "واہ" اگر کہہ دے وہ منہ سے
کنجوس ہمیں داد عنایت نہیں کرتا

عرفان قادر

نہ افغانی مجھے دے دو، نہ ایرانی مجھے دے دو
میں ہوں ملتان کا، بیگم بھی مُلتانی مجھے دے دو
رکھے دیوان جو بھی پاس، کہلاتا ہے دیوانہ
لہٰذا اپنی سب غزلیں، اے دیوانی! مجھے دے دو
میں ہوں اک شوہرِ بدحال، خوشیاں چھین لو میری
تُمہاری ہے یہی فطرت، پریشانی مجھے دے دو
"ثمر" جمہوریت کا ہم نے مل جُل کے ہی کھانا ہے
یہ لے لو آپ "زرداری"، یہ "گیلانی" مجھے دے دو
میں دیسی آدمی ہوں، چائنا کا تو نہیں ہرگز
مبارک ہوں تمہیں "نُوڈلز"، بریانی مجھے دے دو
ہیں بچّے دو ہی اچھے، اختلاف اِس سے ہمیں بھی ہے
مگر یہ کیا؟ کہ ساری نوعِ انسانی مجھے دے دو!
زمانے کے حوادث نے، خدا مجھ سے جو کر ڈالا
وہ میرا دوست "ربانی"، وہ "گنجانی" مجھے دے دو
نہیں انکار کر سکتا کہ ڈر لگتا ہے سینڈل سے
پڑے گی کھیر یہ بد ذائقہ کھانی، مجھے دے دو
لگا رکھا ہے اک راشی نے دروازے پہ یہ نوٹس
نہیں کچھ جبر، جتنا ہو بآسانی، مجھے دے دو
ظرافت کے چمن میں جب بہار آئی تو تتلی نے
کہا، چپکے سے، تھوڑا رنگِ عرفانی مجھے دے دو

شوکت جمال

سیاستداں بچارے کی پریشانی نہیں جاتی
خریدی اس نے جو ڈگری، کہیں مانی نہیں جاتی

لڑکپن سے ہی غالب کی طبیعت عاشقانہ تھی
لگی ہولت جو بچپن سے با آسانی نہیں جاتی

مرے دادا کی نانا سے ہوئی جس روز سے ان بن
اِدھر آتی نہیں دادی، اُدھر نانی نہیں جاتی

قلم، تختی، سیاہی طاق نسواں کی ہیں اب زینت
مگر یادوں سے جو مٹی تھی ملتانی، نہیں جاتی

بھٹکتی ہیں نگاہیں شیخ جی کی "مال" میں لیکن
کسی بھی حال میں بیگم کی نگرانی نہیں جاتی

جھپٹ کر کھال وہ بولا، ثواب اس کا ہی پاؤ گے
وہاں کھالیں ہی جاتی ہیں، یہ قربانی نہیں جاتی

لگاتا ہے کئی چکر ڈرائنگ روم کے شوکت
پڑھا کر جب تلک بچوں کو استانی نہیں جاتی

شوکت جمال

(ایک غیر حیدر آبادی کی حیدر آبادی غزل)

نہ تم بیٹھا کرو سٹ کو، یہ کِتی بار بولے ہم
رہو ہم سے ذرا ہٹ کو، یہ کِتی بار بولے ہم

مِنارے پر پولیس والا ئمیں چڑھنے دیا تو کیا
چلو اب جھاڑ کو لٹکو، یہ کِتی بار بولے ہم

"کِدر کو جارئیں حضت" یہ پوچھا میں تو وہ بولے
"ترے کو کیا، رے منہ پٹ کو"، یہ کِتی بار بولے ہم

پلیٹ اِک کھا کو بریانی، میں بولا ہور اِک ہونا
کہ کھانا آج ہے ڈٹ کو، یہ کِتی بار بولے ہم

غرض نکو ہے کوئی ہور، بس ہم تو ترس رئیں جی
تمہاری مسکراہٹ کو، یہ کِتی بار بولے ہم

وخت کِتا لگا تیٔں تم، کہیں جاتے وخت بیگم
بناوٹ کو سجاوٹ کو، یہ کِتی بار بولے ہم

"سلامی پہلے ہونا جی" دُلہن شرما کے یہ بولی
اُٹھائے تب ہی گھونگھٹ کو، یہ کِتی بار بولے ہم

ترا پکّا گلی میں ہم کو تاڑا ترچھی نظراں سے
ذرا سمجھا لے ترپٹ کو، یہ کِتی بار بولے ہم

بگھارئیں آج پھر بینگن، الرجی ہے ناں ہم کو جی
بھجاتیٔں ہم کو مرگھٹ کو، یہ کِتی بار بولے ہم

بس اُپّر والے کو ہی یاد کرتے بیٹھنا شوکت
پکڑ لیو اب تو شوکت کو، یہ کِتی بار بولے ہم

اقبال شانہ

شوہر ہوں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں میں
وہ سو رہی ہے اور ہوا کر رہا ہوں میں

بیوی خدا کے فضل سے با روزگار ہے
عورت کی نوکری پہ مزا کر رہا ہوں میں

جاری رہے گا دیکھئے کب تک یہ سلسلہ
وہ معاف کر رہی ہے خطا کر رہا ہوں میں

اس کا خیال دل سے نکالا ہے اس طرح
چمڑے کو جیسے تن سے جدا کر رہا ہوں میں

میں ڈاکٹر ہوں شہر کا مانا ہوا جناب
پیشنٹ مر رہا ہے دعا کر رہا ہوں میں

جو جانتا نہیں ہے سیاست کی دُم جناب
امیدوار ایسا کھڑا کر رہا ہوں میں

شانہ چُرا چُرا کے کلامِ اساتذہ
اہلِ سخن کی صف میں جگہ کر رہا ہوں میں

احمد علوی

سرچ گوگل پہ کیا عید کا چاند
پھر بھی ہم کو نہ ملا عید کا چاند

تو جو کوٹھے پہ نظر آ جائے
میں تو دیکھ لیا عید کا چاند

ہو گئی عید شہر میں سب کی
ایک لمحے کو دکھا عید کا چاند

پہلے ہم آسماں کو تکتے تھے
اب کے ٹی وی پہ ملا عید کا چاند

تیسواں روزہ ہے بھاری مجھ پر
آج دکھلا دے خدا عید کا چاند

ایک ملّاں نے کیوں ڈھونڈ لیا
ہم نے ڈھونڈا، نہ ملا، عید کا چاند

احمد علی برقی اعظمی

ہوں وہ باہر یا کہ اپنے گھر میں ہوں
ایسا لگتا ہے کسی چکر میں ہوں

بھانپ لیتی ہے یہ بیوی دیکھ کر
"لڑکیاں جب اس کے پس منظر میں ہوں"

سر پہ وہ ڈھوتے ہیں یوں بیوی کا بوجھ
خصلتیں ایسی ہیں جیسے خر میں ہوں

کرتے ہیں لیڈر جو ایوانوں کے بیچ
ہے دعا جھگڑے نہ ایسے گھر میں ہوں

ڈارون نے دیکھیں جو انسان میں
شائد ایسی خوبیاں بندر میں ہوں

ہے گلوبل وارمنگ کا ایسا زور
لوگ جیسے عالمِ محشر میں ہوں

ان کی آنکھوں میں ہے برقی وہ سرور
کیف جیسے شیشہ و ساغر میں ہوں

نوؔر جمشید پوری

نہ جیت پایا الیکشن مگر لڑا برسوں
خزانہ باپ کی دولت کا تھا اڑا برسوں

پسند اس کو جو اپنی بتائی بیگم نے
ہر ایک شام میاں مچھلیاں تلا برسوں

اسے تو چائے پلنگ پر ہی پیش کرنے کو
صبح کو بیوی سے پہلے ہی وہ جگا برسوں

بھلا ہو یا کہ برا بیوی جو بھی کہہ دیتی
خموش سر کو جھکائے ہی وہ سنا برسوں

ہر ایک حکم کی تعمیل پر وہ بیگم کی
بس ایک پاؤں پہ ہر دم کھڑا رہا برسوں

ادھار اس نے لیا تھا اسی لئے شاید
جہاں بھی دیکھا مجھے ہر جگہ چھپا برسوں

امیر بن کیلو بیٹھا ہے ایک نسخے سے
ہر ایک میچ کی فکسنگ ہی وہ کیا برسوں

لو آج ہو ہی گئی چوری اس کی مسجد سے
چھپا کے جوتیاں وہ جب کہ تھا رکھا برسوں

کہے جو نوؔر نے اشعار کچھ ظرافت کے
زمانہ جب بھی سنا خوب وہ ہنسا برسوں

مکانِ حشر میں کوچے میں اور طویلے میں ‏ ‏ کہاں کہاں ترا وحشی تجھے پکار آیا ‏ ‏ (آزؔاد بدایونی)

طاہر محمود

حکمراں صاحبِ کردار بھی ہو سکتا ہے؟
سچ پہ مبنی کوئی اخبار بھی ہو سکتا ہے؟

برق آنے کی نہیں ، بل تو برابر آئے
ورنہ یہ قمقمہ بیکار بھی ہو سکتا ہے

اس حسینہ کے جو گالوں میں پڑا ہے ڈمپل
پان ہو سکتا ہے نسوار بھی ہو سکتا ہے

فیس بک پہ جو حسینہ ہے کماری بیگم
خان ہو سکتا ہے سردار بھی ہو سکتا ہے

اک ذرا دریا میں گر ڈال دو تم نیکی کو
بیٹا تیرا بڑا بینکار بھی ہو سکتا ہے

یو۔ پی۔ ایس تم جو اٹھا لائے ہو سستا کر کے
ایک دو دن میں یہ بیکار بھی ہو سکتا ہے

ڈاکٹر سید مظہر عباس رضوی

کہ جیسے آیا تھا ہم پر شباب قسطوں میں
لگاتے ایسے ہیں ہم بھی خضاب قسطوں میں
ہے صبح ہاسپٹل میں تو شام میں ہے مطب
طبیب ہوتے ہیں گھر دستیاب قسطوں میں
ہے زندگانی بھی اک سیریئل تو بی۔اے میں
بُرا نہ مانیں جو ہوں کامیاب قسطوں میں
یہ فربہی کے ہی اندازِ دلربائی ہیں
جو ہوتے بس میں ہیں وہ ہمرکاب قسطوں میں
خریدا گھر کا ہے سامان سارا قسط بہ قسط
پلادے ساقیا تو بھی شراب قسطوں میں
سماعتوں کو ڈراتا ہے اُن کا ہکلانا
یہ سہنا پڑتا ہے ہم کو عذاب قسطوں میں
بنایا سود کے چکر نے ہم کو گھن چکّر
وہ خان کرگیا خانہ خراب قسطوں میں
عمر رسیدوں کو آتی ہے کب سکون کی نیند
بڑھاپا اُن کو دکھاتا ہے خواب قسطوں میں
ہیں ووٹ والے کبھی اور بُوٹ والے کبھی
پڑھائیں دونوں سیاسی نصاب قسطوں میں
ہے فیس بک سے ہی فرصت نہیں ہمیں اب تو
پڑھیں گے آپ کی مظہر کتاب قسطوں میں

اللہ پاک اُن کو حاکم تو نہ بنانا کتے کی طرح جن کو آتا ہے کاٹ کھانا (بیڈھب بدایونی)

شہزاد قیس

ریاضیات میں سر ، دھڑ کھپایا کرتا تھا
میں کاپی لکھتے ہُوئے کپکپایا کرتا تھا
جو مَس کے پوچھتا تھا کام چیک ہُوا تھا آج ؟
'' جواب میں کوئی آنسو بہایا کرتا تھا ''
پرندے بھی میں بناتا تھا ، پر اَکیلے میں
میں کاپیوں پہ بڑا کچھ بنایا کرتا تھا
گلی کے بیچ میں دو کمرے منہ چڑاتے ہیں
'' یہ راستہ تو کہیں اور جایا کرتا تھا ''
فقیر جلدی سے نوٹ اَپنے گننے لگتے تھے
میں جب خرید کے اَمرُود کھایا کرتا تھا
لڑاکی مالکہ کے موٹے لاڈ پرور کو
میں جیب خرچ سے سگریٹ پلایا کرتا تھا
نجانے سر جی کیوں ڈگنی پٹائی کرتے تھے
میں زیرِ لب بھی اَگر بڑبڑایا کرتا تھا
ہمارا ماسٹر ذہنی غریب تھا اِتنا
کلاس پوری کو مرغا بنایا کرتا تھا
بہت ہی رات گئے تک نتیجے والے دِن
میں دادا ابّو کی ٹانگیں دَبایا کرتا تھا
جو آج دو بجے شب لوٹا تو خیال آیا
میں گھنٹی بجتے ہی گھر دوڑ جایا کرتا تھا
ہر ایک ہاتھ پہ چھپ جاتا تھا کیو فار قیس
میں چاند رات پہ مہندی لگایا کرتا تھا

محمد سبکتگین صبا

سب کے سب ہیں کورے لٹھے
نہلے ، دہلے ، ستے ، اٹھے
بھوکی ننگی قوم کے دیکھو
لیڈر ہیں سب ہٹے کٹے
بھان متی نے کنبہ جوڑا
اک تھیلی کے چٹے بٹے
وعدوں کی بھرمار تو دیکھو
کھٹے مِٹھے ، مِٹھے کھٹے
سب کی اپنی اپنی ٹانگیں
سب کے اپنے اپنے پھٹے
قوم کے لوگوں کا یہ عالم
پیر میں چھالے، ہاتھ پہ گٹے
ہڈی، ہڈی، لڑنے والے
کون انہیں اب ڈالے پٹے
چمنی ان کی رہے سلامت
بیٹھیں چاہے سب کے بھٹے
قوم کو کیا تعلیم کریں گے
پاس ہُوئے جو مار کے رٹے
جانے کون اُستاد ہے اِن کا
جانے ہیں یہ کس کے پٹھے
کس کا شکوہ کریں صباؔ جی
اپنی بیڑی، اپنے وٹے

محمد خلیل الرحمٰن

جیون میں اِک بار آنا سنگا پور

پہلی قسط

یوں تو دلشاد بیگم کا دعوت نامہ'' جیون میں ایک بار آنا سنگاپور'' ہمیں کافی عرصے سے دعوتِ گناہ دے رہا تھا، لیکن جس بات نے ہمارے جذبۂ شوق پر مہمیز کا کام دیا وہ کچھ اور تھی۔ ہوا یوں کہ ہم شب و روز کی یکسانیت سے تنگ آگئے۔ ڈاکٹروں اور طبیبوں کو دکھایا، مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ جب ہمیں یقین ہوگیا کہ

مرا علاج مرے چارہ گر کے پاس نہیں

تو علاج کیلیے قدیمی حکما کے نسخوں کو ٹٹولا۔ کرنل شفیق الرحمن دور کی کوڑی لائے۔

'' تم اس جمود کو توڑتے کیوں نہیں۔ صبح اٹھ کر رات کا کھانا کھایا کرو، پھر قیلولہ کرو۔ سہہ پہر کو دفتر جاؤ، وہاں غسل کرواور اور سنگل روٹی کا ناشتہ۔ حجام سے شیو کرواؤ اور حجام کا شیو خود کرو۔۔۔''

یہ بھی کر دیکھا، مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ آخر کار تنگ آ کر دو ہفتہ کی چھٹی کے لیے درخواست داغ دی۔ جواب آیا'' آپ کی چھٹی کی درخواست نامنظور کی جاتی ہے، اس لیے کہ کمپنی اس عرصے میں آپ کو تربیت کے لیے سنگاپور بھیج رہی ہے۔۔۔''

کوئی جل گیا، کسی نے دعا دی۔ زادِ سفر کا مرحلہ درپیش ہوا تو دوستوں سے مشورہ لیا۔ سیر کے لیے فلاں فلاں جگہیں ہیں۔ خرید و فروخت کے لیے فلاں فلاں، اور کھانے کے لیے فلاں فلاں ریسٹورینٹ۔ اور مساج کے لیے فلاں فلاں سنٹر۔ اور دیکھو، آرچرڈ روڈ سے کچھ مت خریدنا، اور نہ ہی اپنے ہوٹل کیمساج سنٹر سے مساج کروانا، یہ دونوں جگہیں مہنگی ہیں۔ فلاں اسٹریٹ سے بچنا، وہاں رات گیے وہ لوگ اپنا بازار لگاتے ہیں جو ہیوں میں نہ شیوں میں۔

ایک صاحب کہنے لگے،'' سنگاپور سے مساج ضرور کروا کے آنا''۔'' اور دیکھو!'' انھوں نے تاکیداً کہا،'' واپسی پر جھوٹ نہ کہنا کہ مساج کروا آئے ہو۔ مجھے اسکے تمام لوازمات معلوم ہیں۔''

بھاگے بھاگے ایک اور دوست کے پاس پہنچے اور'' مساج کے لوازمات'' معلوم کیے، تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔

بڑی ردّ و قدح کے بعد، جس زادِ سفر کا اہتمام کیا وہ یہ تھا۔ دوستوں کے مشوروں کا سوٹ کیس وزن بیس کلو اور ساتھ سفری بیگ میں کچھ کپڑے وغیرہ۔

ضروری کارروائیوں کے بعد پروانہ اور پر پرواز ہمیں عطا کر دیے گئے۔ اور یوں ہم اسلام آباد سے سنگاپور کی طرف عازمِ سفر ہوئے۔ راستہ میں ایک کالی بلی راستہ کاٹ گئی تو ہم نے اس نحوست کے تدارک کے لیے پہلے پشاور جانے کا فیصلہ کرلیا۔ یوں بھی خالہ خالو ہمارے قریب ترین رشتہ دار تھے۔ (یہاں ہمارا

مقصد اسلام آباد میں رہتے ہوئے مکانی فاصلہ کی قربت ہے)۔

پشاور پہنچے تو خالہ اور خالو ہمیں دیکھ کر کھل اٹھے۔ یہ آج سے کوئی بیس بائیس برس اُدھر، اُن دنوں کا ذکر ہے جب آتش بھی جوان تھا اور ہم بھی۔ پہلی پہلی نوکری ملی تھی اور اس سلسلے میں ہم اسلام آباد میں، اپنے گھر، کراچی اور اپنے خاندان سے دور کالے پانی کی سزا کاٹ رہے تھے۔ راول جھیل کے اسی کالے پانی میں اپنی گاڑی دھونے کے لیے کبھی کبھی جایا کرتے۔ خیر صاحب خالہ خالو نے دیکھا، حال چال دریافت کیے، تو ہم پھٹ پڑے۔ فوراً اگل دیا کہ ہم سنگاپور جارہے ہیں۔ خالو نے حیران ہوکر ہمیں دیکھا اور پھر ہمارے زادِ سفر کی جانب نگاہ کی، کہنے لگے۔'' اور میاں! تمہارا باقی سامان کہاں ہے؟'' ہم ہنس دیے، ہم چپ رہے، منظور تھا پردہ ہمیں۔ مشوروں کے اس سوٹ کیس کے بارے میں انھیں کیسے بتلاتے۔ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے تو کیا، البتہ سنگاپور کی بے پردہ بیبیوں کے نام آتے تھے، اور پھر یہ مشورے قابلِ گردن زدنی تو نہیں البتہ قابلِ گرفت ضرور تھے، اور ان پر '' صرف بالغان کے لیے'' کا ٹیگ لگانا پڑا تھا، اور اس محفل میں ان کا تذکرہ مخربِ اخلاق ضرور گردانا جاتا۔

خیر صاحب، خالو جان ہمارے اس مختصر زادِ راہ کو دیکھ کر باغ باغ ہوگئے۔ کہنے لگے'' اور ایک ہماری بیٹی صاحبہ ہیں، کہ وہ جب دو ہفتوں کے لیے آسٹریلیا گئیں تو تین سوٹ کیس ان کے ساتھ گئے اور پانچ سوٹ کیس واپس آئے۔''

کراچی پہنچے تو کراچی ائر پورٹ پر ہمارے ساتھ دو حادثے پیش آئے۔ دوستوں کے مشوروں کا سوٹ کیس اور پیانہ؟ صبر، دونوں ہی کھوئے گئے اور

چودھری صاحب ہمارے ہم سفر بنادیے گئے۔

کراچی پہنچ کر ایک دن کا آرام ملا تو کشاں کشاں گھر پہنچے اور گھر والوں کو یہ مژدہ جاں فزاء سنایا کہ ہم سنگاپور جارہے ہیں۔ گھر والوں نے دعا دی۔

'' شکر ہے کہ اب تمہیں سنگاپور کی نوکری ملی۔ جس طرح پیٹھ دکھاتے ہو اسی چہرہ بھی دکھاؤ''۔

'' چہرہ تو ہم تین ہفتے بعد ہی دکھادیں گے۔ تین ہفتے کا تربیتی کورس ہے سنگاپور میں، کوئی مستقل نوکری تو نہیں۔ پار سال جب ہم جرمنی گئے تھے تو وہاں کوئی مستقل نوکری تھوڑا ہی تھی، چند ہفتے کی تربیت بھگتا کر واپس لوٹے تھے۔''

بہر حال یہ خوشخبری بھی اپنی جگہ خوب تھی۔ سنگاپور کا تین ہفتے کا سفر۔ سب خوش ہوئے اور اگلے روز خوشی خوشی ہمیں رخصت کیا۔ ہمارے سنگاپور کے سفر کے لیے کمپنی کی جانب سے تھائی ائر کی فلائیٹ پہلے ہی سے بک تھی۔ جہاز پر پہنچے تو اندازہ ہوا کہ اک غولِ بیابانی ہے جو ہمیں اڑائے لیے چلا ہے۔ ذکر ان پری وشوں کا اور پھر بیاں اپنا۔ کیا کیا بتائیں اور کہاں تک سنائیں۔ ہم اور چودھری صاحب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے ان پری وشوں کی بلائیں لیا کیے۔ جانے کب جہاز اڑا اور جانے کب بنکاک ائر پورٹ پر پہنچ گیا۔ ہمیں خبر ہی نہ ہوئی۔

ائر پورٹ پر امیگریشن کاونٹر سے فارغ ہوئے تو رات کے ڈیڑھ بج رہے تھے۔ اب اگلی دوپہر دو بجے تک کے لیے ہم فارغ تھے۔ فوراً انفارمیشن سے رجوع کیا اور ان کے مشورے سے رات کے لیے ایک ہوٹل پسند کرلیا اور وہیں پر اگلے دن صبح ایک عدد ٹور کا انتظام بھی کرلیا۔ ٹیکسی پکڑ کر ہوٹل پہنچے، اور کمرے میں جا کر اگلی صبح تک یوں انٹا غفیل ہوئے کہ اگلی صبح ناشتے کے لیے بڑی مشکل سے آنکھ کھلی۔ فوراً تیار ہوکر لاونج میں پہنچے، ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ہمیں ٹور گائڈ کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ ٹور گائڈ کو دیکھا تو باچھیں کھل گئیں، یہ ایک خوبصورت سی خاتون تھیں۔ ان

دیکھ کل ان کی طرف شیخ رہا، تو بولے خوبیِ قسمت کی، ہوا مجھ پہ مچھندر عاشق (انشاء اللہ خان انشاء)

خوبصورت خاتون کی معیت میں تو ہم کہیں بھی جانے کے لیے تیار ہو جاتے، یہ تو پھر بھی بنکاک کے مشہور بدھ عبادت گاہوں کا ٹوور تھا۔ آج سے کم وبیش بیس سال پہلے کا بنکاک ویسے تو یوں بھی بہت خوبصورت تھا، لیکن ان خوبصورت عبادت گاہوں نے تو اسے چار چاند لگا دیے تھے۔ ان تین گھنٹوں میں ہم نے چار عبادت گاہوں کا دورہ کیا جن میں گولڈن ٹمپل اور ٹمپل آف ریکلائیننگ بدھا بہت خوب تھے۔ بدھا کے یہ سنہری مجسمے جوان عبادت گاہوں میں تھے، بہت بلند و بالا تھے لیکن ہم ان کا موازنہ لاہور میوزیم میں رکھے ہوئے اس مجسمے سے کر رہے تھے جس میں بدھا کو درخت کے نیچے تپسیا کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہ چھوٹا سا مجسمہ اپنی خوبصورتی اور صناعی کا یقیناً ایک اعلیٰ نمونہ ہے، اور بنکاک کے ان عبادت گاہوں میں بنائے ہوئے یہ عالی شان مجسمے اس کے سامنے ہیچ تھے۔ ادھر چھوٹے چھوٹے مجسموں کی شکل میں بدھا کی زندگی کے حالات بھی منقش کیے گیے تھے۔ ایک طرف تو انسانی کاری گری کے یہ اعلیٰ نمونے تھے اور دوسری طرف انسان تھے جو اپنے ہی بنائے ہوئے ان مجسموں کی عبادت کر رہے تھے۔ کتنا بڑا ظلم تھا اس انسان کے ساتھ، جو انھیں انسانیت سکھانے اور اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیان کے پاس آیا اور ان ظالم لوگوں نے اس کی ہی پوجا شروع کر دی۔

ظلم کی اس داستان میں جو ظلم ہمارے ساتھ ہوا وہ بھی ساتھ ساتھ بیان کرتے چلیں۔ جب ہم سنگاپور کا سفر ختم کر کے واپس پاکستان پہنچے اور یار دوستوں نے اس سفر کا حال دریافت کیا اور ان کراس پر ترجبے کیے تو ہمیں حقیقتِ حال کا ادراک ہوا۔ دراصل کمپنی والے نوجوان لوگوں کی خواہشات کے عین مطابق انھیں بنکاک میں ایک دن کا حضر عطا فرمایا کرتے تھے، تا کہ نوجوان اپنے دل کی تسلی کر لیں۔ ہم اور آگے بڑھے اور اس ہوٹل کا تذکرہ کیا جہاں پر ہم نے رات قیام کیا تھا، تو سننے والوں نے سر پیٹ لیا۔ یہی تو وہ علاقہ تھا جہاں پر ہم کچھ 'دل پشوری' کر سکتے تھے۔

خیر صاحب، ولے بخیر گزشت۔ بنکاک کی سیر سے فارغ ہوئے تو فوراً ہوٹل کا حساب بیباق کیا اور ائر پورٹ کی جانب دوڑ لگائی تا کہ سنگاپور کی جانب عازمِ سفر ہو سکیں۔ باقی سفر جو نسبتاً مختصر تھا آرام سے گزر گیا اور ہم سنگاپور ائر پورٹ پر اتر گئے۔ ائر پورٹ پر پاسپورٹ اور امیگریشن کی لائن میں لگے ہوئے نہایت انہاک سے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے کہ اچانک ایک باوردی آفیسر نے ہمیں لائن سے علیحدہ ہونے کا اشارہ کیا اور اپنے ساتھ لے کر ایک جانب کو چل دیا۔ ہم حیران تھے کہ یا الٰہی یہ ماجرہ کیا ہے، کیوں اس آفیسر نے ہمیں ساتھ لے لیا ہے۔ ابھی ہم اس سے پوچھنے کے لیے اپنی انگریزی کو آواز دے ہی رہے تھے کہ وہ ہمیں لے کر ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے ایک اور آفیسر کے سامنے ایک پٹھان بھائی بیٹھے تھے، یہ بھائی صاحب پشتو اور ٹوٹی پھوٹی اردو کے علاوہ اور کچھ نہ جانتے تھے اور یہاں سنگاپور میں کپڑا خریدنے آئے تھے۔۔ ہم نے فوراً مترجم کے فرائض سنبھال لیے اور ان حضرت سے ان کے بارے میں پوچھ پوچھ کر آفیسر حضرات کو بتانے لگے۔ یہ مسئلہ حل ہوا تو ہم پھر اپنی لائن میں جا کر لگ گئے اور اس طرح سنگاپور کا ایک ماہ کا ویزہ لگوا کر ہی دم لیا۔ ادھر چودھری صاحب ہم سے پہلے ہی فارغ ہو کر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہمارے فارغ ہونے پر وہ بھی ہمارے ساتھ چل پڑے، ہم دونوں نے اپنا سامان سنبھالا اور ٹیکسی کی لائن میں کھڑے ہو گئے۔ نہایت اعلیٰ درجے کی گاڑیوں کو ٹیکسی کے طور پر کھڑے دیکھ کر ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ کہیں ہم وی وی آئی پی یعنی کوئی بہت ہی اعلیٰ شخصیت تو نہیں ہو گئے؟ اپنے بازو پر زور سے چٹکی لی تو درد کی شدید لہر اور 'سی' کی اپنی ہی آواز نے ہمیں جتلا دیا کہ ہم خواب نہیں دیکھ رہے ہیں بلکہ سنگاپور کی ٹیکسی میں سفر کیا چاہتے ہیں۔ ہم نے اپنی اُسی افلاطونی انگریزی کو آواز دی جس کے ذریعے ابھی ابھی ہم ایک معرکۂ عظیم طے کر کے آ رہے تھے اور بھاؤ تاؤ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ خدا جانے یہ ٹیکسی ڈرائیور ہمارے ہوٹل کی جانب جانا چاہتا ہو یا اس کا ارادہ کسی اور جانب کا ہے؟ کیا جانیے وہ منھ پھاڑ کر کتنے پیسے مانگے؟ کیا ہمیں کوئی سستی ٹیکسی مل سکتی ہے؟ ہم ابھی اسی ادھیڑ بُن میں تھے کہ ٹیکسی ڈرائیور نے بھاؤ کیا اور نہ تاؤ، بلکہ یوں کہیے کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ اور نہایت

ادب سے ہمارا سامان ڈگی میں رکھا، ہمیں گاڑی میں بٹھایا اور میٹر پر لگے ایک بٹن کو دبا کر چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

اور صاحبو! یوں ہم 'اپر بوکے تیما روڈ' پر واقع 'نوو ٹیل آرکڈ اِن' نامی ایک نہایت عالیشان ہوٹل میں پدھارے۔ بکنگ کلرک مصروف تھا۔ اس نے نہایت ادب سے ہمیں ایک میز کی جانب بلایا اور ہمیں بٹھا کر ایک سنگاپوری حور کو آواز دی، وہ حسن کی دیوی فوراً ہماری جانب لپکی اور اپنی ایک ٹانگ لبادے سینکال، کاغذ پینسل سنبھال، ہمارا آرڈر لینے کے لیے تیار ہو گئی۔ ہم نے کنکھیوں سے اس شمشیرِ برہنہ کی جانب دیکھتے ہوئے اک شانِ بے نیازی کے ساتھ آرینج جوس کا حکم صادر فرمایا۔ چودھری صاحب نے بھی کنکھیوں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے 'وہی وہی' کی آواز نکالی۔ حسنِ بے پروا نے فوراً اپنے کاغذ پر کچھ لکھا اور اسے لپیٹتی ہوئی آگے چلدی۔ ہم یوں چونکے گویا ابھی ابھی ہماری آنکھ کھلی ہو۔ ہم نے چونک کر چاروں جانب دیکھا۔ ہمارے اطراف رنگ و نور کی اک عجیب دنیا پھیلی ہوئی تھی۔ تو یہ سنگاپور ہے، ہم نے ترنگ میں آکر سوچا۔

ہم نے آرینج جوس کے ہلکے ہلکے گھونٹ لیتے ہوئے چیک اِن کیا اور اپنیا پنے کمرے میں جا کر ڈھیر ہو گئے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ بعد جب ہوش ٹھکانے لگے اور رات کی بے آرامی کا کچھ مداوا ہوا تو دوپہر کے کھانے کا خیال دل کو ستانے لگا۔ ہوٹل کا کھانا بہت مہنگا پڑتا لہٰذا دونوں دوست ہوٹل سے نکلے اور کسی سستے ریسٹورینٹ کی تلاش شروع کی۔ دور دور تک ایسے کسی ریسٹورینٹ کا پتہ نہ چلا تو تھک ہار کر واپس ہوئے ہی تھے کہ ایک اسٹور پر نظر پڑی۔ چودھری صاحب نے مسکرا کر ہمیں معنی خیز نظروں سے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں، ''اب دیکھو! میں کیا کرتا ہوں''۔ ایک عدد ڈبل روٹی خریدی اور ہمیں لیے ہوئے اپنے کمرے کی جانب آگئے۔ کمرے میں پہنچ کر دروازہ لاک کیا اور اپنے سوٹ کیس میں سے ایک عدد بجلی کی ہیٹنگ راڈ برآمد کی، اسے قریب ترین بجلی کے ساکٹ میں لگا کر اس کا سرا ایک پانی کے برتن میں ڈال دیا۔ پانی گرم ہونا شروع ہوا، اتنے میں انھوں نے اپنے سوٹ کیس سے 'احمد' کا کوفتوں کے سالن کا سربند کین نکالا، اسے پانی میں رکھ کر خوب گرم کیا اور اسے کھول کر پلیٹ میں ڈال دیا۔ اس طرح ہم نے اس دوپہر اپنی بھوک مٹائی اور سیر کے لیے نکل پڑے۔ آج اتوار تھا اور ہم نے سن رکھا تھا کہ سنگاپور میں ایک جگہ 'لٹل انڈیا' نامی بھی ہے جہاں ہندوستانی کھانوں کے سستے ریسٹورینٹ موجود ہیں نیز یہ کہ وہاں پر دکانیں اتوار کے دن بھی کھلی رہتی ہیں۔

بس کے ذریعے سرنگون روڈ کے اسٹاپ پر اترے تو کچھ اور ہی سماں تھا۔ ہر طرف سجی سجائی ہندوستانی طرز کی دکانیں موجود تھیں جن میں قسم قسم کی ہندوستانی اشیاء فروخت کے لیے موجود تھیں۔ کہیں زرق برق بھڑکیلی، بنارسی ہندوستانی ساڑھیاں اور دیگر ہندوستانی کپڑے، کہیں سونے اور چاندی کے جڑاؤ زیور۔ کہیں ہندوستانی موسیقی پر مبنی کیسٹ اور سی ڈیاں۔ اور ان دکانوں کے درمیان خالص ہندوستانی کھانے سرو کرتے ریسٹورینٹ۔ کہیں روا ڈوسا اور مسالہ ڈوسا، کہیں اڈلی وڑہ، کہیں تھالی ریسٹورینٹ، جہاں پر آپکی پسند کے مطابق اسٹیل کی تھالی میں یا کیلے کے پتے پر کھانا دیا جاتا ہے۔ کہیں صرف ویجیٹیرین یعنی سبزیوں والے کھانے، کہیں بسم اللہ بریانی۔ کہیں ہندوستانی مٹھائیاں۔ چوک سے چلنا شروع کیا تو ایک جگہ 'مصطفےٰ اینڈ شمس الدین کی دکان نظر آئی۔ یہ ان کی سب سے پرانی دکان ہے۔ نظارہ کرتے چلے تو لطف آگیا۔ یوں تو اس سڑک کا نام سرنگون روڈ ہے لیکن اطراف میں چونکہ ہر طرف ہندوستانی آباد ہیں اور ان ہی کی دکانیں نظر آتی ہیں، لہٰذا اسے لٹل انڈیا یعنی 'چھوٹا ہندوستان' کہا جاتا ہے۔ یہ بازار یونہی پھیلتا ہوا اگلے چوک تک پہنچتا ہے جہاں پر اُس زمانے میں سرنگون پلازہ میں مصطفےٰ اینڈ شمس الدین کا بڑا اسٹور ہوتا تھا، اب اس جگہ، اس سے بھی بڑا مصطفےٰ سنٹر ہے۔ مصطفےٰ سنٹر اب ایک بہت بڑا ملٹی اسٹوری ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہے جہاں ضروریاتِ زندگی کی تقریباً ہر چیز ملتی ہے۔ آجکل، جب سے زمین دوز ٹرین (جسے مقامی لوگ ایم آر ٹی یعنی ماس ریپڈ ٹرانزٹ کہتے ہیں) چلی ہے اس کے دو اسٹیشن سرنگون روڈ پر ہیں۔ ایک بکے تیما روڈ اور سرنگون روڈ کے سنگم پر اور دوسرا مصطفےٰ سنٹر سے

صرف چند قدم کے فاصلے پر۔سرگون روڈ پر چلتے ہوئے راستے میں ایک ہندو مندر اور مصطفیٰ سنٹر کے عین سامنے انگولیا مسجد واقع ہے،بھی نظر آتے ہیں۔اتوار کو تو یوں لگتا ہے گویا سڑک پر ایک جلوس چل رہا ہے۔ہندوستان اور پاکستان سے آنے والے زیادہ تر اسی علاقے میں پہنچ کر کھانا کھاتے ہیں اور اپنی زیادہ تر خریداری یہیں سے کرتے ہیں۔بسم اللہ ریسٹورینٹ میں ایک بزرگ ویٹر کے طور پر کام کرتے ہیں، ان سے گفتگو کی تو پتہ چلا کہ 'مصطفیٰ بھائی' ہندوستان سے آئے تو شروع میں ایک ٹھیلا لگاتے تھے، ایک صاحب اپنی دکان بیچ کر ہندوستان جا رہے تھے۔مصطفیٰ بھائی نے ان سے دکان خریدلی۔اللہ نے برکت دی اور کاروبار اتنا بڑھا کہ اب ماشاء اللہ مصطفیٰ سنٹر چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے اور روز آنہ ہزاروں خریدار خریداری کے لیے آتے ہیں اور لاکھوں کی خریداری کرتے ہیں۔

وہیں سے کٹ مارا اور سیدھے ہاتھ کی طرف ہولیے۔چلتے چلتے راستے میں عرب اسٹریٹ نظر آئی، دیکھ کر دل خوش ہوا، وہیں سے نظر گھمائی تو دل پہلو میں رکتا ہوا سا محسوس ہوا۔نظروں کے سامنے ایک انتہائی خوبصورت مسجد موجود تھی۔تیز تیز چلتے ہوئے اس مسجد تک پہنچے۔اس خوبصوت اور عالی شان مسجد کا نام'' مجدی سلطان'' ہے۔مسجد باہر سے جتنی خوبصورت نظر آتی ہے، اندر سے بھی اتنی ہی خوبصورت ہے۔ اندر جا کر دو رکعت نمازِ عصر قصر پڑھی، کچھ تصویریں اندر باہر سے کھینچیں اور پھر عرب اسٹریٹ پر نظر کی تو یہاں کئی ملائین مسلم ریسٹورینٹ دکھائی دیے جو انڈا پراٹھا قسم کی کوئی چیز بنا رہے تھے۔اس ڈش کا نام مرطباق ہے۔ چائے کے ساتھ مرطباق کھایا۔بہت لذیذ تھا۔واپس اسی راستے سے لوٹے اور سرگون روڈ پہنچے اور دیر تک وہاں ٹہل لگاتے رہے۔

راستے میں ایک جگہ ایک ریسٹورینٹ پر'' عظمی ہوٹل'' لکھا ہوا دیکھا تو قسمت آزمانے کا خیال آیا۔پار سال جب ہم جرمنی گئے تھے تو وہاں پر کسی بھی ریسٹورینٹ میں کھانا کھانے سے پہلے حلال وغیرہ سے متعلق پوچھ لیا کرتے تھے۔یہاں بھی خیال آیا کہ پہلے دل کی تسلی کرلی جائے اس لیے اسی عظمی ہوٹل کے کاونٹر پر جا کر ہم نے ان سے پوچھا کہ کیا یہاں حلال کھانا ملتا ہے۔کرتا پائجامہ میں ملبوس ایک مولانا کاونٹر پر کھڑے تھے، برا مان کر بولے۔

''عظمی ہوٹل نام ہے،سب کام کرنے والے یہاں مسلمان ہیں اور یہاں پر ہر کھانا حلال ہے۔''

دل کو تسلی ہوئی تو ہم نے رات کا کھانا وہیں سے کھایا اور بس میں بیٹھ کر ہوٹل واپس لوٹ گئے۔دروازے سے اندر آتے ہی کئی کارڈوں پر نظر پڑی جو دروازے کے نیچے سے کمرے میں ڈالے گئے تھے۔یہ کارڈ مختلف مساج سنٹرز سے متعلق تھے۔انھیں ردی کی ٹوکری میں ڈالا اور کمرے میں ادھر ادھر نظر ڈالی۔کمرے میں موجود ریفریجریٹر کے قریب بجلی کی کیتلی اور ساتھ ہی ایک طشت میں دو عدد چائے اور دو عدد کافی کا انتظام تھا جو ہوٹل کی جانب سے مفت تھا۔مزے سے چائے بنا کر پی، آنے والے کل کی تیاری کرکے بستر پر لیٹ گئے اور ٹیلیویژن سے دل بہلانے لگے۔ چیک اِن کے ساتھ ہی کمپنی کی جانب سے ایک خط ہمیں مل چکا تھا کہ اگلے روز ایک بس ہمیں ہوٹل کی لابی سے لیکر ٹریننگ سنٹر تک لیجائے گی، لہٰذا اس طرف سے اطمینان تھا۔سفر کی تھکن اب تک محسوس ہورہی تھی اس لیے لیٹے تو اگلے ہی لمحے گہری نیند نے ہمیں آدبوچا۔جانے کب تک سوتے رہے۔اچانک ٹیلوفون کی مسلسل گھنٹی کی آواز سے بیدار ہوئے۔کچھ دیر تک تو سمجھ ہی میں نہ آیا کہ ہم کہاں ہیں اور اس وقت کے بجے ہیں۔حواس باختہ سے لیٹے رہے۔بارے کچھ سکون ملا تو رسیور اٹھا کر'' ہیلو!'' کہا۔

کسی خاتون کی میٹھی سی آواز سنائی دی۔وہ انگریزی میں کچھ کہہ رہی تھیں۔آپ نے ہمیں بلایا؟

ہمارے حواس دوبارہ گم ہوگئے۔ بڑی مشکل سے انھیں پھر سے مجتمع کیا اور نہایت تلخ لہجے میں جواب دیا۔جی نہیں۔ہم نے آپ کو کال کیا نہ بلایا۔اور رسیور کریڈل پر پٹخ کر دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگے۔ پھر اٹھے، حوائج ضروریہ سے فارغ ہوکر ٹیلیویژن کو بند کیا۔لائٹ بند کی اور کافی دیر تک دھڑکتے دل کو سنبھالنے کی کوشش کرتے رہے۔

سید بدر سعید

مابدولت گزشتہ دنوں ایک عجیب مسئلہ کا شکار ہو گئے۔ ہوا کچھ یوں کہ حکم ملا: "شاعری کرو اور خاص طور پر غزل لکھو"

یہ حکم کس نے دیا اور کیوں دیا؟ اس کا جواب ہم نے فی الحال چھپا لیا ہے کیوں کہ ایک مرتبہ خوبصورت اور انوکھے شاعر حسن عباسی نے اپنی محبوبہ کا نام پوچھنے پر کہا تھا کہ:

"غزل کے ایک شعر میں دو مصرعے اور دو ہی باتیں ہوتی ہیں، جن میں سے شاعر ایک بات بتاتا ہے اور ایک بات چھپا لیتا ہے۔"

اب یہ میں نے بتا دیا کہ کوئی ہیں جن کے لیے شاعری کرتا ہوں، کون ہیں؟ یہ میں نے چھپا لیا۔۔۔ اتنی لمبی تمہید کے بعد حسن عباسی نے ان کا نام واقعی چھپا لیا اور آف دی ریکارڈ بھی نہیں بتایا۔

تو صاحبو! اتفاق سے وہ انٹرویو ہم ہی کر رہے تھے سو حسن عباسی کی بات پلے سے باندھ لی اور اب آپ کو بھی ایک بات بتا دی کہ حکم ملا تھا شاعری کرو اور غزل لکھو۔ اب یہ حکم کس نے دیا تھا یہ بات ہم نے بھی چھپا لی۔۔۔ ویسے سمجھ تو آپ گئے ہوں گے؟؟؟

بہر حال حکم حاکم مرگ مفاجات، ہم نے فیصلہ کیا کہ غزل لکھ ہی لیں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ غزل لکھی کیسے جائے؟ نہ ہمیں غزل کے سر کا پتہ نہ پیر کا۔۔۔ شکل و صورت کیسی ہوتی ہے یہ بھی نہیں جانتے۔۔۔ کبھی کبھی تو ہم یہ بھی سوچتے رہے ہیں کہ غزل نام کی کوئی چیز ادب کا حصہ ہوتی بھی ہے یا ایسے ہی یار دوستوں نے باتیں بنا رکھی ہیں؟ کچھ بھی تو نہیں معلوم تھا، لیکن حکم تو حکم ہوتا ہے سو لکھے بغیر چارہ بھی نہیں لہٰذا سوچا کہ دوستوں سے کچھ مدد لے لیتے ہیں، کم از کم غزل کا کچھا تا پتہ ہی مل جائے۔

سب سے پہلے ہم نے عادل گلزار کو فون کیا اور لگتے ہاتھ ہی پوچھ لیا:

"عادل بھائی! آپ کو غزل کے بارے میں کچھ پتہ ہے؟؟"

"غزل کے بارے میں تو نہیں پتہ البتہ غزالہ کے بارے میں پتہ ہے، ابھی کل ہی تو اس نے چاچے سے مار پڑوائی ہے" عادل نے فٹ سے جواب دیا اور ہم نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔

عادل گلزار کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد ہم نے سوچا کیوں نہ ریاض احمد قادری صاحب سے پوچھا جائے۔۔۔ آخر انہیں شاعری پر صدارتی ایوارڈ مل چکا ہے، بس یہی سوچ کر ہم ریاض احمد قادری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، اُنہوں نے پوری دلچسپی سے ہماری بات سنی اور حسب عادت دس بیس جگتیں لگانے کے بعد کہنے لگے:

"شاعری کا تعلق دل اور جذبات سے ہوتا ہے، بس ایک عدد استاد کی ضرورت ہوتی ہے جو پرائیوٹ خیالات کو سنسر کرنے کے بعد ان الفاظ میں ڈھال سکے جو شریفوں کی محفل میں سنے جا سکتے ہوں"

پھر خود ہی کہنے لگے:

"استاد تو میں آج سے تمہارا بن گیا، بس تم اپنی شاعری کسی

صفحے پر لکھ کے دے جاؤ، کل تک ٹھیک کر دوں گا''
ہم نے جیسی تیسی غزل لکھی اور ان کے حوالے کر دی۔ اگلے دن گئے تو انہوں نے ایک غزل ہمیں عنایت کی جس میں خیال، بحر، الفاظ سمیت کچھ بھی ہمارا لکھا ہوا نہ تھا
ہم نے حیرت سے قادری صاحب کی طرف دیکھا:
''سر! یہ کیا ہے؟''
مسکرا کے بولے: ''یہ تمہاری غزل ہے''
لیکن اس میں کچھ بھی ہمارا لکھا ہوا نہیں ہے'' ہم نے احتجاج کرتے ہوئے کہا تو کہنے لگے
''خیال کچھ ڈھیلا تھا، کہیں قافیہ، ردیف نہ تھے، کہیں اوزان کا مسئلہ تھا۔۔۔ لہٰذا ٹھیک کرنے کے بعد یہ غزل بن گئی''
پھر گرجتے ہوئے بولے: ''چلو اٹھاؤ اسے اور بھاگو یہاں سے''
ہم دکھی دل لیے قادری صاحب کے آستانے سے اٹھ آئے لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ہمیں معلوم ہو گیا کہ عادل گلزار، قادری صاحب کا شاگرد کیوں بنا پھرتا ہے۔
تھوڑی دیر بعد خیال آیا کہ حافظ مظفر محسن صاحب سے پوچھتے ہیں انہیں ضرور پتہ ہوگا۔۔۔ فون پہ بات کرنا بیکار لگا لہٰذا بھاگم بھاگ ان کے دفتر جا پہنچے۔
سلام دعا کے بعد ہم نے پوچھا:
''حافظ صاحب! آپ کو پتہ ہے کہ شاعری کیسے کی جاتی ہے؟ انہوں نے کڑی نظروں سے ہمیں گھورا اور عینک اتار کر کہنے لگے:
''میاں! کہیں عشق تو نہیں فرمانے لگے؟ ذرا والد صاحب کا نمبر دینا۔۔۔''
''والد صاحب کا نمبر کیوں؟'' ہم نے حیرت سے پوچھا
کہنے لگے: ''انہیں باٹا کے نئے سینڈل کا بتانا ہے، سنا ہے جلدی نہیں ٹوٹتا''
اب ظاہر ہے اس کے بعد تو ہم یہی کہ سکتے تھے کہ بس ویسے ہی پوچھا تھا۔۔۔ غلطی سے۔۔۔

> **زبید بھائی** بتا رہے تھے کہ جب ہم غلام تھے تو حکومت کرنے والے غیر ممالک سے آیا کرتے تھے۔ اب ہم آزاد ہیں چنانچہ حکومت کرنے والے غیر ممالک چلے جایا کرتے ہیں۔
>
> اعظم نصر

انہوں نے ہماری بات کاٹتے ہوئے کہا: ایسے پوچھو یا ویسے پوچھو، لیکن کھانا کھانے کے بعد پوچھو'۔۔۔ اور پھر ملازم کھانا لے آیا
کھانا کھانے کے بعد حافظ صاحب نے دو میٹر لمبی توند پر ہاتھ پھیرا اور زوردار ڈکار لیتے ہوئے خالص لاہوری اسٹائل میں کہنے لگے:
''ہور سناؤ بادشاہو! کوئی نئی تازہ۔۔۔۔۔''
''سر! شاعری کیسے کی جاتی ہے؟؟'' ہم نے موڈ اچھا دیکھا تو موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پھر سوال دہرا دیا
کہنے لگے: ''بدر میاں! شاعری کی نہیں جاتی، یہ تو ہو جاتی ہے۔''
''ہو جاتی ہے!!! وہ کیسے؟'' ہم نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا
''بس خود بخود ہو جاتی ہے۔۔۔ آمد ہوتی ہے۔۔۔''
ہم نے ساتھ بیٹھے ایک صاحب کے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے حیرت سے کہا: ''لیکن نازل تو وحی ہوتی ہے اور اس کا سلسلہ تو بند ہو چکا ہے۔''
''وہ تو نبیوں پر نازل ہوتی تھی لیکن شاعری عموماً ان پر نازل ہوتی ہے جن کی صحبت ٹھیک نہ ہو، مطلب خراب لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہو۔۔۔'' موصوف مسکرائے
ہم نے ایک نظر حافظ صاحب کی شاعری کی کتاب ''جب بھی دیکھا۔۔۔ اداس ہی دیکھا'' پر ڈالی اور یہ کہتے ہوئے آ گئے کہ یقین تو نہیں آتا لیکن آپ کہتے ہیں تو مان لیتے ہیں۔ وہ تو گھر پہنچ

کر خیال آیا کہ حافظ صاحب بیٹھے تو ہمارے ساتھ ہی ہوئے تھے۔

حافظ مظفر محسن کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد ہم اپنے سر ڈاکٹر اشفاق احمد ورک صاحب کے پاس گئے۔ ہمیں پورا یقین تھا کہ ان سے ہمیں ضرور معلوم ہو جائے گا کہ غزل کیسے لکھتے ہیں۔۔۔

ہم نے ڈاکٹر صاحب کو ادب سے سلام ٹھوکتے ہوئے کہا:

"سر! یہ شاعری کیسے ہوتی ہے؟؟"

"بس ہو جاتی ہے۔۔۔" ڈاکٹر صاحب نے کمال بے نیازی سے جواب دیا

"لیکن سر!۔۔۔" ابھی ہم نے اتنا ہی کہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے سوال داغ دے

"اوکاکے! تم نے اسائنمنٹ تیار کی ہے؟"

"سمجھ گیا سر!" ہم نے سر ہلاتے ہوئے کہا

"کیا سمجھ گئے؟؟" ڈاکٹر صاحب نے حیرت سے پوچھا

"یہی کہ مزید کوئی سوال نہیں کرنا اور یہاں سے نو دو گیارہ ہو جانا ہے" اتنا کہتے ہی ہم سچ میں وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئے۔

ابھی ہم وہاں سے پریشانی کے عالم میں جا ہی رہے تھے کہ راستے میں ڈاکٹر غفور شاہ قاسم مل گئے۔ موصوف کا پاکستانی ادب پہ کافی کام ہے لہٰذا انہیں دیکھ کر امید کی کرن نظر آئی،

"سر! ہمیں غزل لکھنا سکھائیں پلیز۔۔۔" ہم نے ڈاکٹر غفور کو گھیر لیا،

ڈاکٹر غفور شاہ قاسم شاید ہمارے ہی انتظار میں بیٹھے تھے کہ فوراً سمجھانے بیٹھ گئے لیکن ان کے سمجھانے کا طریقہ کچھ ایسا تھا کہ ہم سمجھ گئے کہ سر کو آج آنٹی یعنی مسز سر نے سبزی وغیرہ لینے بھیجا ہوگا اور ابھی تک ان کے ذہن میں یہی چل رہا ہے کہ کس طرح حساب کتاب میں ڈنڈی مار کر چائے کے پیسے بچانے ہیں، اسی لیے تو ہمیں بھی غزل لکھنے کا حسابی فارمولا سکھانے لگ گئے کہ کتنے مصرعہ ہوتے ہیں، پہلے مصرعہ کے تین حصے ہوتے ہیں۔۔ پہلا خیال، دوسرا قافیہ، تیسرا ردیف۔۔۔ پھر دوسرا مصرعہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔۔۔ پھر چوتھا مصرعہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے بس خیال اور قافیہ بدل جاتا ہے۔۔۔ جہاں تک ہمیں یاد ہے کچھ اسی قسم کی باتیں کر رہے تھے۔ بلاشبہ اپنی علمی سطح سے بہت نیچے آ کر سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اب انہیں کون بتاتا کہ اگر ہمیں اس قسم کے حسابی فارمولے یاد ہو جاتے تو حساب میں مر مر کے پاس ہوتے؟؟ لہٰذا ہم نے ڈاکٹر صاحب کو صاف صاف کہہ دیا کہ ہو سکتا ہے انہوں نے ماضی میں بھینس کے آگے بین نہ بجائی ہو لیکن آج وہ کچھ اسی قسم کی حرکت مرتکب ہو رہے ہیں، لہٰذا اجازت دیجیے۔۔۔

اس کے بعد ہم آخری امید کے طور پہ پروفیسر پریا تابیتا کی خدمت میں ایک کلو مٹھائی نصف جس کا آدھا کلو، چوتھائی ایک پاؤ اور اس کے بعد کچھ بھی نہیں ہوتا، اور ایک عدد کپڑے کا تھان (جسے

بوقت ضرورت پگڑی اور دوپٹہ، دونوں کے طور پہ استعمال کیا جا سکتا ہے) لے کر پہنچ گئے۔ یہ سب اس لیے بھی کہ پریا تابیتا صاحبہ کو اپنی شاعری کی بنیاد پر نیشنل یوتھ ایوارڈ مل چکا ہے۔اسی لیے ہمیں امید تھی کہ انہیں ضرور معلوم ہوگا کہ شاعری کیسے کی جاتی ہے اور غزل کیسے لکھی جاتی ہے۔۔۔

پروفیسر پریا تابیتا صاحبہ نے حیرت سے مٹھائی کے ڈبے اور کپڑے کے تھان کی طرف دیکھا، ہم ان کی آنکھوں میں موجود سوال کی تہ تک پہنچ گئے، اور دونوں چیزیں ادب سے ان کی میز پر رکھ دیں اور اتنے ہی ادب سے مٹھائی کا ڈبہ کھول کر اپنے پسندیدہ گلاب جامن کھانے شروع کر دیے۔ جب ڈبہ خالی ہو گیا تو ادب سے میز سے کپڑا اٹھایا، آنکھوں سے لگایا، عقیدت سے چوما اور پھر پگڑی کی طرح سر پر باندھ لیا۔

پروفیسر صاحبہ خاموشی سے ہماری حرکات وسکنات کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔ جب ہم اپنے حساب سے ادبی شاگرد کے درجے پہ فائز ہو گئے تو پروفیسر صاحبہ سے درخواست کی کہ شاعری کے حوالے سے ہماری راہنمائی کیجیے۔

انہوں نے قافیہ، ردیف، بحر اور اوزان کے حوالے سے لمبا چوڑا لیکچر دیا اور جب ہم سونے ہی والے تھے تو کہنے لگیں:

"اب تم مفاعلاتن مفاعلاتن۔۔۔ کو مدنظر رکھ کر کوئی مصرعہ لکھو"

"ہم نے فورا اعتراض کیا کہ مفاعلاتن مفاعلاتن۔۔ ہی کیوں؟ نائیلا تن نائیلا تن،، کیوں نہیں؟؟ یا پھر سائیلا تن سائیلاتن۔۔کیوں نہیں؟؟؟"

ہمارے اس اعتراض کے بعد انہوں نے برا سا منہ بناتے ہوئے اوزان کو ایک طرف رکھا اور حکم دیا:

"تم بس اتنا کرو کہ غزل گا کر لکھا کرو، اوزان خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔۔۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ پہلے سال دو سال کسی مراسی کی شاگردی کروں پھر آپ کے پاس آؤں؟"

ہم نے حیرت سے پوچھا تو انہوں نے فٹ سے پیپر ویٹ ہمیں دے مارا جس پر ہمیں مجبورا وہاں سے بھی نو دو گیارہ ہونا پڑا۔

بہر حال کچھ گا کر۔۔۔ کچھ کھا کر۔۔۔اور کچھ اوزان اور بحر سے متھا لگا کر ہم ایک عدد غزل لکھنے میں کامیاب ہو ہی گئے

آپ بھی ہماری وہ غزل ملاحظہ کیجیے:

بام پہ کوئی لہرایا تھا، چھت بھی کچھ کچھ ڈولی تھی
رات کے پچھلے پہر اچانک،کھڑکی مجھ سے بولی تھی

میں نے نمک ملایا تھا پر، چائے پھر بھی میٹھی تھی
لگتا ہے شہزادی نے ، کپ میں انگلی گھولی تھی

بوجھل بوجھل شامیں تھیں اور بکھرے بکھرے خواب سبھی
ساتھ میں اس نے لکھ بھیجا کہ گھر میں کل شب ہولی تھی

کیسے کیسے خواب تھے میرے اس کے سنگ اب رہنا ہے
کیسی دلکش خواہش تھی جو من میں یونہی سمولی تھی

بدؔر اسے بتلاؤں کیا، یہ ہجر کے لمحے کیسے تھے
زخمی زخمی ہاتھ تھے میرے جن میں سوئی پرولی تھی

غزل لکھنے کے بعد ہم بھاگم بھاگ ان کے پاس پہنچے جنہوں نے حکم دیا تھا کہ "غزل لکھو"

انہوں نے غزل سنی اور مسکرا کر کہا: "اچھی ہے"

"آپ کے لیے لکھی"۔۔۔ ہم نے شرماتے ہوئے کہا تو جواب توقع کے برعکس نکلا،

"کیا۔۔۔؟؟؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ بتاؤں تمہارے ابا جی کو؟۔۔۔ چار لگیں گی تو عقل ٹھکانے آجائے گی۔۔۔۔"

لیکن آپ نے خود ہی تو کیا تھا کہ "غزل لکھو" ہم افسردہ ہو گئے

"ہاں کہا تھا لیکن اپنے لیے لکھنے کو نہیں کہا تھا۔۔۔"

"تو کس کے لیے لکھنے کو کہا تھا؟؟؟ ہم چلائے

"شبو لنگڑی کے لیے۔۔۔ اک وہی تمہیں دیکھتی ہے!!!"

انہوں نے اطمینان سے کہا

"کیا؟؟؟؟؟۔۔۔۔" ہماری چیخ کس کس نے سنی یہ ہمیں معلوم نہ ہو سکا کیوں کہ ہم دھڑام سے زمین پر گر کر بے ہوش ہو چکے تھے۔

خادم حسین مجاہد

نوّابی سے قصّابی تک

گریجویٹ ہوتے ہی ہماری گردن کو ”کلف“ لگ گیا، کچھ اِس وجہ سے ہمارا قد ایک انچ بڑا محسوس ہونے لگا۔ چند ہی دنوں میں ہماری گردن کے پٹھے اس ”اضافی ورزش“ سے گھبرا کر فریاد کرنے لگے، بہر حال ہم نے اس کی قطعاً پرواہ نہ کی اور سوچنے لگے کہ اب اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور علم سے کس ادارے کو مستفید کیا جائے۔ تین چار اعلیٰ اداروں کے ڈائریکٹرز کو خط لکھ کر خوشخبری سنائی کہ وہ اگر چاہیں تو ہم جیسے جینئس کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں۔ دو ماہ کے انتظار کے باوجود اُن کی طرف سے جب کوئی جواب نہ آیا تو گردن کی اونچائی میں آہستہ آہستہ کمی آنے لگی۔ بہر حال ہم نے سوچا کہ شاید اِن اداروں میں ہمارے شایانِ شان کوئی عہدہ نہ ہوگا اور انہوں نے شرمندگی میں ہمیں جواب نہیں دیا ہوگا۔ پھر ہم نے اخبارات سے اشتہارات دیکھ کر لاتعداد محکموں کو درخواستیں دیں اور فیصلہ خدا پر چھوڑ دیا کہ ہماری صلاحیتیں کس کے کام آتی ہیں۔ ظاہر ہے اب یہ تو ان محکموں کی قسمت پر منحصر تھا کہ ان میں سے کون سا ہماری سر پرستی قبول کر کے ترقی کی معراج پر پہنچتا ہے۔

کچھ عرصے بعد ہمیں انٹرویو کے لئے کالیں موصول ہونا شروع ہوگئیں، آخر انہیں ہم جیسے ہیرے کی قدر معلوم ہوگئی تھی۔ ہم پہلے انٹرویو کے لئے بن ٹھن کر اور گردن کو نئے سرے سے کلف لگا کر پہنچے۔ متعلقہ دفتر پہنچ کر ہمیں اپنی ”بادشاہی“ ڈولتی ہوئی محسوس ہوئی کیونکہ وہاں ہمارے جیسے گریجویٹ نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی اور ان میں سے کئی ایک کے نمبر بھی ہم سے زائد تھے۔ ہمیں یونیورسٹی پر غصہ آنے لگا، جس نے ایک دم اِتنے لڑکوں کو ڈگری دے دی تھی۔ خیر غصہ ڈرنک کر کے ہم اپنے انٹرویو کے لئے باری کا انتظار کرنے لگے۔

جب ہمارا نام پکارا گیا تو اعتماد سے چلتے ہوئے انٹرویو کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں تین آدمی موجود تھے۔ انہوں نے پوچھا ”جس کام کے لئے درخواست دی ہے اس کا کتنا تجربہ ہے۔“ بس دوستو یہاں ہماری سٹی گم ہوگئی جو پھر چھ ماہ مختلف محکموں میں انٹرویو دینے کے باوجود نہ مل سکی، اور رہی اکڑ کی بات تو وہ بھی دفتروں کے چکروں کے دوران جوتے کے تلوؤں کی طرح رخصت ہوگئی۔

ایک دن ایک ریڑھی سے ”لنچ“ کرتے ہوئے ازراہ تفنن ہم نے ریڑھی والے سے پوچھا۔

”ارے بھئی کتنا کما لیتے ہو تم؟؟“

”اللہ کا بڑا کرم ہے جی دو سو روپے کی روزانہ کی بچت ہو ہی جاتی ہے۔“

جب ہم نے حساب لگایا تو وہ آمدنی اٹھارویں گریڈ کے افسر کی تنخواہ سے بھی زائد بنتی تھی۔ ہم نے جیسے تیسے کھانا ختم کیا اور باقی سارا دن ہم نے مختلف اقسام کے پھٹے، کھوکھے اور ریڑھی والوں

کے انٹرویو لیتے ہوئے گزارا۔ گھر پہنچنے تک ہم اپنے مستقبل کا لائحہ عمل ذہن ہی ذہن میں ترتیب دے چکے تھے۔

دوسرے دن ہم نے جلاد (قصاب) کی باقاعدہ شاگردی اختیار کر لی۔ جلاد قصاب ہمارے محلے میں گوشت کا واحد دوکاندار تھا۔ ہمارے اس انتہائی قدم پر ہمارے دوستوں، محلے داروں کے علاوہ گھر والوں نے بھی لعنت ملامت کی قرارداد یں پاس کیں اور گھر سے نکالنے کی دھمکی بھی دی لیکن جب آئے دن ہماری بدولت سری پائے، مغز کلیجی اور گردے جیسے اعضائے رئیسہ گھر میں آنا شروع ہوئے تو ہمارے قصاب بن جانے کی وجہ سے گھر والوں کی کٹی ہوئی ناک پھر سے جڑ گئی۔

جلد ہی ہم فنِ قصابی کے اسرار و رموز پا گئے کہ بوٹیاں دکھا کر ہڈیاں کیسے گاہک کو دیتی ہیں۔ بہترین گوشت کے بہانے چھیچھڑے کیسے تولتے ہیں، گاہک کی کھال اتار کر اسے محسوس بھی نہیں ہونے دینا ہے اور تازہ اور باسی چھوٹا بڑا گوشت کیسے مکس کر کے بیچنا ہے کہ گاہک کو شک تک نہ ہو۔

جلد ہی ہم مہذب قصاب کے طور پر شہر بھر میں ہر دلعزیز ہو گئے۔ ہماری تعلیم اور انگلش میں خصوصی مہارت کی وجہ سے کئی غیر ملکی ہمارے گوشت کے مستقل گاہک بن چکے تھے۔ بزنس کی یوں توقی پر جلاد (قصاب) بہت خوش ہوا اور اس نے دکان کے سلسلے میں بہت سے صوابدیدی اختیارات ہمیں بخش دئے جن کی مدد سے ہم نے قصاب شاپ پر مندرجہ ذیل اصلاحات نافذ کیں۔

۱۔ قصاب کے روایتی لباس دھوتی کو ترک کر کے سیاہ رنگ کے ٹریک سوٹ کو اپنی وردی قرار دیا، جن کی قمیض کے سینے پر چھری ٹوکہ کندہ تھا۔

۲۔ گوشت کو تین درجوں میں تقسیم کر کے تمام طبقات کی شکایات کا ازالہ کر دیا۔

۳۔ ڈبل ریٹ پر ہڈیوں سے پاک اسپیشل گوشت کی سہولت مہیا کر دی۔

۴۔ ایک من گوشت یک مشت خریدنے پر کھانا پکانے کی ترکیبوں والی کتاب کے تحفے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

ایک چوراہے کے چار بیٹے

گئے گزرے زمانے کی بات ہے۔ شہر کے بیچوں بیچ، کنکریٹ کے جنگل میں ایک چوراہا رہا کرتا تھا۔ اُس کے چار بیٹے تھے۔ جن کی، اُوپر تلے تین آنکھیں۔ چاروں فرمانبردار، وقت کے پابند، آٹھوں پہر چوراہے کے سامنے ادب سے کھڑے رہتے۔ دن رات ایک کر کے مشین کی طرح کام کرتے۔ چھوٹی ہو کہ بڑی، ہر گزرنے والی سواری اُن کی اِطاعت گزار تھی۔ لیکن ایک بات عجیب (نہیں) تھی کہ چاروں کی آپس میں بنتی نہ تھی، سب ایک دوسرے سے منہ پھیرے کھڑے رہتے۔ اُن میں سے جب کوئی راہ دیتا تو دُوسرا دیدے نکال کر راہ میں روڑے اٹکاتا۔ مگر چوراہا اِس بات پر بے حد خوش تھا۔ وقت کٹتا رہا، دن گزرتے رہے، مگر بیٹوں کے بیچ فاصلے کم ہوئے نہ دُوریاں بڑھیں۔ رنگ بدلے نہ ڈھنگ۔

چاروں کے ساتھ کنکریٹ کے جنگل میں رہتے رہتے، زمانے کے سرد و گرم سہتے سہتے، اُس کے چہرے پر جگہ جگہ گڈھے پڑ گئے تھے۔ بدلتے وقت کے ساتھ، شہر کی بدلتی حالت دیکھ کر اُسے فکر ہونے لگی کہ ٹریفک کا ہجوم دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس کے دیگر بھائیوں کی طرح اُسے بھی راستے سے ہٹا کر کوئی پُل نہ بنا دیا جائے۔ اُس کے یہاں سے اُٹھتے ہی اُس کے چراغوں میں سے کچھ چراغ بھی گُل ہو سکتے ہیں۔ ایک رات جب راستے سنسان تھے، اِکا دُکا گاڑیاں فراٹے بھر کر گزر رہی تھیں ...... جنھیں اِس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ چاروں بیٹے لال پیلے ہو رہے ہیں۔ ایسے میں چوراہے نے چاروں 'خشک خصالوں' کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''میرے بچو! کبھی متحد نہ ہونا...... تمہارے اختلاف میں طاقت ہے ... کبھی متحد نہ ہونا۔''

نادر خان سَرگِروہ

ان انقلابی اقدامات کی وجہ سے ہمارا کاروبار دن دگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ جلاد قصاب نے خوش ہو کر ہمیں ''جلاد جونیئر'' کا لقب دیا اور ہماری سفارش پر ہمارے کئی تعلیم یافتہ دوستوں کو

اپنے حلقۂ قصابی میں داخل کرلیا۔
دکان پر قصابی کورس کی تھیوری پر عبور کے بعد جلاد قصاب نے ہمیں قصابی کے پریکٹیکل اموری ٹریننگ دینا شروع کی۔ اس نے جانوروں کے ذبح کے دوران ہمیں اپنے ساتھ رکھا اور ان کے آپریشن کی تکنیک سکھائی۔ اب فنِ قصابی کی ٹریننگ کا صرف ایک مرحلہ باقی رہ گیا تھا جس میں ہمیں کسی جانور کو دوسرے قصاب کی مدد کے بغیر ''آپریٹ'' کرنا تھا جس کے بعد ہمیں فارغ التحصیل قرار دیا جاتا۔

چند دن بعد ایک عدد برات کے ایندھن کا انتظام کرنے کے لئے کچھ لوگوں نے استاد جلاد کی خدمات حاصل کرنا چاہئیں۔ چونکہ وہ پرانے خیالات کے لوگ تھے لہٰذا گھر پر جانور ذبح کرا کے گوشت بنوانا چاہتے تھے۔ استاد جلاد نے ہمارا پریکٹیکل لینے کی غرض سے یہ فرض ہمیں سونپ دیا۔ ''آلاتِ قتل'' سے مسلح ہو کر اور وردی بدل کر ہم نے استاد سے آشیر باد حاصل کی اور چار زیرِ تربیت ساتھیوں کے ہمراہ پریکٹیکل کے لئے روانہ ہوگئے۔ راستے میں ہمارے آلاتِ قتل اور وردی کو کئی لوگوں نے مشکوک انداز میں گھورا۔ شاید وہ ہمیں گرفتار کرانے کی مخلصانہ کوشش بھی کرتے اگر دیگر کرم فرمانہ ہمارے ساتھ ہوتے۔ کرم فرماؤں کے گھر پہنچے تو اہلِ خانہ کے علاوہ چند مہمان ایک عدد ہیوی ویٹ سانڈ نے بھی ہمیں خاصی مشکوک نظروں سے گھورا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر ہم نے آلاتِ قتل اپنی سپیشل جیبوں میں گم کئے اور آنکھوں میں محبت کے دیے روشن کر کے سانڈ کے پاس جا کر اس کے جسم پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگے تاکہ کچھ دوستانہ فضا پیدا ہو جائے۔ سانڈ آداب سے واقف لگتا تھا اس نے بذریعہ دُم ہماری محبت کا جواب دینا شروع کردیا اور ہمارے جسم پر خارش ہونے لگی۔

جب ماحول مناسب حد تک سازگار ہوگیا تو ہم نے ساتھیوں کو پیش قدمی کا اشارہ کیا۔ ان کی مدد سے پہلے تو رسے سے اس کی اگلی دو ٹانگیں جکڑیں پھر اسی رسے کے باقی حصے سے پچھلی ٹانگیں بھی جکڑیں اور رسہ ساتھیوں کو قابو کرنے کے لئے دیا اور پھر رسی کو دُم کی پچھلی ٹانگوں میں بل دے کر گزارا اور ایک صاحب کے

حوالے کردی اور اسے سختی سے الرٹ کیا اور تنبیہ کی کہ چاہے دم اکھڑ جائے وہ اس کو ہرگز نہ چھوڑیں گے کیونکہ اگر انہوں نے دُم چھوڑ دی تو سبھی کے پائے ثبات میں لغزش آجائے گی۔

چوتھے ساتھی کو اس کی ڈیوٹی سمجھا کر ہم نے ایک جھٹکے سے سانڈ ''کو فائنل پچ'' دے کر گرایا اور فاتحانہ انداز میں چھری نکال کر اس کے گلے کی طرف بڑھائی جسے چوتھا ساتھی ذبح کی پوزیشن میں کئے ہوئے تھا۔ تکبیر پڑھ کر چھری پھیرنے ہی والے تھے کہ وہ کچھ ہوا جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ سانڈ نے ایک دم خطرہ بھانپتے ہوئے پچاس ہارس پاور کا جھٹکا مارا۔ ''دُم ہولڈر'' دس فٹ دور جا گرا۔ رسیوں والے صاحب اوندھے ہوگئے۔ گردن کی ڈیوٹی والے صاحب سانڈ کے نیچے جا گرے اور ہمیں اسی وقت اس نے جو کمر کے نیچے لات جمائی تو ہم چھری سمیت فضا میں پرواز کر کے ہاتھ چلاتے ہوئے گرے۔ گرتے وقت یوں لگ رہا تھا جیسے ہم کسی نادیدہ شیطان کو قتل کر رہے ہیں۔

جب ہوش آیا تو سانڈ صحن کی بجائے چھت پر موجود تھا اور زور زور سے ''ہاں ہاں'' کر رہا تھا، ممکن ہے اپنی مادری زبان میں میرا مذاق اڑا رہا ہو۔ مجھے بتایا گیا کہ سانڈ کو اتارنے کی کوشش میں دو آدمی اس کی اشتعال انگیزیوں کا شکار ہو کر چھت سے گر کر اسپتال پہنچ چکے ہیں۔ ہم نے اپنی ٹانگوں کی لغزش پر قابو پاتے ہوئے کرم فرماؤں کو گھاس لانے کے لئے کہا۔ وہ سمجھے شاید دماغی چوٹ سے میرا دماغ کھسک گیا ہے۔ بہرحال جب وضاحت کی کہ اپنے لئے نہیں سانڈ کے لئے ہے، تب مطمئن ہوئے۔

ہم نے رسیوں کے پھندے دو آدمیوں کو دے کر سیڑھیوں

کے دونوں جانب متعین کر دیا اور خود اوپر چڑھتے ہوئے تھوڑی تھوڑی گھاس سیڑھیوں پر رکھنا شروع کر دی۔ اوپر والی سیڑھی پر کھڑے ہو کر زورِ بازو کی مدد سے تین پونڈ گھاس اپنے اور سانڈ کے درمیان حائل فاصلے میں پھینکی اور خود نیچے اتر آئے۔ توقع کے عین مطابق جلد ہی سانڈ کا دل للچایا اور اس نے گھاس کی طرف پیش قدمی کر دی۔ جب وہ اوپر والی سیڑھی پر پہنچا تو خوشی سے ہمارا دل بلیوں اچھلنے لگا لیکن ہمارے ارمانوں پر اس وقت اوس پڑ گئی جب اس نے وہیں سے واپس روانگی اختیار کر لی شاید اسے ہماری سازش کا علم ہو گیا تھا۔

اس قدر لاجواب منصوبے کے یوں فیل ہو جانے پر ہمارا غم سے برا حال تھا کیونکہ اہلِ خانہ کے علاوہ اہلِ محلّہ بھی اس تماشے میں شریک ہو چکے تھے جو بھانت بھانت کی بولیوں کے علاوہ ہماری قصابی کے بارے میں بھی ناقابلِ تحریر ریمارکس پاس کر رہے تھے۔ ایک صاحب کا اصرار تھا کہ سانڈ کو کلوروفام سنگھایا جائے مگر بلی کے گلے میں گھنٹی باندھے کون؟ اگر ان صاحب کو ہی یہ کام سونپا جاتا تو مزاج شریف درست ہو جاتے اور پھر کبھی ایسا مشورہ مفت میں نہ دیتے۔ ایک دوسرے صاحب سانڈ کے پیروں میں آتشبازی چھوڑنے پر تلے ہوئے تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کے بعد سانڈ پاگل ہاتھی کا رول بھی ادا کر سکتا تھا۔

جانوروں کی نفسیات پر غور کرتے ہوئے ہم نے اہلِ خانہ سے کہا کہ پاس پڑوس سے کوئی جانور لا کر صحن میں باندھیں تاکہ سانڈ کا خوف ختم ہو کافی بھاگ دوڑ کے بعد وہ ایک بچھڑا لے آئے۔ اس ترکیب کا نتیجہ خوب رہا سانڈ نے چند منٹ میں بچھڑے سے دور سے ہی مذاکرات کیے۔ بچھڑے نے شاید لاعلمی کی بنا پر لائن کلئر ہونے کا اشارہ کر دیا اور سانڈ صاحب نیچے اتر آئے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بچھڑے سے حال احوال دریافت کر رہے تھے۔ ہم اس جذباتی بلیک میلنگ پر سانڈ سے شرمندہ ہونے کے باوجود مجبور تھے۔

سانڈ کو ایک بار پھر جکڑ لیا گیا۔ اِس بار امدادی اراکین کی تعداد چار کی بجائے دس تھی جنہوں نے ہماری چھری پھیرنے کے بعد بھی اسے مضبوطی سے جکڑے رکھا تاکہ وہ پھر نہ بھاگ کھڑا ہو۔ اس خدشے کی تائید میں ایک صاحب نے یہ واقعہ بھی سنایا کہ ایک دفعہ ایک جانور شہ رگ کٹنے کے بعد بھاگ کھڑا ہوا تھا اور بڑی دور جا کر گرا تھا۔

پریکٹیکل میں ناقص پرفارمنس کے باوجود استاد نے ہماری خدمات کو دیکھتے ہوئے ہمیں رعایتی نمبروں سے پاس کر دیا اور ہم نے ذاتی قصاب کی دکان کھول کر حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق گوشت کا بزنس شروع کر دیا۔

عاشق کا جنازہ

۱۹۰۰ء میں یوپی کے لفٹیننٹ گورنر "سرانتونی میکڈانل" نے اردو کے خلاف مہم شروع کی تو نواب محسن الملک نے اس کا جواب دینے کے لیے لکھنؤ میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا جس میں، میں بھی شریک ہوا۔ محسن الملک نے اس جلسے میں جس جوش و خروش سے تقریر کی، اس کی نظیر میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ یوں سمجھیے کہ الفاظ کا ایک لاوا تھا جو اُبل اُبل کر پہاڑ سے نکل رہا تھا۔ آخر میں نواب محسن الملک نے یہ کہتے ہوئے کہ اگر حکومت اردو کو مٹانے پر ہی تل گئی ہے تو بہت اچھا، ہم اردو کی نعش کو گومتی دریا میں بہا کر خود بھی ساتھ ہی مٹ جائیں گے اور والہانہ انداز میں یہ شعر پڑھا:

چل ساتھ کہ حسرت دلِ محروم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

یادگارِ چشتی از نور احمد چشتی

اگر میں دیر سے پہنچوں تو اس میں کیا خطا میری
تمہارے راستے میں اِک پری خانہ بھی آتا ہے
(محمد یوسف پاپا)

پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی

دوکانِ بے چلن

وہ کالج میں بیٹھے، لیٹے بور ہو جایا کرتے۔ کیوں کہ وہ جس پوز میں اپنی نشست کو رونق بخشا کرتے تھے، وہ بیٹھنے اور لیٹنے کی درمیانی حالت ہوا کرتی۔ کالج پرنسپل جب بھی بھولے بھٹکے اپنی دُکان (پرنسپل آفس) سے اسٹاف روم میں داخل ہوتا (یہ دیکھنے کہ کسی دوجے کی دُکان تو یہاں پھل پھول نہیں رہی)، موصوف اُسے اپنی درمیانی بلکہ ''میانی'' حالت میں ملے۔ ایک مرتبہ وہ بدک گیا اور اپنی پرنسپلانہ جہالت، معاف کیجیے گا، جلالت کے ساتھ بولا: ''آپ یہاں آیئے ذرا میرے آفس میں!'' یہ کہہ کر وہ مخالف تیر کی طرح مُڑا۔

بقول پاکستانی پروفیسر (یعنی پروفیسر برائے مطالعہَ پاکستان)، جب بھی یہ کسی کو اپنے آفس میں بُلائے تو سمجھ لو کہ پہلے اُس کی کمائی پہلے اور عزت بعد ازاں خطرے میں ہے۔ موصوف ذرا نہ ڈرے، خراماں خراماں آفس تک گئے۔ آدھا گھنٹہ بعد واپس آئے تو بعد میں لوگوں نے حلفیہ بیان دیا کہ موصوف سے مخفی ملاقات کے بعد پرنسپل نے بڑھئی کو بُلا کر اپنی نشست کو کشتی نما بنوالیا اور پھر وہ دن بھر موصوف کے خاص اسٹائل کو اپنائے کالج کے مابعد الطبیعاتی مسائل پر سوچ وبچار کیا کرتا۔

موصوف کی سرکش جوانی اور اُس سے بھی زیادہ سرکش خیالات کو لگام دینے کے لیے بقول پاکستانی پروفیسر اُن کی پی ایچ ڈی کی نگراں (جو مقالے سے زیادہ اُن کے چال چلن کی نگراں تھی) نے ایک عجب ترکیب وضع کی۔ گلبرگ کے پوش علاقے میں اُس مال زادی کی ایک کنڈم دُکان برسوں سے بند پڑی تھی۔ اُس جگہ بالترتیب حجام، نائی، پرچون فروش اور دیگر لذائذِ زیست اپنا اپنا لوہا ٹھوا چکے اور دُکان کو بساط بھر بڑھا چکے تھے، لیکن اُس عاقلہ نے اس بار ایک عجب چال چلی، ترپ کا پتہ پھینکا جو سیدھا موصوف کی گود میں آن کر گرا اور انھوں نے اپنی نشست کے خم پر بازو ٹکا کر قسم کھائی یا اب یا تو وہ دُکان نہیں یا عفیفہ کی نگرانی نہیں۔

یوں موصوف اُس ستر بہتر سالہ عفیفہ کی دُکان کو چلانے کی کوششوں میں جُت گئے۔ یہ عجب اتفاق کہ اُس دُکان کے آس پاس، دائیں، بائیں کئی دُکانیں اور بھی واقع تھیں، اور انتہائی حیرت کی بات کہ سب کی سب ''چلتی'' ہوئی۔

ہم اکثر کالج سے موصوف کی دُکان پر جلوہ افروز ہوتے کیونکہ بقول پاکستانی پروفیسر: ''یار۔۔۔تم اور مَیں، دُکان پر جتنا زیادہ جائیں گے، دُکان اسی قدر جلد بند ہوگی۔ ویسے بھی ہمارے موجودگی میں دوسرا ’گرا ہک‘ تو پَر اور چُر مار نہیں سکتا۔ شروع شروع موصوف کی دُکان پر قریبی پروفیسروں اور دانش وروں کی بیگمات کھانا، چائے، پانی بھیجتی رہیں کیونکہ مفلسی کا یہ عالم تھا کہ موصوف چھوٹے بڑے (حوائجِ ضروریہ) تک کو ترس گئے تھے۔ ایسے میں کھانا کہاں؟

ایک روز ہم دُکان کے لیے مارکیٹ سے ہمسایہ دوست ملک

کا مضبوط ترین تالا پسند کر کے موصوف کی دُکان پر پہنچے تو ہیجڑوں کا ایک غول منتظر پایا۔ جلبلا کر پوچھا: ''بھائی یہ کیوں؟''

ہڑبڑا کر بولے: ''یار کیا کروں، یہاں ہیجڑے بہت آتے ہیں۔''

ہم نے کہا: ''تو کچھ دے دلا کر فارغ کرو!''

فرمایا: ''صبح ایک عفیفہ آئی تھی۔ دور سے دیکھ کر دوبارہ دیکھنے کی خواہش اور بعدازاں دیکھنے کے جرم میں دیکھنے والے کی سسکی نکلتی تھی، آتے ہی بولی، چھوٹا بھائی جناح اسپتال میں داخل ہے۔ دواؤں کے پیسے نہیں۔ سُنا ہے آپ کسی سرکاری کالج میں پروفیسر ہیں، سوچا مالی امداد ہو سکے گی۔'' موصوف کچھ بھی سہی، لیکن تھے بہرحال پروفیسر۔ بولے: ''تو آپ مجھے دوائیوں کا نسخہ لا کر دے دیجیے، میں دوائیں دلا دوں گا۔'' لڑکی نے ایک نظر اُن کے چشمے کی پیچھے، اُن کی مسکراتی آنکھوں کو دیکھا اور اُن میں برادرانہ چمک دیکھ کر بولی: ''ابھی دو منٹ میں آئی نسخہ لے کر!''

موصوف آج تک اُن دو منٹوں کا انتظار کر رہے ہیں، ہر مرتبہ ہم سے کہتے ہیں: ''یقین کرو، دنیا بڑی ہی بے وفا ہے، میں نے تو اُسے پچاس روپے دیے تھا اور صرف یہ کہا تھا کہ بھائی کے نسخے تو لے کر آ جاؤ!''

اس پر پاکستانی پروفیسر کہا کرتے: ''موصوف نے اس کے ٹی اے، ڈی اے کا بندوبست پچاس رُپوں سے کر دیا تو وہ کیوں آتی؟''

ہم نے جب بھی موصوف کو دیکھا، ہمیشہ 'لیبٹھے' (یعنی لیٹنے اور بیٹھنے کی درمیانی حالت) میں دیکھا۔ ایک دن کا تذکرہ ہے، ہم دُکان پر جا دھمکے، حیرت اس بات پر ہوئی کہ وہ اب تک کُھلی ہوئی تھی اور موصوف کی جفاکشی، دیانت، صبر، مہربانی، استقامت، ہمت، جرأت، قناعت، توکل کی بدولت، آس پاس کی دُکانیں برابر چل رہی تھیں۔ اس پر ہم نے اُن کے کان کے پاس جا کر (رازدارانہ انداز میں) پوچھا: ''بھائی، جس خاتون کے کہے پر تم ایسی قیدِ بامشقت جھیل رہے ہو، کیا اُس نے تمھیں اپنی غلامی میں لینے کا عزم کر لیا ہے؟ یا اُس کی کوئی بھانجی بھتیجی ہے؟ آخر کاہے کو یہاں بیٹھ کر علی گڑھ کے بجائے لوہے کے پاپڑ بیلتے ہو؟ کیوں کر شجرِ بے ثمر سے وابستہ ہو؟ کمبخت کو تالا کیوں نہیں لگا دیتے، کیوں اپنی صحت اور جوانی کے دشمن ہوئے جاتے ہو؟''

قہقہہ لگا کر فرمایا: ''آپ کے سوالنامے کے چیدہ چیدہ جوابات پیشِ خدمت ہیں۔ اوّل تو میڈم کی کوئی بیٹی، بھانجی، بھتیجی نہیں۔ دوم، وہ میرے پی ایچ ڈی کے مقالے کی نگراں ہیں، استاد ہیں، اُن کا کہا اور 'سُنا' مقدم ہے۔ سوم، دُکان ایسی مندی بھی نہیں، کبھی کبھار بیس تیس رُپے کی دیہاڑی لگ ہی جاتی ہے جو میں شام کو اُن کے بیٹے کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں۔ چہارم، میری صحت آپ حضرات کے لائے گئے ظہرانوں، عصرانوں اور عشائیوں سے روز بروز بہتری کی جانب مائل ہے، زوال پذیر ہرگز نہیں۔ اب رہی بات ضروریات سے فراغت کی۔۔۔۔۔''

ابھی موصوف اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ پاکستانی پروفیسر نے بات اُچک لی:

''اُس کے لیے وہ ستری بہتری عفیفہ پہچان چکی ہے کہ تم اکبرِ اعظم اور اُس کے نورتن فیضی کی طرح 'حبسِ بول' کے عارضے میں مبتلا ہو۔''

ہرگز نہ سمجھے، بولے: ''یہ کون سی بیماری ہے؟ غالباً عہدِ مغلیہ کا زوال اسی وبا کا رہینِ منت ہوگا۔''

پاکستانی پروفیسر بولے: ''عہدِ مغلیہ تو ایک جانب، نگراں خاتون کے پانچ شوہر اسی عارضے میں اس جہاں سے سدھار چکے ہیں اور اب اس کا شکار تم ہو۔'' اتنا کہہ کر ہمیں دیکھ کر آنکھ ماری اور کہا: ''اس بار کا شکار خاصا جوان، تندرست، توانا، بقول اسامی اشتہاروں کے 'ینگ' 'اینڈ' 'انرجیٹک' ہے۔''

اب مسئلہ یہ تھا کہ ہم موصوف کے سامنے ہنس بھی نہ سکتے تھے کہ وہ دل جلے تو ہرگز نہ تھے لیکن اُس دُکان میں دل لگی کی ہر بات جلوت پذیر ہوا کرتی۔ کیونکہ دکان کا حدودِ اربع نیک مسلمان کی ''گور'' کے فشار جتنا تھا۔ یعنی برائے نام۔ ہم فون پر اپنی اہلیہ کو رات کے کھانے کے معروضات نوٹ کروا رہے ہوتے اور ہمارے جانے کے بعد موصوف قسمیں کھاتے رہے کہ: ''تمھارے

جانے کے بعد تو آس پاس کی دوشیزائیں وہ سارے کھانے لے آئیں جو تم رات کے لیے بھابھی کو فون پر لکھوارہے تھے۔ بھائی ذرا ہلکے بولا کرو۔''

اس پر ہم نے چلّا کر کہا: ''ابے، ہم تو ہلکا ہی بولتے ہیں، اگر زور سے بول سکتے تو موبائل فون کا سہارا ہی کیوں لیتے؟ خیر تم اس من وسلویٰ کا ہرگز بُرا نہ مانو، یہ تم جیسے جوانوں کے لیے ہی اُترا کرتا ہے، ورنہ ہماری عمر کے جوان تو بیگم کے ہاتھ بلکہ 'لات' کی روٹی کے محتاج ہوا کرتے ہیں۔

موصوف نے اچانک اپنے چشمۂ نابینا کا رُخ ہماری جانب کردیا اور زیرِ لب فرمایا: ''جوان؟؟؟'' مجسم سوالیہ نشان بن گئے۔

ہم نے سمجھایا: ''میاں جب دل جوان ہو تو بندہ خود کو عندلیب شادانی سمجھا ہی کرتا ہے، خیر، چھوڑو، یہ بتاؤ، آج آمدنی کتنی ہوئی؟''

ہمارے تحقیق نامکمل ہی رہی۔ ایک نوجوان سرو قد، خوش لباس وخوش خصال دُکان میں داخل ہوا۔ اپنی یو ایس بی موصوف کے حوالے کی اور کسی انتہائی پیچیدہ ٹیکنیکل فرمائش کا اظہار کیا۔ ہم تو خوش ہوگئے کہ آج موصوف کے ہزار پانچ سو پکّے۔ مگر صاحب، اِس بار بس ہمارے ارمان، بلکہ دم ہی نکلا کیوں کہ موصوف گھنٹہ بھر تک یو ایس بی اور کمپیوٹر کا دنگل کراتے رہے اور پسینے پسینے ہوگئے۔ کام کی مہارت دیکھ کر ''مرچنٹ نیوی'' میں ملازم وہ نوجوان جھوم اُٹھا اور سر ہلا کر بولا: ''واہ سر! کیا پیش کردوں؟''

غالباً موصوف گھبرا گئے کہ ''بچّہ'' انہیں ''سر'' کہہ کر پہچان چکا ہے کہ یہ ایک سرکاری پروفیسر ہیں۔ حالانکہ پاکستانی پروفیسر ہزار بار کہہ چکے ہیں: ''یار تم پروفیسر کہلوانے پر بُرا نہ منایا کرو کیونکہ اب تو تمہارا علاج ہو چکا ہے اور تم بہکی بہکی باتیں بھی نہیں کیا کرتے!''

موصوف نے ایک نظر اُس مال دار نوجوان کی جانب دیکھا اور فرمایا: دس رُپے!''

ہمارے تو آگ لگ گئی، اُس کے جانے کے بعد موصوف کو خوب خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ شام تک ہم سے کھنچے کھنچے رہے۔ شام کو حسبِ معمول پاکستانی پروفیسر اظہارِ تعزیت کے طور پر ''تالا'' اور تالے کی اوٹ میں چائے اور چائے کے لوازمات لے کر آئے تو ہم نے دوپہر کی واردات کا تذکرہ کیا کہ موصوف نے کس طرح گھر آئی لکشمی کو بھی لات مار باہر کیا۔ ہزار رُپے کا کام دس رُپے میں کیا اور فرمایا کہ ''کام ہی کیا تھا!''

پاکستانی پروفیسر نے گردن گھما گھما کر دُکان کا اور موصوف کے دگرگوں حلیہ کا جائزہ لیا اور کہا: "یار مجیب، اگر محبت، مروت، لاگ، لگاوٹ اور منافع کی یہی حالت رہی تو مہینوں بلکہ دِنوں میں بند ہو جانے والی اس دُکان کو تو گھنٹوں میں بند ہو جانا چاہیے۔"

موصوف رکوع میں چلے گئے (شدید ہنسی کے دوران وہ لیٹے لیٹے اچانک اُٹھ جایا کرتے ہیں اور اسی پوز کو اپنا کر ہنسا کرتے ہیں)

"ارے، یہ کیا؟ صرف دس رُوپے؟ اُفوہ! اس دورِ بے مہار میں دس رُپے تو بچہ عیدی بھی نہیں لیتا۔"

مُسکرا کر فرمایا: "آسان مثال دیا کریں، کیونکہ اسی لت کی بنا پر آپ کی پون جماعت خالی اور حاضری ادھوری ہوا کرتی ہے، مثلاً آپ یہ مثال بھی دے سکتے تھے کہ دس رُوپے تو اِس دور میں بھکاری بھی نہیں وصولتا۔"

ہم نے کہا: "بندۂ خدا، یہ ملازمت تو ایک طرف، مثال بھی آپ کے شایانِ شان نہیں، کہاں ایک پروفیسر اور کہاں یہ دُکان!"

ہرگز ملول نہ ہوئے، بتایا: "دیکھئے، سرکاری ٹیچنگ تو نری 'اُستادی' ہوا کرتی ہے، اصل 'جاب' تو یہی ہے، پروفیسری تو پارٹ ٹائم ہے۔"

اِتنا فرما کر دس رُوپے احتیاط سے اُس عفیفہ کے "غلّے" میں امانتاً رکھے اور کُرسی پر لیٹ گئے۔

بقول پاکستانی پروفیسر: "موصوف عمر کے اُس حصے میں ہیں جب آدمی کو ہر چیز کے دو پہلو نظر آیا کرتے ہیں، ایک تاریک۔ اور دوسرا زیادہ تاریک۔

موصوف کی عمریا:

پروفیسر پاکستانی حلفیہ بیان جاری رکھتے: "بھائی میرے، یہ صاحب دُکان داری ایسی عمر میں کر رہے ہیں جب انسان موچنے سے اپنے ہی سر کے بال اکھاڑتا ہے، یاد رکھیے، صرف کالے بال۔

غالباً موصوف کو بھی اپنی سنجیدہ عمر کا احساس ہو چکا ہے اس

لیے صرف بال بچے دار خواتین ہی پر ان کی طبیعت آتی ہے، نظر اور بدن دونوں موٹے ہو چکے ہیں۔ قیاس ہے کہ ستر سالہ عفیفہ بھی انہوں نے منفی سات کی عینک لگا کر ملاحظہ فرمائی ہوگی، اور وہ حرافہ بھی ان سے اپنی اولاد جیسا برتاؤ کیا کرتی ہے، یعنی سب کے سامنے بچوں کو بلا وجہ ڈانٹا ڈپٹنا اور تنہائی میں مارنا بھی۔

موصوف عمر کے اس اسٹیج پر ہیں جہاں آدمی اپنی ہی عمر کے لوگوں سے اس ڈر سے ہاتھ نہیں ملاتا کہ ہر مصافحہ کے بعد اُس کی عمر میں دس سال کا اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔" اتنا کہہ کر پروفیسر پاکستانی نے دم لے کر ارشاد فرمایا: "یہ عینک تو سازِ سخن بہانہ ہے، کوئی دن جاتا ہے کہ لڑکیاں، بالیاں موصوف کے چشمے کا لحاظ کیے بغیر، دامے، درمے، سخنے اِن کے سامنے پھرا کریں گی۔"

موصوف شاید سمجھ گئے کہ پروفیسر پاکستانی اُن کے "نوآورد" ہونے کا فائدہ اُٹھا رہے ہیں، چنانچہ وہ انہیں "مسلمان نظروں" سے دیکھنے لگے۔ بقول پروفیسر پاکستانی: "مسلمان نظریں، مسلمانوں نے صرف حلال جانوروں کے لیے سنبھال رکھی ہیں۔"

موصوف کی "ہاٹ" (دُوکان) کی بدولت آس پاس کے لدھڑ سے لدھڑ پڑوسیوں کی چال میں اس قدر چُستی اور چابک دستی پیدا ہو چکی تھی کہ جب بھی کوئی گاہک اِن کی دُکان کے سامنے سے گزرتا تو اُس کی چال میں ایک چُستی، مستی، تندی اور تیزی کے

جلوے کوندا کرتے، مبادا موصوف اُسے اپنے دُکان میں کھینچ کر ''منفت کرم داشتہ..'' کے مرتکب ہو جائیں۔

خیر، دن گزرتے رہے۔

موصوف کی دُکان یوں چلتی رہی جیسے قرۃ العین حیدر کی کہانی۔

ایک روز ہم نے باتوں باتوں میں پوچھا: ''فرض کیجیے، دُکان چل پڑتی ہے، تو پھر آپ کیا کریں گے؟''

لیٹھے لیٹھے کسی اور دنیا میں پہنچ چکے تھے، دھڑ سے جواب دیا: ''خودکشی کرلوں گا۔''

اس پر پروفیسر پاکستانی بولے: ''یعنی تاریخِ وفات، آلۂ قتل اور موقعِ واردات کا انتخاب حضرت خود ہی کریں گے، یار یہ تو اپنی کتاب کا مقدمہ آپ لکھنے کے مترادف ہوا۔ اور پھر تم تو ایسا جرم کرنے جا رہے ہو جس کی سزا کم از کم اُس وقت ملتی ہے جب بندہ ارتکابِ جرم میں ناکام ہو جائے اور ناکام ہونا تو تم نے سیکھا ہی نہیں، مثلاً دُکان ہی کی مثال لے لیجیے، برسوں میں بند ہوتی دُکان آپ نے ایک ہی جھٹکے سے دِنوں، بلکہ منٹوں میں بند کردی۔''

ہرگز بُرا نہ مانے، مسکرا کر فرمایا: ''لیکن میرا تجربہ اس قدر وسیع ہو جائے گا، اس میدان میں کہ، میرا مستقبل آپ سینئرز جیسا تاریک ترین تو نہیں ہوگا۔۔۔''

پروفیسر پاکستانی نے بات اُچک لی: ''بلکہ اس سے بھی انشاء اللہ دو آتشہ ہی ہوگا۔ یار، دراصل، موصوف کا مستقبل واقعی انتہائی روشن ہے۔

وہ جو، دھوبی کا گدھا دن بھر سخت محنت مشقت کیا کرتا، دھوبی اُسے کھانے کو نہ دیا کرتا، کام پہ کام لیا کرتا، لیکن جب کبھی غصے میں ہوتا تو اپنی باغی، جوان چھوکری کو ڈپٹتا، کہ میرا بس چلا تو تیری شادی کسی گدھے سے کردوں گا۔ اسی آس و نراس میں وہ غریب دن بِتا تا رہا۔''

ہمارا جب کبھی بے تحاشا ''ریلیکس'' ہونے کا موڈ ہوا کرتا تو ہم ''دُکانِ بے چلن'' کا رُخ کیا کرتے۔ کئی مرتبہ اپنے قیمتی ''کمپیوٹر'' کی ونڈوز میں چھینک چھینک کر اور کھانس کھانس کر انتہائی خطرناک ''وائرس'' داخل کیا کرتے کہ موصوف کی دُکان پر جانے کا موقع تو مل جائے گا۔

موصوف کا شمار اُن ''بچوں'' میں کیا جائے گا کہ جس بچّے نے اپنی ماں سے کہا تھا کہ امّی۔۔۔ امّی مجھے اندھیرے میں ڈر لگتا ہے اور ایک بڑا سا کالا دیو نظر آتا ہے۔ ماں نے جواب دیا: ''تُو مرد بچہ ہے، بیٹا، اب کے وہ دیو تجھے نظر آئے تو آگے بڑھ کر وار کرنا، وہیں پتا چل جائے گا کہ حقیقت ہے یا محض تیرا وہم۔'' بچّے نے پوچھا: ''اور امّی اگر اُس کالے دیو کی امّی نے بھی اُسے یہی نصیحت کی ہو تو؟''

موصوف اس قدر محتاط تھے کہ بقول پروفیسر پاکستانی: ''یار اس آدمی کو اگر آبِ حیات بھی مل جائے تو اُبال کر پئے گا!''

مثل مشہور ہے فقیر کی گالی، عورت کے تھپڑ اور مسخرے کی بات سے کوئی آزردہ نہیں ہوا کرتا، یہ قول ہمارا نہیں، ایک شاندار

مولانا جامی رحمتہ اللہ علیہ کے زمانے کا ایک شاعر ساغری اکثر یہ دعویٰ کیا کرتا تھا کہ اس کے اشعار میں جتنے بھی تازہ معانی ہیں وہ دوسرے شاعر چرا لیتے ہیں۔ ایک دن مولانا کی رگ ظرافت جو پھڑکی تو انہوں نے اس پر ایک قطعہ کہہ ڈالا۔ جس کا مطلب تھا کہ ساغری جو یہ کہتا پھرتا ہے کہ اس کے تازہ معانی دوسرے شعرا نے چرا لئے ہیں تو ٹھیک ہی کہتا ہے۔ کیونکہ میں اس کے تمام شعر دیکھ ڈالے ہیں۔ کسی ایک میں بھی کوئی تازہ معانی نظر نہیں آئے۔ یہ قطعہ سارے شہر میں مشہور ہو گیا۔ ساغری روتا روتا مولانا کے پاس آیا کہ حضور یہ آپ نے کیا کر دیا۔ میں تو بدنام ہو گیا ہوں۔

مولانا فوراً بولے ''بھئی میں نے تو کہا تھا "شاعری می گفت" (کوئی شاعر کہتا تھا) کسی منچلے نے "شاعری" کی بجائے "ساغری" کر دیا۔''

کٹ گئی میری پان کی بیگم اِک چڑی کے غلام کی خاطر (احمد میاں داماد)

ایک مرتبہ مولانا حالی سہارنپور گئے اور وہاں کے ایک معزز رئیس زمیندار کے پاس ٹھہرے۔ گرمی کے دن تھے اور مولانا کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ اسی وقت اتفاق سے ایک کسان آ گیا تو رئیس نے اسے کہا کہ جو بزرگ آرام کر رہے ہیں ان کو پنکھا جھلو۔ وہ پنکھا جھلنے لگ گیا۔
تھوڑی دیر بعد اس کسان نے رئیس سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ رئیس نے کہا، کم بخت تو ان کو نہیں جانتا یہ مولوی حالی ہیں اور سارے ہندوستان میں ان کا چرچا ہے۔ یہ سن کر وہ کسان بولا، "حضور کبھی ہالی (ہل چلانے والے) بھی مولوی ہوئے ہیں۔"
مولانا حالی یہ سن کر پھڑک کر اٹھے اور رئیس سے کہنے لگے، "حضرت اس تخلص کی داد آج ملی ہے۔"

پروفیسر ابلیسی کا ہے۔

پروفیسر ابلیسی:

بقول پروفیسر پاکستانی: ''تم جیسا مزاح گو تو بڑے خوش نصیب ہوا کرتے ہیں کہ تمہاری فاش سے فاش غلطی کو بھی پڑھنے والے مزاح کا کوئی پہلو سمجھتے ہیں، لیکن کیا کرا جائے، کہ، تم پروفیسر ابلیسی کو ہنسا کر دکھاؤ تو جانیں۔''

ہم بولے: ''وہ خدا کا بندہ پورا ہفتہ پابندی سے کالج آئے، تو بات بنے نا۔ دو چار دن بعد آتے ہی اسٹاف روم میں کُرسیاں اُلٹ دیتا ہے، میز کے پائے توڑ دیتا ہے، پانی کا جگ زمین پر پٹخ دیتا ہے اور فرسٹ ائر میں جا کر ''سیکنڈ ائر'' کی کلاس لیتا ہے۔ اُس روز چاہے کچھ پہنے، نہ پہنے، سیاہ گاؤن ضرور پہنتا ہے، لوہے کے بھاری بوٹ جیسے فوجی بوٹ ہوا کرتے ہیں، پہنتا ہے، لوہے کا خود سر پر دھرے انتہائی کرب کے عالم میں کلاس لے کر ثابت کر دیتا ہے کہ پورے دانش کدے میں اک وہی ''چلن بے شتر'' ہے۔ اس کی ہر بات میں کسی نہ کسی طرح سے موسم کی خرابی چھپی ہوتی ہے۔ کبھی گیلے کپڑے نہ سوکھنے کا شکوہ کرتا ہے تو کبھی جامعۂ شہر کے ''کنٹرولر اگزامینشن'' کے نامہرباں رویے پر گھگھیاتا ہے۔''

اس پر، پروفیسر پاکستانی گویا ہوئے: ''ذات کا بھی پیچھے سے رانگڑ ہے، زبان اور قواعد کی پابندی کو تکلف بھی نہیں سمجھتا۔ تم جتنی کوشش اور کاوش سے غلط زبان لکھتے ہو، جاتے ہی محض ایک ڈسٹر سے تمہارا چھاپا، پورا تختۂ سیاہ بالکل سیاہ کر کے دَم لیتا ہے۔ صاحب، یہ تو سانس بھی اُلٹی گنتی کی طرح لیتا ہے، واضح رہے، اس کی دو سانسوں کے درمیان سو سے ایک تک کی اُلٹی گنتی ہوا کرتی ہے۔ اُس روز کی مثال ہے لے لو، پرنسپل نے بار بار اِسے، اپنی شکارگاہ (آفس) میں بُلایا تو اِس نے اپنے چہرے سے ایسے اوچھے 'امپریشن' دئے کہ پرنسپل تو مغلظات پر اُتر آیا۔ اِس کا فائنل ٹرم کا بنایا ہوا، امتحانی پرچہ نکال کر اُس نے جابجا اوچھے نشانات مثلاً: '''' ۔؟! لگانے شروع کر دئے اور بالآخر پورے مسودے پر قلم پھیرتے ہوئے فرمایا: ''کسی ایک زبان کا انتخاب کیجئے، بچّے آپ کے تجرِ علمی کی تاب نہیں لا سکیں گے!''

اس پہ وہ ابلیسی بولا: ''اجی جانے دیجئے، ہمارا تجرِ علمی تو آپ کے خاندان کے مقابلے میں کچھ نہیں، یاد نہیں، آپ کے باوا آدم، مسجد غیر مسلم کی ٹنکی میں زنجیر سے بندھے گلاس سے استنجا کر کے سڑکوں پر سُکھاتے پھرتے تھے۔ چلے ہیں ہمیں زبان کی تعلیم دینے والے۔''

تس پہ پروفیسر پاکستانی نے حلفیہ اقرار کیا: ''ابلیسی کہ یہ گالی سُن کر پرنسپل کالج ہٰذا نے اُس کی ہمشیرہ کو اپنے نکاح میں لینے اور وظیفۂ زوجیت ادا کرنے کی خواہش کا فی الفور اعتراف کیا، بعد ازاں سر پھٹول کے بعد دونوں نزدیکی سرکاری اسپتال میں پٹیاں کرواتے پائے گئے۔

نشتر امروہوی

میں سیاست ہوں کرپشن، ظلم دہشت میرا نام
میرے گردوپیش رہتا ہے ہمیشہ قتلِ عام
ذکر ہوتا ہے مرا گولی کی بوچھاروں کے ساتھ
ذہن میں آتی ہوں تلواروں کی جھنکاروں کے ساتھ
میری اک حرکت سے ہوتا ہے وطن زیروزبر
میری مکاری جھکا دیتی ہے سچائی کا سر
ایک چنگاری مری گلشن کو کرتی ہے تباہ
مانگتا رہتا ہے میری آگ سے دشمن پناہ
میری کوشش سے پلٹ جائے حکومت کا نظام
رحم کے الفاظ میری زندگی میں ہیں حرام
بس کرپشن ہے مری خوراک یوں جیتی ہوں میں
اور پھر بے خوف انساں کا لہو پیتی ہوں میں
گود میں غنڈوں کے اکثر پرورش پاتی ہوں میں
ظالموں کے بازوؤں پر زلف لہراتی ہوں میں
میں شریفوں سے بھلا دوچار ہوتی ہوں کہاں
گود میں پل کر کرپشن کی میں ہوتی ہوں جواں
جن کو مل پاتی نہیں ان کے گناہوں کی سزا
بس وہی دشمن وطن کے میری بنتے ہیں غذا
ریڈ سے بس سی بی آئی کے ہی گھبراتی ہوں میں
اپنے گھر میں بھی صدا پنجوں کے بل جاتی ہوں میں
میں ہوں دنیا سے نرالی اور نرالی میری شان
بند ہوتی ہیں مری آنکھیں تو کھل جاتے ہیں کان
موت بن کر زندگی کے سر پہ چھا جاتی ہوں میں
دھرم اور مذہب کی چٹانوں سے ٹکراتی ہوں میں

دھرم اور مذہب کے ٹھیکیدار ہیں میری سپاہ
میں بنا دیتی ہوں ان کو بس خیالی بادشاہ
ان کے سر پر باندھ دیتی ہوں میں یہ کہہ کر کفن
تم بہادر ہو نڈر ہو شیر دل ہو صف شکن
خاک کھائی اور بس دن رات آنسو ہی پئے
ایسے جینے پر ہے لعنت یوں جئے تو کیا جئے
نوجوانو !! اتنی ذلت کس لئے سہتے ہو تم
مرد ہو کر ٹھوکروں کی زد میں کیوں رہتے ہو تم
میں نکلتی ہوں کبھی رتھ یاترا کی شکل میں
بیٹھ جاتی ہوں تعصّب کی طرح ہر عقل میں
میری تقریروں سے لگ جاتی ہے پھر ہر سمت آگ
بس الیکشن کی طرف پھر موڑ دیتی ہوں میں باگ
ہر طرف لٹتی ہے پھر تو اس وطن کی آبرو
پشت پر ہوتی ہیں لاشیں ہڈیاں ڈھانچے لہو
کس سے رکتی ہوں جب اپنی آن پر آتی ہوں میں
پھر کبھی میرٹھ کبھی گجرات بن جاتی ہوں میں
بس غریبوں اور لاچاروں سے ہی لیکر خراج
میں کمینوں کے سروں پر رکھ دیا کرتی ہوں تاج

تعارف

نشتر امروہوی

مرے دادا جو برٹش فوج کے نامی بھگوڑے تھے
نہ جانے کتنی جیلوں کے انہوں نے قفل توڑے تھے
چرس کا اور گانجے کا وہ کاروبار کرتے تھے
خدا سے بھی نہیں ڈرتے تھے بس بیوی سے ڈرتے تھے
مرے تائے بھی اپنے وقت کے مشہور چیٹر تھے
کئی جیلوں کے تو وہ ہاف ایرلی بھی وزیٹر تھے
ہر اک غنڈہ انھیں گھر بیٹھے غنڈہ ٹیکس دیتا تھا
تجوری توڑنے کا فن انھیں سے میں نے سیکھا تھا
چچا مرحوم ناسک جیل سے جب واپس آئے تھے
تو مشہورِ زمانہ اک طوائف ساتھ لائے تھے
وہ ٹھمری دادرا اور بھیرویں میں بات کرتی تھی
ترنّم میں سریا اور لتا کو مات کرتی تھی

مرے والد خدا بخشے کہیں آتے نہ جاتے تھے
صبح سے شام تک امّاں کے آگے دم ہلاتے تھے
تھی اک بکرے نما براّق داڑھی ان کے چہرے پر
مگر پھر بھی کبڈّی کھیلتے تھے رات کو اکثر
میں اپنے باپ دادا کے ہی نقشِ پاء پہ چلتا ہوں
مگر بس فرق اتنا ہے وہ غنڈے تھے میں نیتا ہوں
پولس پیچھے تھی اُن کے تھرڈ ڈگری کی ضیافت کو
مرے پیچھے بھی رہتی ہے مگر میری حفاظت کو
نہیں پرواہ لیڈر کون اچھا کون گندہ ہے
سیاست میری روزی ہے الیکشن میرا دھندہ ہے
سیاست میں قدم رکھ کر حقیقت میں نے یہ جانی
"چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی"

نشتر امروہوی

شکوہ

کیوں غلط کام کروں فرض فراموش رہوں
کیوں نہ فرض اپنا ادا کر کے سبکدوش رہوں
طعنے دنیا کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا میں کوئی بدھو ہوں کہ خاموش رہوں

جرأت آموز میری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ بیگم سے یہ خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہے بجا خدمتِ ازواج میں مشہور ہیں ہم
صرف صورت سے نہیں دل سے بھی رنجور ہیں ہم
اپنے ہی گھر میں بہت بے کس و مجبور ہیں ہم
حقِ محنت نہ ملے جس کو مزدور ہیں ہم

اب ذرا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
بنا پیسوں کے ملازم کا گلہ بھی سن لے

یوں تو برسوں سے مسلّط ہے تری ذاتِ قدیم
کھوپڑی عقل سے خالی ہے جسامت سے ضخیم
پھر بھی ہر بات تیری جائز و بے جا تسلیم
شرط انصاف ہے اے زوجۂ اولادِ یتیم

اپنا کچھ حال بھی ہو تجھکو سنوارا ہم نے
کرلیا شوق کی ہر شے سے کنارا ہم نے

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے مکاں کا منظر
کوئی آتا ہی کہاں تھا تیرے دروازے پر
اور دو چار جو آئے تیرا رشتہ لیکر
ان میں ایم اے تھا نہ بی اے تھا نہ کوئی انٹر

شدّتِ جذبۂ شادی نے کیا کام تیرا
پھوٹنی تھی مری قسمت جو لیا نام تیرا

ہم کماتے ہیں تو بس تیری ہی خدمت کے لئے
خرچ کرتے ہیں فقط تیری مسرّت کے لئے
رشوتیں لیتے ہیں کیا اپنی ضرورت کے لئے
قیس جنگل میں گیا تھا کوئی دولت کے لئے

دل زرومالِ جہاں سے جو محبت کرتا
عشقِ ممتاز میں پھر تاج محل کیوں بنتا

تیری خاطر جو کسی بات پہ اڑ جاتے ہیں　　پیر گھر والوں کے گھر سے ہی اکھڑ جاتے ہیں
تجھ سے برہم ہوا کوئی تو بگڑ جاتے ہیں　　بھائی کیا چیز ہے ہم باپ سے لڑ جاتے ہیں

دبدبہ تیرا ہر اک دل پہ بٹھایا ہم نے
تونے جو کہدیا وہ کر کے دکھایا ہم نے

تو ہی کہدے کہ دبایا ہے تیرا سر کس نے　　بیڈ ٹی تجھ کو پلائی ہے بنا کر کس نے؟
کبھی ساڑی تو کبھی دھوئے ہیں جمپر کس نے　　تونے جو مانگ لیا وہ دیا لا کر کس نے

تیرے ہر حکم پہ سر اپنا جھکایا ہم نے
تیری خدمت سے کبھی جی نہ چرایا ہم نے

آگیا ہے کبھی آفس میں اگر تیرا خیال　　پھر کوئی کام کرالے نہیں افسر کی مجال
فائلوں میں نظر آتا ہے تیرا رعب وجلال　　لگنے لگتا ہے اسی وقت سے آفس جنجال

طعنہ زن دنیا ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں
اپنے خاوند کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں

لڑکیاں یوں تو حسیں بھی تھیں طرحدار بھی تھیں　　کچھ تھیں بدکار تو کچھ صاحبِ کردار بھی تھیں
ان میں کاہل بھی تھیں جاہل بھی تھیں ہشیار بھی تھیں　　مجھ سے شادی کیلئے درجنوں تیار بھی تھیں

پر تیرے نام پہ ہی انگلی اٹھائی کس نے؟
تیری تقدیر جو بگڑی تھی بنائی کس نے؟

رشتہ شادی کا لئے ہم سحر و شام پھرے　　جیسے مایوس کوئی بندۂ آلام پھرے
کوئی ہاتھوں میں لئے جیسے تہی جام پھرے　　ہم بجز تیرے ہر اک جگہ سے ناکام پھرے

صاحبِ زر نہیں بے زر بھی نہ چھوڑے ہم نے
عقل کے سیکڑوں دوڑا دئے گھوڑے ہم نے

تو نہیں تھی تو فقط تیری پریشانی تھی　　ورنہ واللہ ہر اک بات کی آسانی تھی
کھانے پینے کی ہر اک شے کی فراوانی تھی　　کبھی چٹنی تھی میسّر کبھی بریانی تھی

کبھی اس طرح بھی دن اپنا گذارا ہم نے
ایک دعوت میں ہی دو دن کا ڈکارا ہم نے

نہ ہوتا اگر کام درپیش تم سے　　تو یوں روز تیمارداری نہ ہوتی　　(نیازسواتی)

جب بھی میکے سے تیرے کوئی خبر آئی ہے
پھر سے جانے کو ہے تیار ابھی آئی ہے
دل بھی دھڑکا ہے میرا ، جیب بھی تھرآئی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے
اُس پہ ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار تو ہیں مرنے کو تیار نہیں

یوں تو شوہر بہت ایسے ہیں جو خوشحال بھی ہیں
کچھ بھنڈیلے بھی ہیں شاعر بھی ہیں قوال بھی ہیں
اُن میں بقراط بھی ہیں عقل سے کنگال بھی ہیں
اور کچھ میری طرح مفلس و بد حال بھی ہیں
بندہ و صاحب ومحتاج و غنی ایک ہوئے
آئے بیگم کی جو زد میں تو سبھی ایک ہوئے

میرے حالات وہی میں بھی وہی تو بھی وہی
ہاتھ میں تیرے یہ بیلن وہی جھاڑو بھی وہی
میرے جذبات وہی اور تیرا جادو بھی وہی
مار کھانے کو میرا سر وہی پہلو بھی وہی
پھر بھی الجھن یہ تیری غیر سبب کیا معنی
اپنے خاوند پہ یہ چشمِ غضب کیا معنی

تیرے ہر حکم پہ پھرتا رہا دوڑا دوڑا
تیرے گھر والوں کے خرچے سے کبھی منہ موڑا
تیرے ماں باپ کا یا تیرا کبھی دل توڑا
ساتھ چھوڑا تو تیرے ساس سسر کا چھوڑا
عشق کی آگ کو سینوں میں دبی رکھتے ہیں
ہم وہی جذبۂ قیسِ عربی رکھتے ہیں

مساوات اس کو کہتے ہیں نئی تہذیب کیا کہنا
کہ یکساں ہوگئی صورت زنانی اور مردانی
(ظریف لکھنوی)

جوابِ شکوہ

نشتر امروہوی

آہ جب دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے — گلشنِ زیست جلانے کو شرر رکھتی ہے
توپ تلوار نہ یہ تیغ و تبر رکھتی ہے — بنتِ حوّا کی طرح تیر نظر رکھتی ہے
اتنا پُر سوز ہوا نالۂ سفّاک مرا
کر گیا دل پہ اثر شکوۂ بے باک مرا

یہ کہا سن کے سسر نے کہ کہیں ہے کوئی — ساس چپکے سے یہ بولیں کہ یہیں ہے کوئی
سالیاں کہنے لگیں قرب و قریں ہے کوئی — سالے یہ بولے کہ مردود و لعیں ہے کوئی
کچھ جو سمجھا تو پھر ہم زلف نے بہتر سمجھا
مجھ کو بیگم کا ستایا ہوا شوہر سمجھا

اہلیہ کہنے لگیں سن کے یہ میری روداد — کیوں سناتے ہو مجھے تم بھلا اپنی فریاد
کیا یہی تم کو سکھاتے ہیں تمہارے اجداد — جس پہ تم ظلم کرو اس کو بتاؤ جلاّد
ناز ہے قوت بازو پہ پہلوانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں دیوانوں کو

اپنے حالات پہ تم غور ذرا کرلو گر — جلد کھل جائے گی پھر ساری حقیقت تم پر
ہم نے اگنے نہ دیا ذہن میں نفرت کا شجر — تم پہ ڈالی ہے سدا ہم نے محبت کی نظر
کہہ کے سرتاج تمہیں سر پہ بٹھایا میں نے
تم تو بیٹے تھے فقط باپ بنایا میں نے

میں نے سسرال میں ہر شخص کی عزت کی ہے — ساس سسرے ہی نہیں نندوں کی خدمت کی ہے
جیٹھ دیور سے جٹھانی سے محبت کی ہے — میں نے دن رات مشقت ہی مشقت کی ہے
پھر بھی ہونٹوں پہ شکایت یا گلہ کچھ بھی نہیں
میری دن رات کی محنت کا صلہ کچھ بھی نہیں

پھاوڑے کا نام سن کر جس کی ٹل جاتی ہے ناف — اس کا یہ دعویٰ ہے وہ اس دور کا فرہاد ہے (ظفر کمالوی)

ہر صبح بچوں کو تیار کراتی ہوں میں ناشتہ سب کے لئے روز بناتی ہوں میں
باسی تم کھاتے نہیں تازہ پکاتی ہوں میں چھوڑنے بچوں کو اسکول بھی جاتی ہوں میں

اب ذرا سوچئے انسان ہوں میں جن بھی نہیں
میری قسمت میں تو چھٹی کا کوئی دن بھی نہیں

وہ بھی دن تھے کہ دلہن بن کے میں جب آئی تھی ساتھ میں جینے و مرنے کی قسم کھائی تھی
پیار آنکھوں میں تھا آواز میں شہنائی تھی کبھی محبوب تمہاری یہی ہر جائی تھی

اپنے گھر کے لئے ہستی یہ مٹا دی میں نے
زندگی راہِ محبت میں لٹادی میں نے

کس قدر تم پہ گراں ایک فقط ناری ہے دال روٹی جسے دینا بھی تمہیں بھاری ہے
مجھ سے کب پیار ہے اولاد تمہیں پیاری ہے تم ہی کہدو یہی آئین وفا داری ہے

گھر تو بیوی سے ہے بیوی جو نہیں گھر بھی نہیں
یہ ڈبل بیڈ نہیں تکیہ نہیں چادر بھی نہیں

میں نے مانا کہ وہ پہلی سی جوانی نہ رہی ہر شبِ وصل نئی کوئی کہانی نہ رہی
قلزمِ حسن میں پہلی سی روانی نہ رہی اب میں پہلے کی طرح رات کی رانی نہ رہی

اپنی اولاد کی خاطر میں جواں ہوں اب بھی
جسکے قدموں میں ہے جنت وہی ماں ہوں اب بھی

تھے جو اجداد تمہارے نہ تھا ان کا یہ شعار تم ہو بیوی سے پریشان وہ بیوی پہ نثار
تم کیا کرتے ہو ہر وقت یہ جوتم پیزا ر تم ہو گفتار کے غازی وہ سراپا کردار

اپنے اجداد کا تم کو تو کوئی پاس نہیں
ہم تو بے حس ہیں مگر تم بھی تو حساس نہیں

نہیں جن مردوں کو پروائے نشیمن تم ہو اچھی لگتی ہے جسے روز ہی الجھن تم ہو
بن گئے اپنی گرہستی کے جو دشمن تم ہو ہوکے غیروں پہ فدا بیوی سے بدظن تم ہو

پھر سے آباد نئی کوئی بھی وادی کرلو
کسی کل لبنی سے اب دوسری شادی کرلو

روبینہ شاہین بیناؔ

یوں تو چھوٹی ہے ذات بکرے کی
سخت لگتی ہے لات بکرے کی

مارتا ہے وہ تاڑ کر ٹکر
جان لیوا ہے گھات بکرے کی

بن سنور کر کھڑا ہے منڈی میں
آج ہونی ہے بات بکرے کی

ایک بکری پہ ہو گیا لٹو
ہے عجب واردات بکرے کی

خیر کب تک منائے گی اماں
عید کا دن ہے رات بکرے کی

تکہ تکہ ہے بوٹی بوٹی ہے
سامنے ہے پرات بکرے کی

آگیا ہے چھری تلے بیناؔ
ہو گئی ہے نا مات بکرے کی

آج کا المیہ

پہلے کہتے تھے رمضان آیا ہے جی

لوٹ لو۔۔۔لوٹ لو

لگ گئی ہر طرف رحمتوں کی جھڑی

مانگ لو مانگ لو جو بھی ہے مانگنا

اپنے رب سے ہمیشہ کرم مانگنا

اب یہ عالم ہے کہ ہر گھڑی شہر میں

شور ہوتا ہے کہ مانگئے مانگئے

ہم ہیں بیٹھے یہاں آپ ہی کے لئے

کس لئے سوچتے ہیں ارے آپ بھی

دیں گے سب کچھ یہاں

من پسند ریٹ پر

کھل کے مانگو یہاں

ہے یہ زر کا جہاں

ماہِ رمضاں ہوا اب تو ماہِ گراں

روبینہ شاہین بیناؔ

اقبال شانہ

ہاسپٹل میں عید

کس لئے چاند رات کو آخر
چھت پہ دیکھا تو تم ہوئے ظاہر

بال شب کو سکھا رہے تھے کیا؟
خود ہی کچھ گنگنا رہے تھے کیا؟

اِک بڑا بیوقوف تھا وہ تو
دیکھ کر چاند کہہ دیا تم کو

اور خوشی سے اچھل پڑے تھے تم
چھت سے نیچے پھسل پڑے تھے تم

ایکس رے وارڈ میں پڑے ہو تم
مردہ خانے میں ڈھونڈتے ہیں ہم

اور نہ جانے کہاں کہاں کی پھر
ہڈیاں ٹوٹ ہی گئیں آخر

اِک تمہاری جو دید ہوتی ہے
''ہاسپٹل'' میں عید ہوتی ہے

ڈاکٹر سید مظہر عباس رضوی

لُٹایا تھا کبھی پہلے، لٹا اب دل نہیں سکتا
کہ اب عشاق کا دامن دریدہ سِل نہیں سکتا
کوئی محبوب سے خلوت میں ہرگز مل نہیں سکتا
ہے گرمی اس قدر کوئی یہاں پر chill نہیں سکتا
ہل اسٹیشن ہے یہ کوئی جہاں پر ہل نہیں سکتا

ہوائیں گرم سانسوں کی کریں ماحول آلودہ
کرے معدے کو یخ بستہ فقب اب سرد فالودہ
نکل آیا ہو چھلکے سے کہ جیسے آم کا گودا
کہیں "بے ہودیاں" اچھلیں کہیں پر اچھلیں بے ہودہ
ہل اسٹیشن ہے یہ کوئی جہاں پر ہل نہیں سکتا

تڑپ کر موج جیسے برسرِ ساحل لڑھکتی ہے
کہیں پر جیک لڑھکے ہے کہیں پر جل لڑھکتی ہے
یہاں اک دو نہیں ہیں ساری ہی محفل لڑھکتی ہے
جو رستے ڈگمگاتے ہیں تو پھر منزل لڑھکتی ہے
ہل اسٹیشن ہے یہ کوئی جہاں پر ہل نہیں سکتا

لڑھکتے ہیں کہیں پر Humpty Dumpty، Ball کی صورت
کہیں پر ہرنیاں ماریں قلنچیں غول کی صورت
کہیں پر مولوی صاحب بنیں لاحول کی صورت
بنی ہے ایسی ہل اسٹیشنی ماحول کی صورت
ہل اسٹیشن ہے یہ کوئی جہاں پر ہل نہیں سکتا

جو گرمی سے مرا جائے وہ اب بھاگا مری جائے
جہاں جاتا تھا گورا اب وہاں کالا مری جائے
کبھی سالی مری جائے کبھی سالا مری جائے
کہ گاڑی تو ہے گاڑی سائکل والا مری جائے
ہل اسٹیشن ہے یہ کوئی جہاں پر ہل نہیں سکتا
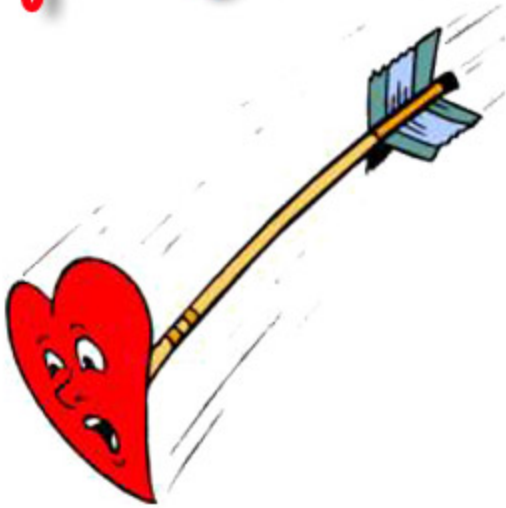
پہلے پہلے پیار میں پیارے! تیرا بھیجا گھوم گیا ہے

اس سے پہلے اس کا ابا تجھ کو گنجا کر دے
تیرا ٹخنہ توڑ کے تیرا گھٹنا ٹیڑھا کر دے
آناً فاناً تجھ کو اپنے شہر سے چلتا کر دے
اس کا بھائی تیرے سر کی پچ پر کرکٹ کھیلے
اس کا ماموں تیرے بوتھے پر تیزاب انڈیلے
اس کا چاچا تجھ کو کالج میں بھی آن دبوچے
اس کی چاچی تیری بے بے تیرے گھر کو کوسے
اس کی ماسی تیری گلی میں تیرا بینڈ بجا دے
اس کی اماں تجھ کو اپنا دسترخوان بنا دے
سارے مل کر تیری کوفتہ بریانی پکوا دیں
تجھ کو ہاف ٹکٹ پر اوپر اور اوپر پہنچا دیں

اس کو باجی کہہ دے پیارے! اس کو باجی کہہ دے

سید فہیم الدین

محمد خلیل الرحمٰن
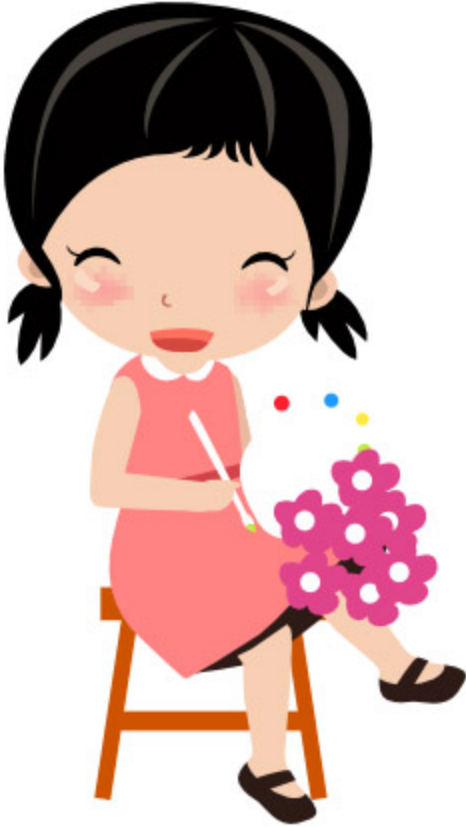
حیف جس دن سے مری آنکھوں میں شیلا بس گئی
میری ساری منتیں تو نذرِ اتاں ہوگئیں

ہائے اتاں ایک پل اُس کو نظر بھر دیکھ لو
کیوں بھلا دیکھے بِنا اس سے گریزاں ہوگئیں

قید گھر میں کردیا ہے مجھ کو ، اچھا یوں سہی
میری آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

دیکھ لو بس ایک پل پھر میں ہی پوچھوں گا تمھیں
میری اتاں خود ہی محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

اُس نگوڑی صائمہ میں کیا دھرا ہے تُم کہو
خالہ اتاں جانے کیوں اُس کی غزل خواں ہوگئیں

سامنے ابّا کے میں بن موت مارا جاؤں گا
یہ تمہاری سختیاں بھولے سے گر واں ہوگئیں

مان جاؤ تم تو آگے منزلیں آسان ہیں
ورنہ دنیا کیا کہے گی، کیسی اتاں ہوگئیں

ہماری فلم میں یوں تو کئی کردار ہوتے ہیں
مگر پِٹتا ولن ہی ہے ولن تیرا ہو یا میرا (قتیل شفائی)

قربان جائیے
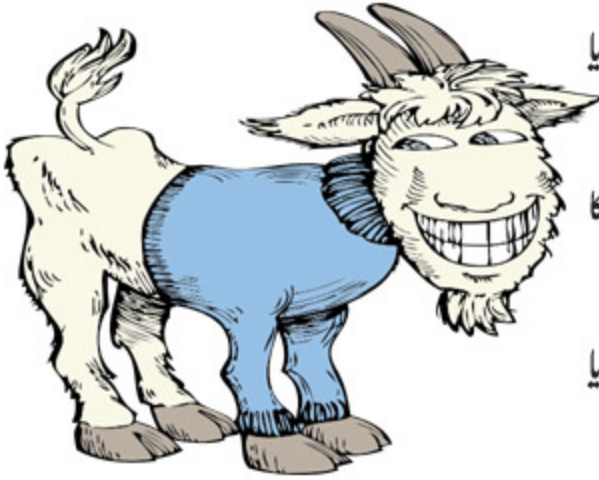
محمد خلیل الرحمٰن

کل شب کسی نے ہم سے یہ محفل میں کہہ دیا
آنے کو ہے وطن میں جو یہ عیدِ الضحیٰ
سالم جو چاہیے تو ہے ستر ہزار کی
گائے کا ایک حصہ ہے اب دس ہزار کا
منڈی نہ جائیں تب بھی کوئی غم نہیں جناب
مسجد سے مولوی نے یہ اعلان کردیا
سالم خرید لائیں گے اِک گائے کیا حضور
یا مولوی کی گائے میں حصہ ہے آپ کا
دوپل حساب کرتے رہے اور بعد ازاں
ہم نے بصد خلوص جواب اُن کو دے دیا
منڈی چڑھی ہوئی جو امسال بھی بہت
ہم نے کچھ اور اب کے ارادہ ہے کرلیا
ہر شے گراں ہوئی ہے، مگر ایک کارتوس
انسانی جان کے لیے ارزاں بھی ہوگیا
اپنی ہی جان اب کے فدا کرسکیں گے ہم
رسمِ خلیل ایسے ادا کرسکیں گے ہم

ہائے بجٹ

انجینئر عتیق الرحمٰن

گو امیروں کو لبھاتا ہے بجٹ
منہ غریبوں کو چڑاتا ہے بجٹ

سال میں اک بار آتا تھا بجٹ
آجکل ہر روز آتا ہے بجٹ

روز ہی بڑھتی ہے مہنگائی یہاں
آگ دل میں یوں لگاتا ہے بجٹ

نیند اُڑتی ہے بجٹ آنے کے بعد
خواب سب کو گو دکھاتا ہے بجٹ

ہے حکومت سے غریبوں کا سوال
جیتے جی کیوں مار جاتا ہے بجٹ

ایلوپیتھک حکیم

ڈاکٹر عزیز فیصل

کسی حکیم نے
میلے سے چارٹ پر لکھ کر
مطب میں ایک جگہ کر دیا ہے آویزاں
میں وہ حکیم ہوں جو محض تھرمامیٹر سے
کولیسٹرول کے لیول کو ناپ لیتا ہوں

اور ایک عام
سٹیتھوسکوپ سے فوراً
لہو کے سرخ جسیمے، سفید سیل سارے
اک ایک گن کے
بتاتا ہوں چند لمحوں میں

گلے کی رنگ سے
آنکھوں کے گرد حلقوں سے
میں تولتا ہوں
کہ پتھری ہے کتنی گردوں میں

میں بی پی آلے کی کمزور سی مدد لے کر
جگر کا موڈ
تقاضائے سینہ و معدہ
ہر اک مریض کو موقعے پہ ہی بتاتا ہوں

میں دیکھتا ہوں توجہ سے جب بھی عورتوں کو
پلک جھپکتے ہی سی ٹی سکین کرتا ہوں
اور ان کی حالت طرفہ پہ بین کرتا ہوں

چراغ کا جن

احمد علوی

پاؤں تھے میرے زمیں پر آسماں پر تھا دماغ
مل گیا جس وقت مجھ کو وہ الہ دینی چراغ

ساری دنیا آ گئی ہو جیسے میری جیب میں
چٹکیوں میں پوری ہوں گی سب ادھوری خواہشیں

دوستو ! پانے کی خاطر جادوئی جن کا سراغ
گھس دیا میں نے زمیں پر وہ الہ دینی چراغ

اک دھواں اُٹھا فضا میں اور جن ظاہر ہوا
اپنی ہیبت ناک سی آواز میں اُس نے کہا

درحقیقت آج سے یہ جن تمھارا ہے غلام
زندگی کا ایک اک پل ہے مرا آقا کے نام

سیر پیرس اور لندن کی کراؤں گا تمہیں
چین سے چلی چکن لا کر کھلاؤں گا تمہیں

تم کہو تو آسماں سے چاند تارے توڑ دوں
مجھ میں وہ قوت ہے کہ طوفان کے رخ موڑ دوں

حکم دو صحراؤں میں برسات کر سکتا ہوں میں
حکم دو تو دوپہر کو رات کر سکتا ہوں میں

کون سا ہے کام ایسا جو میرے بس میں نہیں
میرے تابع آسماں ہے میرے تابع ہے زمیں

ایک ہی پل میں بدل دوں میں تمہاری زندگی
تم کو کیا معلوم آقا کتنی قوت ہے مری

جن کی ان باتوں کو سن کر میں نے جن سے یہ کہا
سب سے پہلے ایک گھر تو مجھ کو دلی میں دلا

جن یہ بولا ''میرے آقا اب میں کا تم سے کہوں!
گھر اگر مل جائے مجھ کو میں چراغوں میں رہوں؟''

کالی گھٹا بھی باؤلی توبہ بھی منچلی ڈر ہے کہ ہو نہ جائے طبیعت بلیک میل (ابونثر)

دعاؤں کے اثرات

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

پھولوں میں جینے کی ملی دعا اُس کو
ملی دعا اس کو کتنی عالی ہے
اب اس کے ہر جانب پھول مہکتے ہیں
آج وہ ایک بڑے سکول میں مالی ہے

کیسی کیسی لوگ دعائیں دیتے ہیں
دعائیں دینے والوں کا کوئی حال نہیں
ملی دعا اس کو وہ چمکے دنیا میں
جوبن میں ہی اس کے سر پہ بال نہیں

اُس کو ملی دعا ہر پل ہنستے رہنا
ایسی نیک دعا کو تب ترستا ہے
لیکن اس کو ملی دعا الٹی ہو کر
آج وہ پاگل ہو کر ہر پل ہنستا ہے

اُسے دعا دی تھی یہ اس کے ابا نے
رعب رہے اس کا ہر لحہ لڑکوں پر
وہ ہے کانسٹیبل آج ٹریفک کا
رعب جماتا پھرتا ہے اب سڑکوں پر

اُسے دعا دی تھی یہ کسی سیانے نے
گھومے پھرے وہ دنیا میں اور عیش کرے
آج وہ کاسہ لے کر شہر میں پھرتا ہے
لوگوں سے خیرات کو دن بھر کیش ملے

اب بھی آپ دعائیں کروائیں مجھ سے
کھل کر بولیں گھوریں کبھی خلاؤں میں
کیسی مجھ سے اب دعا اب چاہیں گے
کہتے تو ہیں رکھیں یاد دعاؤں میں

چلو اِک بار پھر سے۔۔۔

نوید ظفر کیانی

چلو اِک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

تو انٹرنیٹ کھولے اور چیٹنگ روم جا پہنچے
کسی رومانوی چینل پہ ہوں میں منتظر تیرا
بڑے ہی مان سے تجھ سے میں پوچھوں تیرا اے ایس ایل
تو لکھے سترہ برسوں کی ، وطن انگلینڈ ہے میرا

میں لکھوں بیس کا سن ہے، میں ٹورانٹو میں بیٹھا ہوں
یہیں اِک اشتہاری کمپنی میں جاب ہے میری
تو لکھے میں نمائی ہوں ، ادب سے شغل رکھتی ہوں
میں لکھوں ہائے اُف اللہ ، یہی تو خواب ہے میری

تو لکھے کیٹس اور ٹیگور پر میں جان دیتی ہوں
میں لکھوں کون ہیں یہ جو رقابت پر ہیں آمادہ
تو لکھے آنجہانی ہیں ، بڑے معروف شاعر تھے
میں لکھوں پارڈن می ، کیا سمجھ بیٹھا تھا میں سادہ

بہت سی ہم میں باتیں ہوں ، بہت سی فقرہ بازی ہو
بہت سے جھوٹے افسانے کہیں اِک دوسرے سے ہم
یوں اِک دوجے میں کھو جائیں ، بھلا دیں ساری دنیا کو
بھلا دیں وقت کی ظالم حقیقت کو سرے سے ہم

بھلا دیں وقت کو ایسے ، خبر نہ ہو سکے یکسر
یونیورسٹی سے بیٹا اور بیٹی لوٹ آئے ہیں
تو اُن کی کھلکھلاہٹ سن کے سی پی یو کو شٹ کر دے
اُنہیں معلوم ہے ماں باپ نے جو گل کھلائے ہیں

ہمیں وہ لیلیٰ مجنوں کہہ کے چھیڑیں اور ہم بوڑھے
بہت جھینپیں ، جوانوں سے بہت شرمائیں ہم دونوں
مگر جب اگلا دن آئے ، یہی تم سے ہو فرمائش
چلو اِک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

نسیم سحر

سخن ظریفی سے ستم ظریفی تک

معروف مزاح گو شاعر ڈاکٹر مظہر عباس رضوی نے جب اپنی کتاب "سخن ظریفی" کا مسودہ مجھے کچھ لکھنے کے لئے دیا تو میں نے فوراً اُن کی 'سخن ظریفی' کی حدود کو "ستم ظریفی" کی حدود میں داخل ہوتے دیکھا۔ کہاں وہ ایک ہمہ وقتی مزاح گو شاعر اور کہاں مَیں جز وقتی مزاحیہ شاعری کرنے والا۔ وہ ہسپتال میں بطور ڈاکٹر تقریباً روزانہ موجود، مَیں کبھی ہسپتال جاؤں بھی تو تھوڑی دیر کے لئے بطور مریض! اُن کے پاس تعلیمی اور پیشہ ورانہ ڈگریاں اتنی کہ الف سے ی تک (بلکہ A to Z) تک تمام حروفِ ابجد اُن کی ڈگریوں میں موجود، اور میرے پاس لے دے کے ایک ہی ڈگری (شکر ہے وہ تعلیمی ہی ہے، عدالتی نہیں!)۔ حیران ہوں کہ لکھوں تو کیا لکھوں! مگر روزانہ ایک سیب کھانے کے باوجود چونکہ کبھی نہ کبھی میرا واسطہ ڈاکٹر سے پڑ ہی سکتا ہے، اور وہ ڈاکٹر، ڈاکٹر مظہر عباس رضوی بھی ہو سکتے ہیں، اس لئے مَیں کڑوی دواؤں اور موٹی سوئی والے انجکشنوں سے بچنے کی خاطر یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔ حالانکہ یہ دیباچہ لکھتے ہوئے مَیں یہ رِسک بھی لے رہا ہوں کہ اگر انہیں یہ پسند نہ آیا تو پھر وہی کڑوی دوائیں اور موٹی سوئی والے انجکشن!

ڈاکٹر صاحب سے میری اب تک کی ملاقاتیں بس اتنی ہیں کہ ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گِنی جا سکیں۔ ایک دو مزاحیہ مشاعروں میں ہمیں ایک ساتھ سفر کرنے کا اتفاق بھی ہوا، اور جہاں مشاعرے لُوٹنے میں وہ "ڈاکو" ثابت ہوئے، مشاعروں سے پہلے اور بعد میں وہ ایک نہایت ہی نستعلیق اور شریف آدمی ثابت ہوئے۔ اُن کی ڈاکٹری اور اُن کی مزاحیہ شاعری نے کسی لمحے بھی ان کی شخصیت پر پگڑی کے شملے یا مرغے کی کلغی کی طرح اپنی عظمت کا پھریرا نہیں لہرایا۔ مزاح اُن کی شاعری میں تو ہے، چہرے پر نہیں، دیکھو تو لگتا ہی نہیں کہ یہ مزاح لکھتے ہوں گے، بلکہ عموماً اُن کے چہرے پر ایک عجیب سی "مظلومیت" دکھائی دیتی ہے۔ جس کے "ماخذات" کی تحقیق کی یہاں گنجائش نہیں۔ تاہم جب اُن کے ساتھ کچھ وقت گزارا جائے تو اُن کی شخصیت کے اندر کا مزاح آپ کو بڑے غیر محسوس طریقے سے اپنے گھیرے میں لینے لگتا ہے۔

اُن کی مزاحیہ شاعری کا آغاز ڈاکٹری اور ہسپتالی شاعری سے ہوا جس کے نتیجے میں "ہوئے ڈاکٹری میں رسوا"، "دوا بیچتے ہیں" اور "ہسپتالی شاعری" جیسے عمدہ مزاحیہ شاعری کے مجموعے شائع ہوئے، گویا انہوں نے انہیں موضوعات پر قلم اٹھایا جو ان کی براہِ راست نگاہ میں تھے۔ اپنے حلقۂ فکر اور دائرۂ عمل سے جڑی ہوئی اِس شاعری نے اپنی تخلیقی انفرادیت کے ساتھ ادبی حلقوں اور عوام میں بھی مقبولیت حاصل کی، ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب بھی "کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے" پر کاربند ہوتے گئے،

اُن کا تخلیقی اور فکری کینوس وسیع ہوتا گیا، اور وطنِ عزیز کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی خرابیوں پر ان کی نظر گہری ہوتی چلی گئی، چنانچہ انہوں نے بطور ڈاکٹر اور بطور مزاح گو شاعر اِن بیماریوں کے علاج کے لئے ”منظوم نسخے“ لکھنے شروع کر دیے۔ یہی منظوم نسخے ان کی مزاحیہ شاعری ہے جو اب ان کے پانچویں مجموعے ”سخن ظریفی“ کی صورت میں سامنے آ رہی ہے! ڈاکٹر صاحب غزل اور نظم دونوں میں اپنا اظہار پورے تخلیقی وفور کے ساتھ کرتے ہیں۔ مزاحیہ غزلوں کو اُنہوں نے ’غزلیں‘ کہا تو مجھے خوشی ہوئی کیونکہ مجھے ایسی زندہ دِل غزلوں کے لئے ہزل کا لفظ کبھی اچھا نہیں لگا۔ غزل تو دراصل ایک شعری صنف کا نام ہے، اس میں شاعر آپ کو رُلائے یا ہنسائے، یہ بعد کی بات ہے۔ اور ڈاکٹر صاحب کی مزاحیہ شاعری تو ایسی ہے کہ اسے محض ہنسنے ہنسانے کی چیز ہرگز نہیں کہا جا سکتا، یہ پہلے آپ کو ہنساتی ہے، پھر بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے، اور پھر ہمارے سیاسی، معاشرتی اور معاشی المیوں کی سنگینی اور حکمران طبقے کی بے حسی بلکہ لوٹ مار پر رُلاتی بھی ہے۔ انہوں نے کسی ایک سیاسی پارٹی کو اِس صورتِ حال کا ذمہ دار نہیں ٹھیرایا بلکہ ہر عہدِ حکومت میں جاری ناانصافیوں، کرپشن، اقربا نوازی پر قلم اٹھایا ہے، جہاں وہ میٹرو بس منصوبے میں راولپنڈی اسلام آباد کے شہر اور شہریوں کی بننے والی درگت کو یوں موضوعِ سخن بناتے ہیں:

اُس طرف ہے گر مریضِ جاں بہ لب
ڈاکٹر کا دوسری جانب مطب
ڈرائیور کہتے ہیں کیسے جائیں اب
ہم کرایہ لیں گے دگنا اِس سبب
شہر کی سڑکیں لگیں سرکس ہمیں
تیری بس نے کر دیا بے بس ہمیں

وہیں وہ ذیل کے اشعار میں جس دردمندی کے ساتھ دوسرے ذمہ داران کا ذکر کرتے ہیں وہ بھی قابلِ غور ہے:

ہم کو مشکل ہوگئی روٹی بھی ترکاری کے ساتھ
کھاتے ہیں زردار زردہ برق رفتاری کے ساتھ

ہنہناتے ہیں اسمبلی میں نئے انداز سے
گیت گھوڑے گا رہے ہیں راگ درباری کے ساتھ
وہ جو ”ٹن پرسنٹ“ تھے اب ”سینٹ پرسینٹ“ ہوگئے
سر ہمارا جھک نہ جائے ان کی سرداری کے ساتھ
دیگ ہے حلوے کی اور ہے ”فضلِ رحمانی“ بہت
مولوی کھائیں نہ کیوں ہوکے کی بیماری کے ساتھ
ہے زمیں اپنے وطن کی ساری اپنی ملکیت
”خاکیوں“ کی نبھ رہی ہے خوب پٹواری کے ساتھ
کیا بنے گا اس کا جس کے رہنما ہوں راہزن
ہاتھ سارے کر گئے اس قوم بیچاری کے ساتھ

نظموں، غزلوں اور قطعات میں ایک جیسی تخلیقی زرخیزی کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری میں بہت اچھوتے اور عمدہ فنی اور لسانی تجربے بھی کئے ہیں جو اُن کے ارتقائی سفر کا واضح اشاریہ ہیں:

رات بھر تُو جاگتا رہ ، دن چڑھے تو سو لیو
ظلم پر چُپ سادھ لے، اور اپنے لب مت کھولیو

بڑھ چکی ہے بات اب جامہ تلاشی سے میاں
یہ ہوائی مستقر ہے مت کسی سے بولیو

صنعتِ تقلیب کی یہ جادو بیانی دیکھئے:

مظہر نے الٹ پھیر قوافی کی مچائی
نادان نے یوں محفلِ اشعار کو الٹا

لمحاتِ شب وصل رہیں راز لہذا
وہ بولا کہ کل آؤں گا تو تار کو الٹا

بیگم نے جو منگوائی تھی یاد آئی ہمیں تب
قصاب کی جب "شاپ" پہ اُس نار کو الٹا

مظہر کو ہے الفاظ الٹنے کا مرض کیوں
اے مردِ محقق ذرا آ، زار کو الٹا

اِن اشعار کا صحیح لطف لینے کے لئے دوسرے شعر میں "تار"، تیسرے میں "نار" اور مقطع میں "زار" کو اُلٹا پڑھ کر دیکھئے، اور اگر ہنس ہنس کے اُلٹے ہو جائیں تو اِس کی داد ڈاکٹر مظہر عباس رضوی کو دل کھول کر دیجئے گا۔ ڈاکٹر صاحب کی شاعری سے ان کی فنی دسترس، موضوعات کی وسعت کے ساتھ ساتھ قومی زوال کی دردمندی پر دِل جلانے اور قہقہوں کی صورت میں اُن کی اشکباری کی مزید بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں، مگر ظاہر ہے جو قاری بہت سے اچھے دیباچوں کے ساتھ میرا یہ دیباچہ بھی برداشت کر رہا ہے، ان کی بہت سی شاعری انہی دیباچوں میں پڑھ چکا ہوگا، اس لئے ڈرتا ہوں کہ کہیں ان کی پوری کتاب ہی ان دیباچوں کی نذر نہ ہو جائے، اس لئے مَیں مزید مثالیں دینے کی بجائے انہی کے ایک شعر کو اُن کی نذر کرنا چاہتا ہوں:

اس حبس زدہ جسم میں یہ روح نہ رہتی
مظہر جو ظرافت کے ہوادان نہ ہوتے

بلاشبہ ہمارا پُورا معاشرہ اور ہمارے شب و روز ایک حبس زدہ جسم کی صورت اختیار کر چکے ہیں اور ایسے میں ڈاکٹر مظہر عباس رضوی ظرافت کے ہَوادان بن کر ہمارے لئے زندہ رہنے کا سامان لے کر آئے ہیں۔

راشد اشرف

میر کے تاج محل کا ملبہ یا ظفر اقبال کے ملبے کا تاج محل

یہ ان دنوں کی بات ہے جب طویل عرصے کے انتظار کے بعد کراچی کے ادبی مجلّے ''مکالمہ'' کا شمارہ نمبر ۱۹ شائع ہوا اور اِس میں جناب ظفر اقبال کے مضمون ''میر کے تاج محل کا ملبہ'' نے ہر خاص و عام کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔ مکالمہ کا یہ شمارہ اس لحاظ سے یادگار رہا کہ اس میں شائع ہوا الزامات سے بھرپور یہ مضمون سخن فہم حضرات کے لیے بحث وتنقید کے نئے راستے کھولنے کے امکانات رکھے ہوئے تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے بغور مطالعے کے بعد سخن فہم، سخن اور فہم دونوں ہی سے ہاتھ دھوتے نظر آرہے ہیں۔ ظفر اقبال نے زیر تذکرہ مضمون میں یگانہ کے بعد اب میر تقی میر کو نشانہ بنایا ہے۔ اس سے قبل یگانہ پر ان کا مضمون 'میرزا یاس یگانہ۔ ایک معمولی شاعر' شائع ہو کر ہر خاص و عام سے 'غیر مقبولیت' کی سند پا چکا ہے۔ میر پر اپنے اس مضمون میں وہ صرف ایک بات کہنا چاہتے تھے اور وہ یہ کہ خدائے سخن کے کلام میں ہر شعر در خور اعتنا نہیں ہے، یہ بات وہ مدیر کے نام اپنے یک سطری مکتوب میں بھی کہہ سکتے تھے، لیکن اتنی سی بات کہنے کے لیے الزامات کے جو تانے بانے انہوں نے بنے، اس کی زد میں خود ان کا آنا بھی بعید از قیاس نہیں ہے۔

بزبانِ خامہ بگوش، اتنی تیزی سے تو کسی کو رسوائی بھی نہیں ملتی جتنی تیزی سے ظفر اقبال کو شہرت ملی۔ ان کے مجموعہ کلام ''آبِ رواں'' کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا، جس میں آب تو بقدرِ اشکِ بلبل تھا، رہی روانی سو اس مجموعہ کلام کو پڑھنے کے بعد اس کا قاری بجق شاعر رواں تو ہوا لیکن کسی بھی قسم کے کلمہ خیر کے بغیر۔ انتظار حسین تو اس قدر جز بز ہوئے کہ تنگ آکر حال ہی میں ایک سالم کالم لکھ دیا۔ انتظار حسین لکھتے ہیں: ''آبِ رواں پر شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک پُر مغز دیباچہ باندھا ہے۔ فاروقی صاحب کا قلم اس وقت اور ہی شان سے رواں ہوتا ہے جب ظفر اقبال کی شاعری زیرِ بحث ہو۔ فاروقی صاحب صحیح کہتے ہیں کہ عام حالات میں تو آبِ رواں کے مصنف کو زندگی بھر ان اشعار کی کمائی کھانا چاہیے تھی۔''

فاروقی صاحب کے بیان سے یہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ظفر اقبال کی اپنے اشعار کے ذریعے حاصل کی گئی کمائی اب ختم ہو گئی ہے۔ اس بات کی تصدیق انتظار حسین نے بھی کی ہے، مزید لکھتے ہیں: '' تو پھر کیا ہوا، ظفر اقبال نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور گلافتاب کی اوبڑ کھابڑ کھاڑی میں جا اترے اور ایسے شعر لکھنے لگے:

لہو لہلوٹ سیاہی پھیلویں پھب
کڈھب کاغذ طلب تحریر نے کی

ظفر اقبال

اگرچہ ساٹھ سالہ تو نہیں میں
مگر بدحال ہوتا جا رہا ہوں

فقط تنقید ہی کرتا ہوں سب پر
"ظفر اقبال" ہوتا جا رہا ہوں

نوید صدیقی

کوؤں کے شور مچانے سے کوئی مر تو نہیں جاتا۔ تو کرتے رہیں یار اغیار ظفر اقبال کی کڈھب غزل پر تھو تھو، اس نے ایک معتبر نقاد سے سند لی اور اجتہاد کا شرف حاصل کر لیا۔ ارے ہم (انتظار حسین) تو اردو کی سخت جانی کی دلیل یہیں سے لاتے ہیں کہ یہ زبان ظفر اقبال کے تشدد کو مسلسل سہہ رہی ہے اور زندہ اور پائندہ چلی آ رہی ہے۔''

ظفر اقبال ایک ایسی نابغہ روزگار شخصیت ہیں جن کے بارے میں نقاد اب لکھتے لکھتے تھک چکے ہیں بلکہ کئی ایک تو یہ دنیا ہی چھوڑ چکے ہیں مثال کے طور پر خامہ بگوش جنہوں نے ایک سے زائد کالموں میں ہمارے ممدوح پر قلم اٹھایا تھا۔ اپنے ایک کالم میں خامہ بگوش لکھتے ہیں:

''انیس ناگی ایک نہایت عمدہ ادبی رسالے دانش ور سے بھی وابستہ ہیں۔ اس رسالے کی پیشانی پر ایک لیبل چسپاں ہوتا ہے جس پر یہ الفاظ درج ہیں: 'نئے ادب کا ترجمان'۔ لیکن جو ادب اس میں چھپتا ہے وہ نئے پن سے آگے کی چیز ہے۔ مثلاً اس کے تازہ شمارے میں ظفر اقبال کی نئی غزلیں شامل ہیں، ایک غزل کے یہ دو شعر ہم نے بطور نمونہ استاد لاغر مراد آبادی کو سنائے:

جو آن کے ہمسائے ہمارے میں رہیں گا
تحقیق کہ خود ہی خسارے میں رہیں گا

اس گھر کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ وہ شوخ
ایک بار رہیں گا تو دوبارے میں رہیں گا

استادِ گرامی نے یہ شعر سن کر فی البدیہہ فرمایا

ناگی نے جو چھاپیں ظفر اقبال کی غزلاں
جو ان کو پڑھیں گا وہ خسارے میں رہیں گا

'میر کے تاج محل کا ملبہ' میں ظفر اقبال نے ارشاد فرمایا ہے کہ 'میر کے ہاں کڈھب اور ناملائم الفاظ کا استعمال زیادہ ہے جس سے سلاست اور روانی بھی مجروح ہوتی ہے تاہم جہاں میر سلیس زبان استعمال کرتے ہیں، وہاں سب سے آگے نکلتے دکھائی دیتے ہیں۔''

میر کے بہتر نشتر ہیں اور ان تمام نشتروں کا جواب ظفر اقبال نے مذکورہ بالا فرمان کے ذریعے دینے کی کوشش کی ہے، حیرت کی بات یہ ہے یہ فرمان جاری کرتے وقت وہ اپنے کلام کو شاید سرے سے فراموش کر بیٹھے جو 'کڈھب اور سلیس' دونوں کی ایک نرالی مثال ہے، یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

رنگت ہی بدل گئی بدن کی
جب سانپ نے پہلی بار ڈسا
ڈھیلے ہیں پڑے ہوئے میاں تو
بیگم کا ابھی وہی ہے ٹھسا
پانی اتنا ملا کے اس نے
لسی کا کردیا ہے لسا

ظفر اقبال نے اپنے مضمون میں خدائے سخن میر تقی میر کے تاج محل کے ملبے کی جانب قارئین کی توجہ دلانے کی کوشش تو کی ہے لیکن خود ان کی شاعری کے ملبے کا تاج محل کھڑا کرنے والے اپنے محسن پروفیسر شمس الرحمان فاروقی کو بھی نہیں بخشا۔ فرماتے ہیں:

''شمس الرحمان فاروقی قابل مواخذہ اس لیے ہیں کہ انہوں نے جدیدیت کا جھنڈا سب سے اونچا اٹھا رکھا ہے اور خود غزل لکھتے بھی ہیں لیکن وہ انصاف اور ایمانداری سے بتائیں کہ جدید غزل میں ان کا کنٹری بیوشن اور مقام کیا ہے؟

یہ معاملہ دو بڑے لوگوں کے درمیان ہے لہٰذا اس میں دخل دینا ہمارے لیے مناسب نہیں لیکن جب ہم نے یہ بیان خامہ بگوش کی آخری نشانی استاد لاغر مراد آبادی کے گوش گزار کیا تو انہوں نے فرمایا کہ "یہ عزیز از جان یہ بات کیوں بھول جاتا ہے کہ شمس الرحمان فاروقی کے بلند کیے ہوئے جدیدیت کے جھنڈے پر تو یہ خود کئی برس سے براجمان ہے۔"

اپنے مضمون میں ظفر اقبال نے انکشاف کیا ہے کہ:

"ایک مرتبہ میں نے شمس الرحمان فاروقی کے جریدے شب خون میں لکھا تھا کہ جو شخص جدید غزل کی تنقید لکھتا ہے، اگر اس کی اپنی غزل جدید نہیں ہے تو اسے جدید غزل پر تنقید لکھنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا، جس پر اسی شمارے میں انہوں (فاروقی) نے ترنت جواب دیا کہ ظفر اقبال جتنے اچھے شاعر ہیں، اتنے ہی بُرے نقاد بھی ہیں۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ تینوں [انتظار حسین، حسن عسکری، شمس الرحمٰن فاروقی] اور ایسے سب حضرات باہر کے لوگ ہیں، انہیں غزل جیسی اندر کی چیز پر ہاتھ صاف کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔"

یہاں پھر ہمیں مجبوراً استاد لاغر مراد آبادی کو زحمت دینی پڑی، خامہ بگوش کی رحلت کے بعد وہ عملی طور پر گوشہ نشین ہی ہو گئے ہیں لیکن ہم گاہے گاہے ان سے ایسے معاملات میں تبصرے کی درخواست کرتے رہتے ہیں۔ استاد نے یہ بیان سن کر تبسم فرمایا اور کہا:

"غزل جیسی اندر کی چیز پر تو تمہارے شاعر نے ایسا ہاتھ صاف کیا ہے کہ خود اسی کے الفاظ میں، لسّی کا لسا کر دیا ہے، بھئی وہ میرا یار خامہ بگوش، ظفر اقبال کو پیار سے 'علامہ ظفر اقبال' [علامہ اقبال اور ظفر اقبال کا مرکب] یونہی تو نہیں کہتا تھا۔"

یہاں ہم نے خامہ بگوش کا ایک اور تبصرہ استاد کے گوش گزار کیا کہ "یہ تو سب کو معلوم ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی جس شاعر کی تعریف کر دیں اس کی دنیا تو کیا عاقبت بھی سنور جاتی ہے یعنی وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ فاروقی نے شعر شور انگیز کے نام سے کلام میر کی جو شرح لکھی ہے، اس میں جگہ جگہ ظفر اقبال کے شعر، میر کے شعروں کے بالمقابل پیش کیے گئے ہیں، اگر یہ شرح میر کی زندگی میں لکھی جاتی تو یہ ان کی زندگی کا دوسرا صدمہ ہوتا۔ پہلا صدمہ دلی کا اجڑنا تھا جسے وہ برداشت کر گئے مگر دوسرا صدمہ آخری صدمہ بن جاتا۔"

ظفر اقبال نے اپنے مضمون 'میر کے تاج محل کا ملبہ' میں چوکھی لڑی ہے۔ بات میر تک رہتی تو ٹھیک تھا لیکن انہوں نے ساتھ ہی ساتھ شمس الرحمان فاروقی، پروفیسر محمد حسن عسکری، انتظار حسین، حتیٰ کہ خواجہ میر درد کو بھی لپیٹے میں لے لیا۔

زیرِ تبصرہ مضمون یوں تو اس قابل ہے کہ تمام کا تمام ہی یہاں نقل کر دیا جائے لیکن مضمون اور صاحبِ مضمون، دونوں کی طوالت کے خوف سے ایسا کرنا مناسب نظر نہیں آ رہا، لہٰذا مضمون سے چند اچھوتے فرمودات یہاں نقل کیے جا رہے ہیں:

- میر کے براہ راست متاثرین میں فراق گورکھپوری اور ناصر کاظمی کا نام لیا جاتا ہے، ان میں احمد مشتاق بھی شامل تھے لیکن وہ اس جال سے بہت جلد اپنے آپ کو نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔
- میر کے دور کی شاعری اب زیادہ تر محققین ہی کے کام آنے والی چیز ہو کر رہ گئی ہے۔
- ہر شاعر کی طرح بھرتی کے اشعار غالب کے ہاں

ذوالفقار عادل کی شاعری کے مجموعے "شرق میرے شمال میں" پر ظفر اقبال کا کالم "دال دلیا" پر مشہور شاعر رحمٰن حفیظ کا تبصرہ:

ظفر اقبال کا کل کا کالم پڑھ کر ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک بلڈنگ کی تعمیر کے بعد ہمارے محکمے کے ایک بڑے افسر انسپیکشن کے لئے تشریف لائے۔ پرتپاک استقبال کے بعد بلڈنگ پر ایک نظر ڈالی اور کہا کہ مرکزی دروازے کے باہر فرش کا رنگ اچھا نہیں ہے۔ اپنی آدھے گھنٹے کی موجودگی میں انہوں نے 20 منٹ فرش اور 10 منٹ چائے کے مقابلے میں کافی کے فوائد پر گفتگو کی اور واپس تشریف لے گئے۔

بھی فراوانی سے دستیاب ہیں۔

- عسکری سمیت یہ حضرات مناسباتِ لفظی اور دیگر انسلاکات کے اہتمام کو نہ صرف شاعری سمجھ بیٹھے ہیں بلکہ دوسروں کو اسے منوانے پر بھی مصر ہیں۔
- میر صاحب نے رونے کے مضمون کو اس تکرار اور کثرت کے ساتھ باندھا ہے کہ اس سے جی ہی اوب گیا ہے حتیٰ کہ اس قبیل کے اشعار دیکھ کر رونے دھونے میں شامل ہونے کے بجائے ہنسی آتی ہے۔
- اب وقت آگیا ہے کہ میر کا کلام جس جھاڑ جھنکار سے بھرا پڑا ہے، اسے اس سے صاف کر لیا جائے۔
- میر کو کبھی خدائے سخن کہا گیا ہے تو ضروری نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ خدائے سخن ہی رہیں۔ اس وقت سخن کا جو عالم تھا، وہ اس کے خدا ہو بھی سکتے تھے لیکن اب سخن کی صورت حال یکسر تبدیل ہو چکی ہے، حتیٰ کہ اب میر کے بہتر نشتروں میں بھی کئی اشعار باقاعدہ مزاحیہ لگتے ہیں۔
- خدائے سخن ہونا تو درکنار، آج کے دور میں میر فرشتے کے منصب کو بھی پہنچتے نظر نہیں آتے۔
- میں یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ محمد حسن عسکری ہوں یا انتظار حسین، ان کا غزل کے ساتھ کیا تعلق ہے جو وہ اس کے بارے میں اتنی اتھارٹی کے ساتھ بات کرتے ہیں، یہ اتھارٹی انہوں نے کہاں سے حاصل کی ہے؟
- جب رونے بیٹھتا ہوں تب کیا کسر رہے ہے۔ رومال دو دو دن تک جوں ابرِ تر رہے ہے۔۔۔۔ میر کے اس شعر کی تعریف میں عسکری صاحب آپے سے باہر ہو رہے ہیں، یہ ایک تھرڈ کلاس شعر ہے۔
- میر کا شعر ہے:

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

روتا کون نہیں ہے لیکن رونے کی بھی ایک تہذیب ہے۔ ایک نمونہ (ظفر اقبال کا اپنا) ملاحظہ ہو:

مسکراتے ہوئے ملتا ہوں کسی سے جو ظفر
صاف پہچان لیا جاتا ہوں رویا ہوں میں

جناب ظفر اقبال کے ان فرمودات پر مزید تبصرہ ہم اپنے قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ البتہ اسے بہتر طور سے سمجھنے کے لیے جہاں جہاں میر تقی میر کا نام آیا ہے، وہاں وہاں مضمون نگار (میر

نمائندہ شاعر

میں اپنے عہد کا نمائندہ شاعر ہوں
"اچھا جی"
جی
"مان لیتے ہیں جی لیکن آپ کو یہ انکشاف کب ہوا ہے"
جناب یہ انکشاف نہیں ہوا یہ شمس الرحمان فاروقی نے لکھا ہے اور ظفر اقبال نے اس کی تائید کی ہے
"اچھا۔ آپ کا کوئی نمائندہ شعر؟"
میرا ہر شعر میرا نمائندہ شعر ہے کیونکہ مجھ پہ شمس الرحمان فاروقی نے لکھا ہے اور ظفر اقبال نے اس کی تائید کی ہے
"پھر بھی کوئی ایک آدھ شعر"
کمال کرتے ہیں آپ بھی، بھائی مجھ پہ شمس الرحمان فاروقی نے لکھا ہے اور ظفر اقبال نے اس کی تائید کی ہے اور آپ پھر نمائندہ شعر طلب کر رہے ہیں
"حضور ایک آدھ شعر تو سنا دیں شمس الرحمان صاحب کا لکھا اور ظفر اقبال کی تائید سر آنکھوں پہ، کوئی مختصر سی نظم ہی سنا دیں"
چلیں میں آپ کو ایک شعر سنا دیتا ہوں حالانکہ اتنی مضبوط شہادتوں کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہتی
تو عرض کیا ہے کہ
کرچیاں ٹوٹ کے بکھری ہیں مری عینک کی
مجھ کو اب ضعف۔ بصارت نہیں ہونے والا
"بھائی جان یہ کیا ہے؟"
یہ وہ شعر ہے جس کے پہلے مصرع میں جدت اور دوسرے میں روایت کوٹ کوٹ کر بلکہ ٹوٹ ٹوٹ کر بھری ہوئی ہے

افتخار حیدر

کے تاج محل کا ملبہ) کا اپنا نام رکھ کر اِسے پڑھنے سے صورت حال خاصی حد تک واضح ہو جاتی ہے۔ رہا سوال حسن عسکری اور انتظار حسین کے اتھارٹی حاصل کرنے کا تو اس سلسلے میں یہی عرض ہے کہ دونوں حضرات نے یہ اتھارٹی وہیں سے حاصل کی ہے جہاں سے شمس الرحمان فاروقی نے ظفر اقبال کی شاعری کو بطور سند پیش کرنے کے سلسلے میں اسے حاصل کیا تھا۔ جناب ظفر اقبال نے میر کے کلام میں موجود جھاڑ جھنکار کو صاف کرنے کا مطالبہ بھی کیا ہے۔ یہاں میر کے طرف دار جناب ظفر اقبال کی شاعری کے جھاڑ جھنکار میں موجود کلام کو صاف کرنے کا مطالبہ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن ایسی کسی بھی کوشش کے نتیجے میں یہ 'کوشش کرنے والا' ہمارا تن بدن ہی جھاڑ ہو جھنکار ہو جیسے' کی تفسیر بن سکتا ہے۔

اپنی شاعری میں جھاڑ جھنکار کو صاف کرنے کی بات سے یہاں ہمیں جناب ظفر اقبال کے اس انٹرویو کے مندرجات یاد آرہے ہیں جسے انھوں نے بی بی سی کے انور سن رائے کو دیا تھا۔ مذکورہ انٹرویو میں انھوں نے کہا تھا کہ ''میں تو اپنی شاعری کو خود مسترد کرتا ہوں اور کسی بھی وقت اسے منسوخ بھی کر سکتا ہوں، ساری کی ساری کو۔''

ہم سمجھتے ہیں کہ اب وقت آگیا ہے کہ یہ نیک کام بھی کر ہی لیا جائے۔

انٹرویو میں ایسی مزے دار باتیں ہیں جن پر ایک علاحدہ مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

''میری شاعری میں جو عاجزی ہے، جو انکسار ہے، مثلاً میں نے کبھی تعلّی کا شعر نہیں کہا، کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ میں نے یہ کیا ہے، میں نے یہ کہا ہے۔ ابرار احمد کہا کرتے ہیں کہ یہ میری چالاکی ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر یہ چالاکی ہے تو کر کے دکھاؤ۔ ایرج مبارک کہتے ہیں کہ آپ نے اپنی ہر غزل میں کم از کم تین شعر اپنے خلاف کہے ہوئے ہیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ اگر یہ چالاکی ہے تو کر کے دکھائیں، لکھیں ایک دو شعر اپنی غزل میں۔ ایک اور بات سے اس کا شبہ مجھے ہوتا ہے کہ شمس الرحمان فاروقی اور گوپی چند نارنگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں لیکن وہ دونوں بیک زبان یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ظفر اقبال ہی اس وقت اردو دنیا کا، برصغیر کا سب سے بڑا غزل گو شاعر ہے۔''

اللہ بخشے حفیظ ہوشیار پوری زندہ ہوتے تو اس چالاکی کے مضمون سے تاریخ نکال لیتے لیکن کیا کیجیے کہ چالاکی سے تاریخ تو نکالی جا سکتی ہے لیکن چالاکی سے شاعری نہیں کی جا سکتی۔

جناب ظفر اقبال کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جب ایک

ظفر اقبال اور تنقید

یار لوگ تنقید کے معانی خدا جانے کیا لیتے ہیں؟ جناب جلیل عالی کہتے ہیں کہ ''ظفر اقبالی نثری کہہ مکرنیوں'' کو تنقید کہنا زیادتی ہے۔ لیکن عالی صاحب کو کون سمجھائے کہ ظفر صاحب اپنے ان کالموں میں جو چٹکلے چھوڑتے ہیں، لوگوں کو وہی تو مزہ دیتے ہیں۔ ظفر صاحب اور ان کے چاہنے والوں کو کلیم الدین احمد کی ''اردو تنقید پر ایک نظر'' پڑھنے کی اشد ضرورت ہے۔ لیکن کلیم الدین احمد کی کتاب ''اردو شاعری پر ایک نظر'' کا مطالعہ کم از کم ظفر صاحب پر لازم بنتا ہے لیکن وہ یہ کام کیوں کریں گے، ان کے نزدیک تو اُن سے پہلے اور اُن کے عصر میں اُن کے علاوہ اِس ضمن میں جس نے جو کیا، غلط کیا۔ ہاں ان کے بعد جو لوگ ان کی تقلید میں مگن ہیں، ان کے نزدیک اردو شعر اور اردو تنقید کی کل کائنات محض اتنی ہی ہے۔ یوں اردو شعر کے ولی دکنی بھی وہی ٹھیرتے ہیں اور اردو تنقید کے حالی بھی وہ خود۔ ہم نے ظفر صاحب کی تنقیدی قسم کی ا؟ را کو ایک دوسرے کو لطیفے بنا کر سناتے بھی دیکھا ہے۔ یار! ایک تو جب سے ان پیج میں لکھنا شروع کیا ہے، دماغ کہیں ہوتا ہے تو انگلیاں کچھ اور لکھ رہی ہوتی ہیں۔ اچھے وقت تھے جب لکھتے ہوئے یہ خوف لاحق رہتا تھا کہ اگر اپنا لکھا کاٹ کر درست کرنا پڑ گیا تو صفحے پر لکیریں ہی لکیریں ہوں گی۔

نوید صادق

ظفر اقبال سے

داد لینے کے ہیں جو خواہاں، ظفر اقبال سے
بعد ازاں ہوتے ہیں کیوں نالاں، ظفر اقبال سے

ہاتھ میں کاسے لیے کم زور تر اہل قلم
مانگتے ہیں شعر کی ''بھوں پھاں'' ظفر اقبال سے

پیٹ میں اٹھتے ہیں جن کے میر بننے کے مروڑ
وہ بھی کرتے ہیں طلب درماں، ظفر اقبال سے

پھر رہے ہیں اب غزل کے پنڈ میں " بابو خیال "
یہ روایت بھی چلی ہاں ہاں، ظفر اقبال سے

پوچھتے رہتے ہیں فیصل ! کچھ ادب کے جوتشی
دال دلیا کے نئے امکاں، ظفر اقبال سے

ڈاکٹر عزیز فیصل

دوسرے کے خون کے پیاسے دو لوگ زندگی میں کسی ایک بات پر متفق ہو جائیں تو گمان ہے کہ ان کے خون کی پیاس بجھ چکی ہے اور اب وہ کسی تیسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب! یہاں ہمیں جناب ظفر اقبال ہی کا ایک شعر یاد آ رہا ہے:

مقبولِ عام ہو گیا ہوں
یعنی کہ تمام ہو گیا ہوں

انٹرویو میں ایک جگہ جناب ظفر اقبال نے 'ان گھڑ مقلدین' کی ترکیب استعمال کی جس پر انور سن رائے نے استفہامیہ لہجے میں اسے دوہرایا۔ ظفر اقبال نے مصاحبہ گو کی ادب ناشناسی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا ''ان گھڑ، یعنی جو ابھی تیار نہیں ہوتے اور ظفر اقبال کی نقل شروع کر دیتے ہیں اور مار کھا جاتے ہیں۔''

ایک موقع پر تو جناب ظفر اقبال نے انور سن رائے کو یہ کہہ کر بدحواس کر دیا کہ:

''جہاں تک میرے لب و لہجے کا سوال ہے تو میں اسے تبدیل کرتا رہتا ہوں۔ میں تو کہیں ٹک کر بیٹھتا ہی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کے میرا کام زیادہ تر اکیڈمک [academic] ہے۔ میری شاعری مشاعرے کی شاعری نہیں ہے۔ نہ یوں ہے کہ میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے شعر کہتا ہوں۔ لوگ قاری کو راغب کرتے ہیں، میں قاری کو اشتعال دلاتا ہوں باقاعدہ۔ بعض اوقات۔ ایک چیلنج کے طور پر کہ تیری ایسی کی تیسی دیکھو یہ۔''

میر تقی میر کے ۷۲ نشتر مشہور ہیں، خامہ بگوش نے مندرجہ ذیل ۷۳ واں نشتر میر ہی کے دیوان سے دریافت کیا تھا:

قیامت کو جرمانۂ شاعری پر
مرے سر پہ میرا ہی دیوان مارا

ان حالات میں تو یہ ۷۳ واں نشتر جناب ظفر اقبال کے لیے ہی تجویز کیا جا سکتا ہے جو زیر تبصرہ مضمون 'میر کے تاج محل کا ملبہ' میں ایک جگہ خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں:

''میں پچپن سال سے اس کوچے (شاعری) میں جھک مار رہا ہوں۔''

ہم جناب ظفر اقبال سے مؤدبانہ عرض کریں گے کہ اس قسم کے تبصروں سے گریز ہی کیا کیجیے، مضمون میں قاری جہاں آپ کی تمام باتوں سے اختلاف کرے گا وہاں وہ کسی ایک بات سے اتفاق بھی کر سکتا ہے۔

قوم کے غمخوار

ڈالر پاؤنڈ ہم کو پیارے، اربوں کھربوں رکھتے ہیں
اپنی دولت ہم نہیں رکھتے ہرگز پاکستان میں
قوم کے ہم غمخوار ہیں بے حد، حاکم یوں بن جاتے ہیں
گھومتے رہتے ہیں اکثر ہم کویت، انگلستان میں

تنویر پھولؔ

گیس کی قلت

گیس کی یارو! کمی ہے اِس قدر
بیوی چولھا بھی جلا سکتی نہیں
پیٹ میں اپنے بھری ہے گیس جو
کیا کسی بھی کام آسکتی نہیں

تنویر پھولؔ

پٹرول کی قیمت

ہیں پٹرول کا ماجرا سُن کے حیراں
جو خود چور ہو، کیسے روکے گا چوری
لیا سو میں، بیچا اسے تین سو میں
ذرا دیکھو! سرکار کی نفع خوری

تنویر پھولؔ

ڈاک چور

کرتے ہیں گم رسائل
یہ ڈاک خانے والے
دراصل نام ان کا
ہے ''ڈاک کھانے والے''

تنویر پھولؔ

نہیں بے وجہ کوٹھے پر سے ہیں وہ جھانکتے تم کو تمھاری دید کے مشتاق ہیں اے جان بندر تک (شاہد احمد دمدارؔ)

آلودگی

عیش و طرب میں مست ہیں اہلِ صفائی پھولؔ!
شیطاں نے مفت خوری میں استاد کر دیا
پانی گٹر کا ہے، کہیں کوڑے کے ڈھیر ہیں
آلودگی نے شہر کو برباد کر دیا

تنویر پھولؔ

ظرافت

ہے ظرافت کیمیائے بے بہا غم کے لئے
دل کا شیشہ اس سے چمکے گا اگر پالش کریں
طنز کا تڑکا ضروری ہے ظرافت میں حضور
لیکن اتنا بھی نہ ہو کہ اس سے دل مالش کریں

ڈاکٹر سید مظہر عباس رضوی

معانقہ

بے خطر اس کو کریں اور سرِ عام کریں
جرم یہ وہ ہے جو آتا نہیں تعزیری میں
عید ملنے کی فقط ہم نے تو کوشش کی تھی
پسلیاں توڑ دیں ظالم نے بغل گیری میں

ڈاکٹر سید مظہر عباس رضوی

اُف یہ لاچاری

وہ حسیں جو کبھی ہماری تھی
لے گیا ہے عدو تو "قیں" کر کے
اور اِک ہم بصورتِ بکرا
چُپ سے بیٹھے ہیں ایک "میں" کر کے

سید فہیم الدین

بکرا

ہم سے جو ہمکلام ہے بکرا
اتنا مقبولِ عام ہے بکرا
آپ بھی رکھ ہی لیں تو بہتر ہے
کتنا پیارا سا نام ہے بکرا

سید فہیم الدین

ضخیم بکرا

ضخیم ایسا کہ کتا دکھائی دیتا ہے
بضد قصاب کہ بکرا دکھائی دیتا ہے
کہا جو ہم نے میاں یہ بھی کوئی بکرا ہے
تو جھنجلا کے کہا، کیا دکھائی دیتا ہے

سید فہیم الدین

سر کھجاتے رہے ناخن تدبیر سے ہم   پھر ضرورت نہ رہی ہمکو کسی نائی کی   (ضیاء الحق قاسمی)

ارمغانِ ابتسام

یہ شگفتہ دھڑکنوں کے ساز پر رقصاں سلام
بزم یاراں کے محبت ساز پیمانوں کے نام
ہیچ ہیں سب اس کے آگے بے خودی، شیشہ و جام
پیش ہم کرتے ہیں یارو " ارمغان ابتسام "

منیر انور

المیہ

ابہام سلسلے میں نہ کوئی چاند کے رہے
سو رویتِ ہلال کمیٹی بھی بن گئی
یہ کام کر کے خود تو حکومت الگ ہوئی
اور "اہلِ علم و دین" کی آپس میں ٹھن گئی

شوکت جمالؔ

چین کی عید

اور ہیں وہ جو ہجر میں عیدیں
صرف رو کر گزار دیتے ہیں
ہم تو وہ ہیں جو ایسی صورت میں
عید سو کر گزار دیتے ہیں

شوکت جمالؔ

صحیح طریقہ

اِک کیس تھا اہم جو عدالت میں زیرِ غور
خطرہ نہ اس میں مول ذرا بھی لیا گیا
جب یہ لگا وکیل کے بس کی نہیں ہے بات
تب پیروی کے واسطے اک جج کیا گیا

شوکت جمالؔ

بلبلاہٹ

دو وقت کا کھانا بھی ہے مشکل سے میسر
اس دورِ گرانی میں نہ روؤں تو کیا کروں
بجلی کے گیس کے اور ٹیلی فون کے یہ بل
"غالب! یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں"

خاورؔی

چنانچہ

میں پرچۂ حساب میں ہوتا رہا ہوں فیل
ہر بار ہر سوال کو کرتا تھا چونکہ رانگ
محشر میں اس لیے میں خدا سے کہوں گا یہ
"مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ"

خاورؔی

وہ سمجھتا تھا کہ یہ بھی اشرف المخلوق ہے آدمی کو دیکھ کر شیطان آدھا رہ گیا (دلاور فگارؔ)

الیکشن میں

ملتی نہ تھی فرصت جنہیں بچوں کے لئے بھی
اب پوچھتے پھرتے ہیں وہ ہر شخص کے حالات
آتا ہے جو نزدیک الیکشن کا زمانہ
بڑھ جاتی ہے پھر بندۂ مزدور کی اوقات

اعظم نصر

تیری یاد

راتیں تو عمر بھر رہیں ویسے ہی تیرے نام
کٹتا ہے اب کے دن بھی ترے انتظار میں
بجلی نے تیری یاد کو دوگانہ کر دیا
بھولے ہوئے تھے تجھ کو غمِ روزگار میں

اعظم نصر

موبائیل

انگلیوں کو بھی دی زباں جس نے
یہ موبائیل بھی کیا کمال کا ہے
دور رہ کر بھی پاس ہو گویا
ہجر میں بھی مزا وصال کا ہے

اعظم نصر

۔۔۔کے نام

مسئلہ کچھ فشارِ خون بھی ہے
کچھ طبیعت بھی آفتابی ہے
یوں تو راحت بھی ہے دسمبر میں
جون میں جان بھی جلاتی ہے

اعظم نصر

شوقِ سہرہ بندی

کبھی بازار سے نکلے تو دولہا بن کے ہم نکلے
تمنا صرف اتنی ہے کہ بس سہرے میں دم نکلے
خدا کے فضل سے چالیسواں ہے چوتھی بیگم کا
"بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے"

احمد علوی

دل وجگر

دلؔ لکھنوی ہے دوست، جگر بھی ہیں محترم
اعمالِ بد سے کس طرح پھیروں نظر کو میں
اِک شاعرہ کو دونوں نے چھیڑا ہے ایک ساتھ
"حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں"

احمد علوی

دل پھینک سٹیئرنگ

عشق موٹر وے کے انٹر چینج پر
ہم نے دیکھا اک انوکھا فیصلہ
قیس "لیلیٰ پور" جانے کے لئے
"صاحباں آباد" کی جانب چلا

ڈاکٹر عزیزؔ فیصل

خانگی مصلحت

اس نے ماشے کو مصلحت کے تحت
صدق دل سے کہا کہ "تولا" ہے
صبح صادق کے وقت "صادق" نے
اپنی بیگم سے جھوٹ بولا ہے

ڈاکٹر عزیزؔ فیصل

بزمِ نسواں کی تقریب میں

شیو تازہ کیے، کپڑے بھی نئے پہنے ہوئے
صورتیں سب نے چمکدار نکالی ہوئی ہیں
بزم نسواں میں خواتین کہاں پر بیٹھیں
سب کی سب کرسیاں مردوں نے سنبھالی ہوئی ہیں

ڈاکٹر عزیزؔ فیصل

پشتو نمی دانم

ادھارے سو روپے مانگے جو اس گلفام نے یکدم
تن کنجوس پر جیسے گرایا کوئی ایٹم بم
سنی کو ان سنی کر کے تاثر یوں دیا گویا
"زبانِ یار من پشتو و من پشتو نمی دانم"

ڈاکٹر عزیزؔ فیصل

یہ مرد بھی ناں۔۔۔

ہر پل ہر دم ڈھونڈیں صنفِ نازک کو
نظریں ہیں یہ دوٹکواری مردوں کی
ڈال دو لال دوپٹہ بیشک جھاڑی پر
لگ جائیں گی وہاں قطاریں مردوں کی

شہباز چوہانؔ

نئے دور کی یاری

تم ہو جون جولائی کے بمبار مہینے
ہم ہیں یار دسمبر ٹھنڈے ٹھار مہینے
ہم نے دیکھی نئے دور کی یاری بھی
ہفتہ دس دن maximum دو چار مہینے

شہباز چوہانؔ

اپنے دل کا پتہ نہیں ملتا ایکسرے بھی کرا کے دیکھ لیا (حاجی لق لقؔ)

نوید ظفر کیانی / جیروم کے جیروم

سفر ہے شرط

بابِ پنجم

میں اگلی صبح مسز پپٹ کی آواز پر بیدار ہوا۔

''نو بج چکے ہیں جناب'' ۔۔۔۔ اس نے آواز دی۔

''کک کیا'' ۔۔۔ ''کتنے بج چکے ہیں'' ۔۔۔ میں اچھل پڑا تھا۔

''نو بج چکے ہیں اس وقت ۔۔۔!'' اُس نے کی ہول سے جھانکتے ہوئے کہا۔۔۔''میرا خیال تھا کہ آج آپ دیر سے اٹھنا چاہ رہے ہیں!!''

میں نے جلدی سے ہیرس کو جگایا اور اسے وقت کے بارے میں بتایا۔

''ارے تم نے چھ بجے نہیں اُٹھنا تھا!''
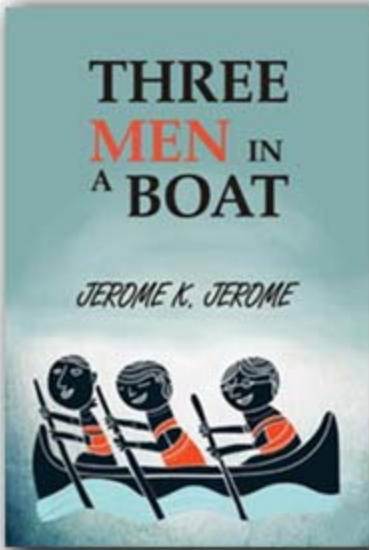
''اُٹھنا تو چھ بجے ہی تھا'' ۔۔۔ میں نے ہونٹوں کو چباتے ہوئے کہا۔۔۔۔ ''اگر تم جگاتے تو!!''

''میں تمھیں کیسے جگاتا جبکہ تم نے مجھے چھ بجے جگایا ہی نہیں'' اُس نے پلٹ کر حملہ کیا۔

''اب ہم بارہ بجے سے پہلے دریا تک پہنچ ہی نہیں پائیں گے'' ۔۔۔ ''مجھے تو لگتا ہے تم خود ہی اُٹھنا نہیں چاہ رہے تھے۔''

''ہوں!!'' میں نے ہنکارہ بھرا۔۔۔ ''تمھاری خوش قسمتی ہے کہ میں نے تمھیں نو بجے جگا دیا'' ۔۔۔ ''اب بھی نہ جگاتا تو سارا دن سوئے پڑے رہتے!''

ہم کافی دیر تک ایک دوسرے پر دانت کچکچاتے رہے یہاں تک کہ ایک خوفناک قسم کے خراٹے نے ہمیں چونکا دیا، یہ جارج تھا۔ اب ہمیں احساس ہوا کہ ہم دونوں کے علاوہ بھی کوئی اور ذی روح ہے جو اس وقوعے کی ذمہ دار ہے۔ جارج ہی تھا، جس نے ہم سے پوچھا تھا کہ وہ ہمیں کتنے بجے جگائے اور خود ابھی تک پڑا خراٹے لے رہا ہے۔ منہ کھلا ہوا ہے اور ٹانگیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ پتہ نہیں مجھے کیوں ان سب خوابیدہ لوگوں پر سخت تاؤ آتا ہے جو میرے اردگرد پڑے ہوتے ہیں جبکہ میں نہ صرف بیدار ہو چکا ہوتا ہوں بلکہ بستر سے اٹھ بھی چکا ہوتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ بدبخت لوگ اپنی زندگی کے انتہائی قیمتی لمحے خراٹوں کے

بے ہنگم جوہڑ میں نہایت بے دردی سے پھینکے جا رہے ہیں، ہر قسم کے احساسِ زیاں سے قطعِ نظر۔

یہ جارج بھی اِسی قسم کی مخلوق ہے۔ وقت جیسی زندگی کی نادر ترین شے کو نہایت بیدردی سے قتل کرنے والا شخص۔۔۔ وقت، کہ جس کے ہر لمحے کا حساب ہمیں آخرت میں دینا ہے، صرف ہوئے بغیر اُس کی مٹھی سے ریت کی طرح پھسلتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اس وقت کو ڈبل روٹی اور انڈوں کی مدد سے اپنے جسم پر مزید منڈھ سکتا تھا، کتوں کے ساتھ مزید چھیڑ خوانی کر سکتا تھا، کسی لڑکی کے ساتھ فلرٹ کر سکتا تھا۔۔۔ لیکن موصوف نے تو اسے کباڑ خانے کا مال سمجھ رکھا ہے۔

کتنا بھیانک انتقام ہے جو بندہ خوامخواہ خود سے لے رہا ہے۔ میں اور ہیرس بیک وقت ایک ہی مشترکہ نقطے پر سوچ رہے تھے۔ ہم نے جارج کو اس رائیگانی سے بچانے کا پختہ ارادہ کر لیا اور اس نیک مقصد کے حصول کے لئے باہمی اختلاف کو بھی بھلا بیٹھے۔ ہم تیزی سے آگے بڑھے اور ہیرس پر سے لحاف کو کھینچ لیا۔ ہیرس سلیپر ہاتھ میں تھام کر آگے بڑھا جبکہ میں نے اپنا منہ اُس کے کان سے لگایا اور پوری قوت سے دہاڑا۔

"کیا ہوا"؟ "کیا آفت آئی ہے"؟؟ وہ اُچھل کے بیٹھ رہا۔

"اب اُٹھ بھی جا" ٹیڈی بیر کہیں کے۔۔۔۔ پونے دس بج چکے ہیں" ہیرس غرایا۔

"کیا؟" وہ منمنایا اور بستر سے ایسی چھلانگ لگائی کہ سیدھا واش روم میں جا پڑا۔۔۔ "یہ یہاں یہ چیزیں کس نے رکھ چھوڑی ہیں؟؟"

ہم دونوں نے اسے کان سے پکڑا اور نکال باہر کیا۔ بھلا اب بنے میاں کے غسل کا کون سا وقت رہ گیا تھا۔

ہم نے تمام کپڑے پیک کر دیئے اور جب کچھ وقت بچا تو سب سے پہلے یہ اطمینان کر لیا کہ ٹوتھ پیسٹ اور برش پیک کیا ہے یا نہیں، اور کنگھی بھی (ٹوتھ برش نے تو میری جان ہی لے لینی ہے کسی دن) اس کے بعد ہم سیڑھیوں سے نیچے اتر آئے۔ جب ہماری روانگی میں کوئی کسر نہ رہ گئی تو جارج کو شیونگ یاد آ گئی۔ ہم نے اسے بتایا کہ اب کسی شیونگ ویونگ کا ٹائم نہیں ہے کیونکہ اب پیکنگ میں کسی قسم کی رخنہ اندازی کی کوئی گنجائش نہیں۔

وہ بولا "اتنے کٹھور نہ بنو، میں بھلا ایسے کیسے جا سکتا ہوں!"

یہ امر تسلیم کہ جارج کا بغیر شیو باہر نکلنا شہر والوں پہ ظلم کرنے کے مترادف ہے لیکن کوئی کہاں تک نوعِ انسانی کی اذیتوں کی تلافی کرتا پھرے، کچھ گانٹھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو جسم کا حصہ بن کر رہ جاتے ہیں۔۔۔ یونہی پھوکٹ میں سرجری کا شوق فرمائے جانا چہ معنی دارد؟

ہم سب ناشتے کے لئے ڈائننگ روم جا پہنچے۔ مونٹمورینسی نے اپنے دو عدد دوستوں کو الوداعی دعوت میں بلا رکھا تھا جو دروازے کے قریب آپس میں گتھم گتھا تھے۔ ہم نے چھتری کو تنبیہاً لہرایا اور اُنہیں خاموش کیا اور خود ڈائننگ میز کے گرد براجمان ہو گئے۔

میز پر خشک گوشت کے پارچہ جات بمع دیگر لوازمات کے چنے ہوئے تھے۔

"دنیا میں اچھے ناشتے کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔" ہیرس نے کہا اور بیک وقت دو پارچہ جات سے نبرد آزما ہونے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ اُس نے اِدھر غفلت کی اُدھر پارچہ جات چھو منتر ہو جائیں گے۔

جارج نے تازہ اخبار اُٹھایا اور بحری سفر کے متعلق صفحہ پر موجود دل ہلانے والی وہ خبریں پڑھنے لگا جن میں موسم کے متعلق پیش گوئیوں کا عنصر بھی شامل تھا۔

جو یوں تھی ''بارش یا خنکی۔۔۔ کچھ کیچڑ یا پھر خوشگوار'' اس قسم کی پیشگوئیاں رونگٹے کھڑے کر دینے کے لئے کافی ہیں، مزید وضاحت میں طوفانِ بادوباراں اور لندن اور مضافات میں گرج چمک کے ساتھ بارش کا امکان بھی شامل تھا۔

میرے نزدیک تو موسم کی پیشگوئی سے زیادہ لغو اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ کل یا پرسوں جو موسم رہ چکا ہے، آنے والے دِنوں میں اُس کے برعکس ہونے کا امکان ہو۔ اس قسم کی پیشگوئیاں تو ہر ایرا غیرا نتھو خیرا کر سکتا ہے۔ اس قسم کی باتوں پر اعتبار کرنا حماقت نہیں تو پھر اور کیا ہے۔ پیر کا دن تھا اور اس دن موسلا دھار بارش کی پیشگوئی نے میرے پورے ہفتے کا ستیاناس کر کے رکھ دیا تھا۔ موسلا دھار بارش اور گرج چمک کی پیشگوئی تھی، چنانچہ ہم نے پکنک کا ارادہ ملتوی کر دیا اور گھر میں ہی پڑے رہ کر بارش کا انتظار کرتے رہے۔ لوگ ہمارے گھر کے سامنے سے ویگنوں اور کوچز میں خوش باش گزرتے رہے۔ سورج چمک رہا تھا اور بادلوں کا نام و نشان نہ تھا۔

''بیچارے لوگ۔۔۔'' ہم دروازے کے سامنے سے اُنہیں گزرتے دیکھ کر آپس میں کہتے رہے۔۔۔۔ ''دیکھنا! یہ لوگ بہت خراب ہوں گے۔''

ہمارے تصور میں اُن کے بارش سے شرابور چہرے لہرا گئے۔ ''چچ چچ چچ۔۔۔ ابھی یہ بھیگے بھاگے۔ سردی سے کانپتے ہوئے واپس گھروں کو لوٹیں گے اور سیدھے آتش دان پر چڑھ دوڑیں گے۔۔۔ ٹھنڈ سے بے حال ہو کر ہم سے جڑی بوٹیاں اور ٹوٹکے پوچھتے پھریں گے۔''

بارہ بجے تک سورج پوری آب و تاب میں رہا اور گرمی ناقابلِ برداشت ہوگئی اور ہم سوچ رہے تھے کہ آخر یہ طوفانِ بادوباراں اور بجلی کی چمک دمک کہاں گئی جس کی پیشگوئی کی گئی تھی۔

''ہو سکتا ہے وہ دوپہر کے بعد ہو، بھئی بارش کا آنا تو ٹھہر گیا ہے آخر اخبار میں ماہرین نے پیشگوئی جو کر دی ہے۔ ایک بجے کے لگ بھگ ہماری مکان مالک خصوصی طور پر یہ پہنچنے آئی کہ'' کیا ہم نے گھر میں ہی پڑے رہنا ہے، پکنک و کنک پر نہیں جانا ہے۔۔۔ اتنا اچھا موسم ہے!!''

ہمیں بارش میں بھیگ کر بیمار ہونے کا ہرگز ہرگز شوق نہیں تھا۔ اور جب سہ پہر بھی گزر گیا اور بارش کے کوئی آثار دکھائی نہ دئے تو ہم یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتے رہے کہ بھلا بارش کا کیا اعتبار، کسی بھی وقت یک بیک آ سکتی ہے، ممکن ہے جب پکنک پر گئے ہوئے لوگ گھروں کو لوٹنے لگیں اور کسی ایسی جگہ پر ہوں جہاں انہیں بارش سے چھپنے کے لئے کوئی سائبان بھی میسر نہ ہو تو ان بیچاروں پر کیا گزرے گی جب اچانک بارش نے انہیں آ لیا۔ یہ لوگ تو ایسے بھیگیں گے کہ ساری عمر یاد رکھیں گے۔۔۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ایک شاندار اور خوشگوار ترین دن کا اختتام ہوا بلکہ رات بھی ویسی ہی خوشگوار رہی۔

اگلی صبح ہم نے اخبار میں پڑھا کہ اس دن کا موسم بہت خوشگوار ہوگا۔ شاندار قسم کی گرمی ہوگی اور سورج بھی جوبن پر ہوگا، چنانچہ ہم نے اسی مناسبت سے گرمیوں کا لباس زیبِ تن کیا اور پکنک کے لئے روانہ ہو گئے۔

ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔ موسلا دھار بارش کے ساتھ ساتھ ہڈیوں میں اتر جانے والی سرد ہوائیں بھی چلنے لگیں اور موسم کی یہ شدت سارا دن برقرار رہی۔ ہم سب بدھو خیر سے گھر کو لوٹے لیکن یوں کہ بارش میں بری طرح بھیگے ہوئے اور فلو سے سوں سوں کرتے ہوئے۔۔۔ تمام رات یہی عالم رہا۔

موسم ایک ایسی شے ہے جو کم از کم میرے فہم و ادراک سے قطعاً بالاتر ہے۔ میں کوشش کے باوجود کبھی اسے سمجھ نہیں پایا ہوں۔ بیرومیٹر بھی اس ضمن میں عاجز ہیں۔ یہ ایسے ہی بیکار اور ناقابلِ اعتبار چیز ہے جیسے اخبار کی پیشگوئیاں۔ میں گزشتہ بہار میں آکسفورڈ کے جس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا وہاں بھی ایک بیرومیٹر آویزاں کیا گیا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ بہت اچھے موسم کی پیشگوئی کر رہا تھا جبکہ باہر خاصی تیز بارش ہو رہی تھی، جو بعد ازاں سارا دن جاری رہی۔ میں نے بیرومیٹر کو ازسرِ نو

سٹارٹ کیا۔اس کی سوئی نے چھلانگ لگائی اور خشک موسم پہ جا بسرام کیا۔ہوٹل کا منیجر وہاں سے گزر رہا تھا، اس نے وضاحت کی کہ یہ بیرومیٹر آنے والے کل کے موسم کے بارے میں بتا رہا ہے۔ میں نے یوں ہی ازراہِ مذاق کہا کہ یہ بیرومیٹر گذشتہ ہفتے سے پہلے کا کوئی موسم بتا رہا ہے جبکہ منیجر بڑے استحکام کے ساتھ اپنے مؤقف پر قائم رہا اور پورے وثوق سے کہتا رہا کہ یہ پیشگوئی کل کے بارے میں ہے۔

اگلی صبح کو میں نے اسی بیرومیٹر کو ٹیپ کیا تو اس نے درجۂ حرارت کے دباؤ کو مزید بڑھا دیا جبکہ باہر زور وشور سے بارش جاری تھی۔ میں نے بدھ کو اسے دوبارہ آزمایا، اب کی بار پھر موسم کو گرم اور خشک قرار دیا گیا۔میں نے دوبارہ بیرومیٹر کو ٹیپ کیا اب کی بار بھی سوئیاں اُس انتہا پر آکر رک گئیں جس سے زیادہ موسم کو خوشگوار قرار دئے جانا ممکن نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو اسی صورت میں جب وہ بیرومیٹر اپنے آپ کو چلتا ہوا آگے نکل جاتا۔ اسی دوران بارش نے جھڑی کی صورت اختیار کر لی تھی اور قصبے کا زیریں حصہ دریا کی سطح میں اضافے کے باعث زیرِ آب آ گیا تھا اور بیرومیٹر بتا رہا تھا کہ موسم انتہائی خشک اور خوشگوار ہوگا۔منیجر نے اس کی تاویل یہ پیش کی کہ بسا اوقات موسم پر کسی قسم کا بھوت سوار ہو جاتا ہے اور وہ ہر قسم کی پیشگوئی سے بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔حوالے کے طور پر اُس نے ایک شعر بھی سنایا۔

شارٹ نوٹس کا شارٹ ٹائم ہے
گہرے پانی کا رنگ دائم ہے

اتفاق سے اس سیزن میں اچھا موسم آیا ہی نہیں ۔میرا خیال تھا کہ وہ مشین آئندہ برسوں کے کسی موسم بہار کے بابت پیشگوئی کر رہی تھی۔۔۔واللہ العالم۔

بیرومیٹر کی ایک نئی قسم بھی نکلی ہوئی ہے جو کسی ایتھلیٹ کی طرح سیدھی تنی ہوئی ہے۔ مجھے تو کبھی اس کا سرا پکڑائی ہی نہیں دیا ہے۔اس کا ایک حصہ گزرے ہوئے کل کے متعلق ہے جبکہ دوسرا حصہ صبح کے دس بجے کو ظاہر کرتا ہے۔اب ہوٹلوں میں علی الصباح دس بجے کون اٹھتا ہے،اس کا تجربہ تو آپ کو بخوبی ہوگا۔۔۔اس کی سوئیاں اوپر اٹھیں تو موسم کے خوشگوار ہونے کا مژدہ ہے اور اگر نیچے گریں تو رونگٹے کھڑے کر دیتی ہیں۔اسے ٹیپ کرنے کے بعد بھی کوئی قابلِ قبول جواب ہاتھ نہیں آتا، تا آنکہ اس میں سمندر کی سطح اور حرارت کی پیائش کی اکائیاں نہ فیڈ کی جائیں۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی جو جواب ملتا ہے وہ سمجھیں کہ نکا سا ہوتا ہے۔کم از کم میرے ادراک سے کچھ اوپر کی شے ہوتی ہے۔

لیکن بھلا موسم کی پیشگوئیوں کی پرواہ کسے ہے۔ہمیں پتہ ہو یا نہ ہو برا موسم آئے تو بہر حال لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں، چاہے آپ اس کے لئے ذہنی اور جسمانی طور پر پہلے سے تیار ہوں یا نہ ہوں۔میرے نزدیک موسم کا اچھا نجومی وہی خمیدہ کمر بوڑھا اور مہربان صورت شخص ہے جو موسم سے زیادہ ہماری خواہشات کو پڑھ لے۔آؤٹنگ پر جانا چاہتے ہوں اور خوشگوار موسم کے خواہاں ہوں تو وہ اپنی دور اندیشی سے مزّین نظروں کو افق پر گاڑے اور متفکرانہ انداز میں کہے'' بے فکر ہو کر جائیں جناب! موسم بالکل صاف رہے گا، ہواؤں کی سنسناہٹ میں مثبت اشارے صاف نظر آ رہے ہیں!''

''واہ! یہ ہوئی ناں پیشگوئی۔ہم اس نورانی بزرگ نجومی کا شکریہ ادا کر کے آپس میں کہتے ہیں ''ان بوڑھے لوگوں سے زیادہ فطرت سے آشنا کون ہوسکتا ہے۔''

اس مہربان بوڑھے شخص سے محبت تب بھی کم نہیں ہوتی جب موسم اس کی پیشگوئی کی مخالفت پر اتر آئے اور بارش کی رال بہہ نکلے۔

''اب فطرت سے کون لڑ سکتا ہے؟'' ہم کہتے ''اس خضر صورت بزرگ نے تو اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کر کے پیشگوئی کی تھی۔''

اور وہ شخص جو ہزار خضر صورت ہو، برے موسم کی پیشگوئی کر دے تو اس کے خلاف ہمارے دل ودماغ میں پیچ وتاب اور انتقام کے سوا کچھ نہیں ابھرتا۔

''کیا خیال ہے، آج مطلع صاف رہے گا؟؟'' میں پکنک پر جاتے ہوئے اس سے پوچھ بیٹھوں۔

”نہیں جناب!۔۔۔ میرا خیال ہے کہ آج بارش ہونے کا امکان ہے“ وہ سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے جواب دے۔

”احمق بڈھا“۔۔۔ ہم بڑبڑائیں۔۔۔ ”ہوں، اِسے آتا کیا ہے۔“

اور اگر اتفاق سے اس کی پیش گوئی درست بھی نکلے تو ہمارے دل میں اُس کے خلاف غصے کی آگ مزید بھڑک اُٹھتی ہے، جیسے ہم سمجھتے ہوں کہ موسم کی خرابی میں اسی کا ہاتھ ہو۔

اُس دن بھی موسم بہت خوشگوار تھا، سورج اپنے جوبن پر تھا، اگرچہ جارج نے اخبار سے خاصی لرزہ خیز قسم کی خبریں ڈھونڈ نکالی تھیں اور نہایت بھیانک اصطلاحات دہرائی تھیں، مثلاً ماحولیاتی اتھل پتھل، شمال یورپ سے امنڈتی ہوئیں طوفانی لہریں، ہوا کا بڑھتا ہوا دباؤ وغیرہ وغیرہ

لیکن اپنی تمام تر عیارانہ کوششوں کے باوجود وہ ہمیں متاثر نہ کر سکا اور جب اسے محسوس ہوا کہ وہ محض اپنا وقت ضائع کر رہا ہے، ہمارا بال بھی بیکا نہ کر سکے گا تو چپ چاپ اُٹھا، میرا رول کیا ہوا سگریٹ سلگایا اور چلتا بنا۔

اس کے بعد ہیرس اور میں نے مل کران باقی ماندہ اشیأ سے نمٹنا شروع کر دیا جو میز پر بکھری ہوئی تھیں۔ اپنا سارا پیک شدہ سامان صدر دروازے پر مجتمع کیا اور ٹیکسی کا انتظار کرنے لگے۔

سامان کو ایک جگہ رکھا تو اچھا خاصا لگنے لگا۔ ایک بڑا سا بریف کیس تھا، دو چھوٹے چھوٹے ہینڈ بیگ تھے، دو سامان سے بھری ٹوکریاں تھیں، غالیچے کا ایک بڑا سا رول تھا، پانچ اوور کوٹ تھے، کچھ چھتریاں تھیں، ایک بڑا سا تربوز تھا، جو اتنا گول مٹول تھا کہ کہیں سمانہ پایا تھا چنانچہ اسے ایک الگ شاپر میں دھکیل دیا گیا تھا۔ ایک بیگ میں بہت سے نقشہ جات تھے، جاپانی دستی پنکھیاں تھیں اور ایک لمبوترا سا فرائنگ پین تھا جسے اس کے ”ٹمڈ ھینگ پنے“ کی بنا پر ایک خاکی کاغذ میں لپیٹ دیا گیا تھا۔

خاصا سامان اکٹھا ہو گیا تھا۔ ہیرس اور مجھ پر کھسیانا پن کے دورے پڑ رہے تھے، حالانکہ اس کی کوئی تک نہیں بنتی تھی۔ ٹیکسی تو نہیں آئی لیکن گلی کے لڑکے بالے ضرور آ گئے اور اس شو میں خاصی دلچسپی کا اظہار کرنے لگے۔ بگس کا لڑکا بارش کا پہلا چھینٹا تھا۔ بگس علاقے کا سبزی فروش تھا اور اس کی واحد خصوصیت بکثرت بدتمیز قسم کے بچوں کی جستجو تھی، ایسے بچے کہ تہذیب ہنوز ان کے تعاقب میں تھی۔ اگر محلے کے بچہ لوگ میں کوئی نیا چہرہ نظر آتا تھا تو ہم سمجھ جاتے تھے کہ یہ بگس کی شوخیٔ تحریر کا کوئی نقشِ نو ہے۔ مجھے تو یہ تک بتایا گیا تھا کہ جب گریٹ گردم سٹیٹ کی ڈکیتی کا واقعہ پیش آیا تھا تو اس واقعہ کے پیچھے بھی بگس کا کوئی لال ہی تھا۔ جب پولیس والوں نے تفتیش کے لئے اُسے بلایا تو بگس سے فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ اس کا کون سا والا لڑکا اس کیس میں ملوث ہے۔ جب پولیس والوں کی طرف سے باقاعدہ وارنٹ جاری کیا گیا تو اُس کو ہاتھ پیر پڑ گئے۔ اُس نے ”اکڑ بکڑ بمبے بو“ والا فارمولہ استعمال کر کے ملزم کا سراغ لگایا اور تھانے میں پیش کیا۔ میں اُس وقت بگس کے لڑکوں کو نہیں جانتا تھا لیکن جب کچھ کچھ جاننے لگا تو اُن سے سامنا ہونے پر برطانوی اخلاقی معیار کو بالائے طاق رکھنے میں ہی عافیت سمجھتا رہا اور اُن سے یوں اغماز برتتا رہا جیسے امریکہ میں کالوں سے برتا جاتا ہے۔

جیسا کہ میں آپ کو بتا رہا تھا کہ اول اول بگس کا لڑکا گلی کے موڑ سے ظاہر ہوا تھا۔ جب وہ منظر میں آیا تھا تو خاصی عجلت میں تھا لیکن جونہی اُس کی نظریں ہم تینوں اور ہمارے سامان پر پڑیں، اس کے قدم ڈھیلے ہو گئے اور وہ وہیں ٹھہر کر ہمیں دیکھنے لگا۔ میں نے اور رہیرس نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ کوئی

حساس طبیعت کا بچہ بالا ہوتا تو اس کی تاب نہ لا سکتا۔ لیکن بکس کے لڑکے پر چکنی مٹی زیادہ استعمال کی گئی تھی، اس پر رتی برابر اثر نہ ہوا، وہ چیتے کی طرح ہماری طرف لپکا اور ہمارے گھر کے صدر دروازے کی سیڑھیوں کے عین سامنے آن کھڑا ہوا۔ ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تنکے کو دانتوں تلے دبایا اور جھک جھک کر ہماری طرف دیکھنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ہم سے کسی تماشے کی توقع کر رہا ہے۔ اگلے ہی لمحے کریانے والے کا لڑکا بھی گلی کی مخالف سمت سے نمودار ہوا۔ بکس کے لڑکے نے اسے دیکھا تو پکار کر کہا ''۔۔۔ دیکھو دیکھو!! بیالیس نمبر کے گراؤنڈ فلور والے کہیں جا رہے ہیں۔ کریانے والے کا لڑکا آہستہ آہستہ چلتے ہوا آیا اور سیڑھیوں کے داہنی طرف مورچہ زن ہو گیا۔ اسی اثناء میں جوتوں کی دکان میں کام کرنے والے نوجوان کا وہاں سے گزر ہوا۔ اس نے جو یہ دھرنا ملاحظہ کیا تو وہیں رک گیا اور بکس کے لڑکے کے ساتھ جا کھڑا ہوا جبکہ اس کے بعد آنے والے بلیو پوسٹ کے سپرنٹنڈنٹ نے وقوعے میں ایک آزادانہ جگہ کا انتخاب کیا۔

''یہ لوگ کیا بالکل ہی کنگال ہو کر رہ گئے تھے کہ انہیں یہاں سے کوچ کرنا پڑ رہا ہے؟'' بوٹ شاپ کے لڑکے نے استعجاب کا اظہار کیا۔

''تمھارا کیا خیال ہے، بندہ جب پاتال میں کشتی رانی کرنے جا رہا ہو تو یونہی چل پڑتا ہے؟؟'' سپرنٹنڈنٹ نے چوٹ کی۔

''یہ لوگ پاتال میں کشتی رانی نہیں کرنے جا رہے ہیں''

بکس کے لڑکے نے مداخلت کی ۔۔۔ ''یہ کسی خزانے کی تلاش میں جا رہے ہیں۔''

آہستہ آہستہ وہاں اچھی خاصے لوگ جمع ہو گئے، سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے؟

نوجوان چلر پارٹی کے لڑکے کہہ رہے تھے کہ یہ کسی شادی کی تقریب ہے۔ وہ ہیرس کو دولہا قرار دے رہے تھے جبکہ مجمع میں موجود قدرے عمر رسیدہ اور بالغ نظر صاحبان اس نظریہ پر قائم تھے کہ کوئی جنازہ ہے اور میں مرحوم کا بھائی وغیرہ ہوں۔

آخر کار ایک خالی ٹیکسی آ ہی گئی۔ ہماری گلی بھی ایک طرفہ تماشہ ہی ہے۔ جب ضرورت نہیں ہوتی تو بیس سیکنڈ فی ٹیکسی کے حساب سے ٹیکسیاں دندناتی پھرتی ہیں بلکہ آپ کا راستہ روک روک لیتی ہیں لیکن جب ان کی ضرورت ہو تو اتنی دیر لگا دیتی ہیں کہ اچھا خاصا ہجوم اکٹھا ہو جاتا ہے تب جا کر کہیں کوئی جلوہ افروز ہوتی

ہے۔ہم سب بمعہ جملہ سامان غڑاپ سے اندر گھس گئے۔ مونیمورینسی کے دوعدد جگر گوشے بھونکتے بھونکتے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے غالباًوہ مونٹمورینسی سے کہہ رہے تھے کہ اچھا بچو جی! پھر ملے تو نمٹ لیں گے تم سے۔۔۔مجمع کے شوروتحسین میں ٹیکسی روانہ ہوئی، ہیرس کالڑکا دانتوں میں دبایا ہوا تنکا نکال کرالوداعی طور پرلہرارہا تھا۔

ہم گیارہ بجے واٹرلو پہنچے اور پوچھ گچھ کرنا شروع کردی کہ گیارہ بج کر پانچ منٹ والی ٹرین کہاں سے چلتی ہے؟ ریلوے اسٹیشن کہیں بھی ہو، پلیٹ فارم پر موجود مجمع کثیر میں سے کسی ایک نفر کو بھی علم نہیں ہوتا کہ یہ جولا تعداد گاڑیاں آجارہی ہیں، یہ کہاں سے آرہی ہیں اور کہاں کا ارادہ باندھے بیٹھی ہیں۔ وہ صاحب جس نے ہمارا سامان اٹھایا ہوا تھا، فرمارہے تھے کہ متعلقہ گاڑی غالباً فارم نمبر دو پر ملے گی جبکہ ایک دوسرے قلی سے جب پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ افواہ یہی ہے کہ متذکر گاڑی غالباً پلیٹ فارم نمبر ایک سے روانہ ہوگی۔اس کے برخلاف اسٹیشن ماسٹر کی خیال آرائی تھی کہ اس کا تعلق لوکل لوکوموٹو سے ہے، فاصلاتی نظام سے نہیں۔معاملے کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لئے ہم پینتیس سیڑھیاں چڑھ کے اوپر گئے اور ٹریفک سپرنٹنڈنٹ سے بات کی۔ اُس نے بتایا کہ وہ ابھی ابھی ایک مسافر سے ملا ہے، جس کا کہنا ہے

کہ ہماری مطلوبہ ٹرین پلیٹ فارم نمبر تین پر موجود ہے۔ہم پلیٹ فارم نمبر تین میں پہنچے لیکن وہاں متعین ریلوے حکام نے ہمیں بتایا کہ ان کا خیال ہے کہ ہماری مطلوبہ جگہ جانے والی ٹرین ساؤتھمٹن ایکسپریس ہوسکتی ہے یا پھر ونڈسورلوپ لیکن یہ امر یقینی ہے کہ وہ کنگسٹن ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتی۔انہیں اس باب میں اِتنا یقین کیوں ہے، وہ اس کی وضاحت نہیں کرپائے۔

''یہاں تو کسی کو کچھ پتہ ہی نہیں ہے کہ کون کہاں سے آرہا ہے اور کہاں جارہا ہے''۔۔۔ہم نے متحیرانہ انداز میں کہا۔''کیا آپ اس بارے میں بھی کچھ بتاسکتے ہیں جناب؟''

''معذرت! کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا جناب!!'' اس شریف آدمی نے کہا ''لیکن مجھے یقین ہے کہ ان آتی جاتی ٹرینوں میں سے کوئی ایک ضرور کنگسٹن جائے گی۔''

پس، بعد از خرابیِ بسیار ہم لوگ براستہ لندن کنگسٹن پہنچے۔ وہاں پہنچ کر ہمیں پتہ چلا کہ ہمیں ایکسٹرمیل کے ذریعے ہی آنا چاہئے تھا کیوں کہ وہی ہے جو بغیر کسی غیر ضروری آوارہ گردی کے کنگسٹن جاتی ہے اور یہ بھی حقیقت تھی کہ اس ٹرین نے واٹرلوب میں ہماری خاطر گھنٹوں گزار دئے تھے لیکن کسی کو پتہ لگنے نہیں دیا کہ وہ وہاں پر کھڑی ہوئی ہے۔

ہماری کشتی کنگسٹن پل کے نیچے لنگر انداز تھی۔ہم نے اپنا سامان سلیقے طریقے سے اس میں دھرا اور ہماری کشتی ایک جھرجھری لے کے جاگی اور پانی کا سینہ چیرتے ہوئے چل دی۔

''آپ ٹھیک ہیں جناب؟'' وہاں موجود ایک شخص نے ہم سے پوچھا۔

''الحمدللہ'' ہم نے جواباً کہا اور اس کے ساتھ ہی میں جو اپنے آپ سے بھی عاجز آیا ہوا تھا، ہیرس کہ جس کے چہرے پر اس ساری دوڑ بھاگ کی وجہ سے بارہ بجے ہوئے تھے اور موٹیمورینسی کہ جو سخت طیش میں تھا اور ہر چیز کو مشتبہ انداز میں سونگھ رہا تھا، ریلنگ کے ساتھ کھڑے ہوگئے اور پانی کو گھور گھور کر دیکھنے لگے جو آنے والے دِنوں میں ہمارے کینوس کی واحد متوقع تصویر تھی۔

فیس بک اور ٹوئٹر وایا گوگل

کہتے ہیں لال بجھکڑ کے پاس ایک لال کتاب ہوا کرتی تھی جس میں دنیا کے ہر مسئلے کا حل موجود تھا۔اس کتاب کی ہی کرامت تھی کہ کل عالم میں لال بجھکڑ کا ڈنکا بجتا تھا۔جہاں کسی کو کوئی مشکل پیش آئی وہ اس کے حل کے لیئے بہت زیادہ تردد نہیں کرتا، بلکہ جتنے تردد سے وہ مسئلے کا حل خود ہی ڈھونڈ سکتا تھا اس سے ذرا سا زیادہ تردد کر کے لال بجھکڑ کو ڈھونڈ لیا کرتا اور لال بجھکڑ اپنی لال کتاب سے ڈھونڈ کر مسئلے کا حل بیان کر دیا کرتا، اور پھر اگر سائل کی قسمت اچھی ہوتی تو وہ لال بجھکڑ کے فیصلوں سے اجتناب کرتے ہوئے کوئی دوسری راہ ڈھونڈ کر اس پر عمل کر کے اپنے مسائل حل کر لیا کرتا، چونکہ اس وقت تک ہمارا موجودہ معاشرہ وجود میں نہیں آیا تھا لہٰذا ابھی کسی قسم کے تحقیقاتی اور مشاورتی کمیشن بنانے اور ان کے مشوروں سے اجتناب کا فیشن نہیں پڑا تھا۔

لال بجھکڑ کی عقلمندیوں کے سلسلے میں ایک واقعہ بہت مشہور ہے، یوں تو ہماری تاریخ دانی اس بات پر خاموش ہے کہ یہ اصلی لال بجھکڑ کا واقعہ ہے یا کسی خود ساختہ لال بجھکڑ کا لیکن ہمارے اس قلم میں اتنی طاقت ضرور ہے کہ ہم کوئی بھی واقعہ کم از کم لال بجھکڑ سے ضرور منسوب کر دیں وہ خود کونسا ہمارے اوپر ازالہ حیثیتِ عرفی کا دعویٰ دائر کر دیگا۔ہاں زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ہوگا کہ کچھ اہلِ علم ہم سے اختلاف کریں گے تو کوئی بات نہیں ہم کو موجودہ جمہوریت نے یہ سبق دیا ہے کہ اختلاف تو جمہوریت کا حسن ہوتا ہے اور اکثریت کی طرح ہر طرح کے حسن کے شیدائی ہونے کے دعویدار تو ہم بھی ہیں۔

قصہ تو بہت مشہور ہے ہوسکتا ہے اکثریت نے پہلے ہی سُن رکھا ہو لیکن چونکہ کالم کا پیٹ بھرنا ہمارا مقصود ہے لہٰذا ہم سنانے سے ہرگز باز آنیوالے نہیں۔قصہ یہ ہے کہ کسی نے ایک بار لال بجھکڑ سے بگلا پکڑنے کا طریقہ پوچھا تو لال بجھکڑ نے تُرنت اپنی لال کتاب نکالی اور اس میں سے سائل کو بگلا پکڑنے کا طریقہ بتادیا کہ کسی ایسے تالاب کے کنارے اندھیری رات کو پہنچ جاو جہاں بگلے شب بسری کی خاطر آتے ہوں، جس وقت بگلے سو رہے ہوں اس وقت اپنے مطلوبہ بگلے کے سر پر موم رکھ دو اور آرام سے بیٹھ جاو، صبح دم جب دھوپ نکلے گی تو موم پگھل کر بگلے کی آنکھ میں جائے گی وہ اندھا ہو جائے گا بس اب وقت ضائع نہ کرو اور جھٹ سے بگلے کو پکڑ لو۔سائل نے حیرت سے پوچھا کہ جس وقت میں بگلے کے سر پر موم رکھ رہا ہوں گا اسی وقت بگلے کو کیوں نہ پکڑ لوں؟ لال بجھکڑ بڑے فخر سے بولے ہوسکتا ہے بعض اناڑی اسی طرح کرتے ہوں مگر صحیح طریقہ وہی ہے جو میری لال کتاب میں لکھا ہے۔

وہ زمانہ اور تھا جب ایک ہی لال بجھکڑ ہوتا تھا اور اس کی ایک ہی لال کتاب ہوا کرتی تھی، اب تو بچہ بچہ لال بجھکڑ بنا پھرتا ہے۔ ہر کسی کے ہاتھ میں ایک ایک لال کتاب نظر آتی ہے۔کوئی اس کو لیپ ٹاپ کہتا ہے اور کوئی آئی پیڈ یا پھر ٹیبلیٹ بلکہ اکثریت تو اس کو اسمارٹ فون کہتی ہے۔ جہاں کوئی مشکل پیش آئی ناں کسی بزرگ سے مشورہ کی زحمت محسوس کی اور ناں ہی کسی ہجولی سے دل کی بات شیئر کی بس فٹافٹ اپنے کمپیوٹر نما لال کتاب کھولی اور گوگل نامی جن

زبید بھائی کا خیال ہے کہ اگر ملک میں یہی کچھ ہونا ہے تو اس کے لئے حکومتی اخراجات برداشت کرنے کی کیا ضرورت ہے، یہ سب کچھ تو حکومت کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ اعظم نصر

ہر کسی کے ہاتھ میں ایک ایک لال کتاب نظر آتی ہے۔ کوئی اس کو لیپ ٹاپ کہتا ہے اور کوئی آئی پیڈ یا پھر ٹیبلیٹ بلکہ اکثریت تو اس کو اسمارٹ فون کہتی ہے۔ جہاں کوئی مشکل پیش آئی ناں کسی بزرگ سے مشورہ کی زحمت محسوس کی اور ناں ہی کسی ہجولی سے دل کی بات شیئر کی بس فٹافٹ اپنے کمپیوٹر نما لال کتاب کھولی اور گوگل نامی جن بچہ جن کا ایک گھونٹ پیئے بنا ہی ایک ایک سوال کے ہزاروں جوابات لیئے حاضر ہو جاتا ہے۔ شائد اس جن بچے کو معلوم ہے کہ ہم اتائیوں کی معترف قوم ہیں جو ہر مرض کی ایک ہی دوا بناتے ہیں اور اس میں جملہ امراض کی تھوڑی تھوڑی دوا شامل کر دیتے ہیں کہ کوئی تیر تو نشانے پر بیٹھے گا۔ اب یہ الگ بات کہ اس دوا سے کوئی نئی بیماری جنم لے لے۔

ابھی کچھ ہی روز قبل کی بات ہے کہ ہم بھی گوگل نامی اس جن بچے کا شکار ہو گئے۔ قصہ یہ ہے کہ ہم نے کہیں یہ پڑھ لیا کہ شعراء کے نزدیک ایک کتابی چہرہ معیارِ حُسن میں شامل ہے، ہم نے آج تک کوئی حسین چہرہ تو دیکھا ہی نہیں جب بھی دیکھنا چاہا بیگم صاحبہ کا فرمائشی چہرہ ہی نظر آیا، ہم نے فوراً گوگل سے کتابی چہرہ دکھانے کی فرمائش کر ڈالی، اب جتنی ہم کو انگریزی آتی ہے اتنا ہی جوابی سوال آیا کہ Did you mean facebook? ہم بنا سوچے سمجھے ہی اثبات میں جواب دے دیا۔ اس نے ہم کو فوراً facebook کھول کر دکھا دی۔ ہم حیران پریشان کہ یا خدا یہ کونسی دنیا ہے؟؟؟ ہم تو کتابی چہرہ دیکھنا چاہتے تھے اس نے تو آیئنہ دکھلا دیا، پورے معاشرے کا آیئنہ!!!! ہم کو ایسا محسوس ہوا کہ ہم کسی میلے میں موجود ہیں جہاں ہر کوئی اپنی اپنی بولی بول رہا ہے اور سُن کوئی کسی کی نہیں رہا ہے۔ وعظ و تلقین سے گالی گفتار تک تفریح کے نام پر ایک افراتفری مچی ہوئی ہے، جس کو افراتفریح کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ہم نے گھبرا کر سوچا کہ ایسے کتابی چہرے سے تو ہم بے چہرہ ہی بہتر۔

معاشرے کے اس چہرے کو دیکھ کر ہم نے سوچا کہ معاشرے میں اپنی احتجاجی ملامت ریکارڈ کروا دی جائے۔ چونکہ ملامت کرنے کو انگریزی میں Twit کہتے ہیں لہٰذا ہم نے دوبارہ رجوع علی الگوگل کیا اور اس سے پوچھا How to Twit? اس نے Twit کو Tweet سمجھ کر ہم کو Tweeter کھولنے کا مشورہ دے دیا۔ اب ہم ایک نقطے کے فرق کی وجہ سے محرم سے مجرم بن چکے تھے کیونکہ Twit اگر ملامت کرنے کو کہتے ہیں تو Tweet چہچہانے کو کہتے ہیں۔ بہر حال یہ تو ایک بالکل ہی نئی دنیا تھی، لگتا تھا لوگ بآنگ زیرِ لب بھی بڑبڑانا بھول گئے ہیں۔ جہاں کسی نے ٹوئٹر پر کوئی بات کی بس جواب، جواب الجواب اور جواب الجواب الجواب کا ایک طوفان سا امڈ آیا۔ ہم کو بے اختیار پرانے محلّوں کا وہ زنانہ کردار یاد آ گئے جو صبح دم صحن میں الٹا پڑا ٹوکرا اٹھا کر آواز لگاتی آ پڑوسن لڑیں، دوسری طرف سے آواز آتی تجھ سے لڑے میری جوتی، ایک تیسرے کونے سے آواز آتی کہ میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی جو تم جیسی لڑاکا عورتوں کے محلّے میں مکان لے لیا۔ بس پھر تھوڑی ہی دیر میں پورا محلہ twit,twit کی صدائیں گونجنا شروع ہو گئیں۔ بس فیس بک اور ٹویٹر میں اتنا ہی فرق نظر آیا کہ فیس بک والے سوچتے اردو میں ہیں اور لکھتے انگریزی میں ہیں جبکہ ٹویٹر والے سوچنے کے علاوہ لکھتے بھی انگریزی میں ہیں بس مشترک بات یہ ہے کہ گالیاں دونوں ہی شارٹ کٹ میں دیتے ہیں۔

تنگ آ کر معاملہ ختم کرنے کی خاطر ہم نے سوچا کہ چلو ہم بھی عوام الناس کی طرح اتائی سے دوائی لے لیں اور گوگل سے اپنے بڑھاپے کے آثارِ اولین یعنی کمر درد کے بارے میں ہی پوچھ لیا جائے کہ:-

کچھ علاج اسکا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں؟

گوگل نے ہمارے سامنے استاد قمر جلالوی کا یہ شعر لا کر رکھ دیا ہے:

پیری سے خم نہیں ہے کمر میں مری قمر
جھک جھک کے ڈھونڈتا ہوں جوانی کدھر گئی

چوہدری صاحب کے کھابے

چوہدری صاحب نے اپنی ٹھوڑی سے ٹپکتا نہاری کا شوربہ اور دانتوں کی مسلسل ورزش کے باعث ماتھے پر چمکتے پسینے کو اپنی بائیں آستین سے صاف کیا تو اس کی سفیدی مزید داغدار ہوئی اور سالن کی ایک اور لکیر نمایاں ہو گئی۔ اگر چہ وہ لیفٹ ہینڈر نہیں تھے لیکن دایاں ہاتھ بیلچہ نما نوالے میں پھر سے نہاری بھرنے کو ڈونگے میں ڈبکی لگا رہا تھا۔

چوہدری صاحب ہمارے پرانے دوست تھے انکی بے لگام خوش خوراکی کے سبب انتہائی بڑھے ہوئے وزن پر میری تشویش سے زیادہ انہیں میری کم خوراکی کی عادت پر تشویش لاحق تھی۔ اکثر ہنستے ہوئے کہتے کہ تمہاری جبلت تو بٹیرے جیسی ہے بس باجرہ ہی چگا کرو۔ اور میں اُن کے ہنستے پیٹ کے طلاطم کو دیکھ کر ہی گھبرا سا جاتا۔ اُن کا تعلق اس قبیلے سے تھا جو زندہ رہنے کے لیے کھانے کی بجائے کھانے کے لیے ہی زندہ تھے۔ کھانا دیکھتے ہی انکے چہرے پر نیا رنگ چڑھ جاتا، آنکھوں میں وحشی چمک آجاتی، نظریں تعام پر مرکوز ہو جاتی اور اس وقت نہ ہٹتی جب تک تمام ڈونگے کھرچ کر نئے نہ کر دیتے۔ کہتے کہ یہ بھی سنت ہے کہ کھانے کا برتن خالی کر کے اٹھو۔ یہ اور بات کہ وہ خالی برتنوں کو بار بار اس وقت تک بھرتے تھے جب تک گھر کی ہانڈیوں کی یا میزبان کی ہمت نہ جواب دے جائے۔ اور کھاتے وقت سپیڈ ایسی ہوتی جیسے کسی نے فلم دیکھتے وقت فارورڈ کا بٹن دبا دیا ہو۔ بکرے کے پائے وہ اس اس انداز میں بھنبھوڑ کر کھاتے کہ منہ سے خرخر کی آوازیں نکلنا شروع ہو جاتیں۔ اور گرد بیٹھے دوست اپنے لباس کی عصمت پر متوقع لگنے والے داغوں سے بچنے کے لیے رضا کارانہ طور پر دور دور ہو جاتے۔ اور جس مظلوم بکرے کے وہ پائے چباتے یقینی طور پر اسکی روح بھی انکے دانتوں میں پس کر رہ جاتی ہوگی۔ مذہبی سوچ ہونے کے باوجود چوہدری صاحب نے ڈاڑھی اس وجہ

> **اُن کا تعلق اس قبیلے سے تھا جو زندہ رہنے کے لیے کھانے کی بجائے کھانے کے لیے ہی زندہ تھے۔**

سے نہ رکھی تھی کہ نوالے سے منہ بھرنے کے بعد ٹپکنے والا اضافی کھانا ڈاڑھی میں پھنس کر رک نہ جائے بلکہ پھسلتا ہوا واپس سامنے پڑے برتن میں ہی گرے۔ کھانا ختم ہو جانے پر چوہدری صاحب سنت کے مطابق اپنی انگلیاں بھی چاٹتے تھے لیکن ان پر لگے سالن کو اس انداز میں چوستے کہ کئی مرتبہ دانتوں سے اپنی انگلی زخمی کر بیٹھے۔ چوہدری صاحب اپنے دانتوں کا بہت خیال کیا کرتے تھے باقائدگی سے کھانے کے بعد مسواک کرتے کہ اگر دانتوں کو کچھ ہو گیا تو کیسے زندہ رہ پائیں گے۔ مسواک کرتے وقت دانتوں کی درزوں سے نکلنے والے گوشت کے ریشوں کو دوبارہ تناول فرما لیتے کہ رزق کو ضائع کرنا بھی تو کفرانِ نعمت ہے۔ لیکن بتیس دانتوں پر وہ اکثر خدا سے شکوہ کیا کرتے تھے کہ خدا نے شوقین مزاج لوگوں کو چونسٹھ دانت کیوں عطا نہیں کیے۔

اگر چہ کھانا دیکھتے ہی تخیل میں انکے تمام بدن پر دانت ہی دانت اگ آتے ہوں گے۔خوب شکم سیری کے بعد خالی برتنوں کو حسرت سے تکتے ہوئے وہ ایسا ڈکار مارتے کہ اس گائے کا گماں ہوتا جسکی ایسی آواز سن کر مالک اسے خوشی خوشی مویشی پھاٹک لے جایا کرتے ہیں۔ چوہدری صاحب دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ کرنے کے بھی عادی تھے۔ باآواز بلند قیلولہ کے دوران وہ دنیا و مافیا سے بے خبر سیدھے لیٹے ہوئے ایسے دکھائی دیتے جیسے انگریزی کے حرف یو کو الٹا دیا گیا ہو۔ انکا کہنا تھا کہ ہم خوش خوراک نسل سے ہیں چوہدریوں کا دستر خوان وسیع ہوتا ہے یہ اور بات کہ انکا بچھایا دستر خوان پچانوے فیصد انکے پیٹ میں ہی سرائیت کر جاتا تھا۔ بے تحاشا کھانے کی عادت ہی انکی وجہ شہرت تھی۔ پیٹ کے میدان کے علاوہ انہوں نے زندگی میں کوئی میدان فتح نہ کیا۔اور حوصلہ ایسا کہ کھاتے وقت تھکنے کا نام نہ لیتے۔ ہر روز کم وبیش چار مرتبہ انکا کھانے کے ساتھ میچ ہوتا اور جسے وہ اتنی جوانمردی اور دلیری سے کھیلتے کہ ہر بار ہی فاتح قرار پاتے۔ وہ ڈھیلا ڈھالا لباس پہننے کے عادی اس وجہ سے بھی تھے کہ کہیں چست کپڑے انکی خوراک میں کمی کا باعث نہ بن جائیں۔ اکثر محفلوں میں خفت مٹانے کی غرض سے پرانا محاورہ سناتے کہ۔۔اپنا کھایا پیا ہی کام آتا ہے۔۔۔لیکن انکا کھایا پیا انکے کس کام آرہا تھا وہ یہ بتانے سے قاصر ہی رہتے۔

آج دستر خوان پر بیٹھے دوستوں کی جانب سے تنبیہ کیے جانے پر پھر بگڑ گئے۔ کہنے لگے کہ تم کیوں میری صحت و خوش خوراکی سے حسد کرتے ہو۔خدا کے دیے ہوئے اور اپنے نصیب کا کھاتا ہوں۔دیکھو ان کرپٹ سیاستدانوں کو، بیوروکریٹس کو، سودی بزنس مینوں کو سرکاری سورماؤں کو، کتنی لوٹ گھسوٹ کی لیکن مجھ جیسی خوش خوراکی نہ نصیب ہوئی۔ وٹامن کی گولیوں پر گزارا کرنے والے ان سانڈوں نے بھوکے غریبوں کے حصے کا کھانا ملکی وغیر ملکی بینکوں میں بھر رکھا ہے جو دن بدن بڑھتا ہی جا رہا ہے لیکن انکے بینک کے لاکروں سے انسانی سڑے ہوئے گوشت کی بو آتی ہوگی۔ میں خوش نصیب ہوں کہ خدا کے دیے ہوئے رزق کا لذت آشنا ہوں اور خوب پیٹ بھر انصاف کرتا ہوں۔اور بار بار کرتا ہوں۔لیکن پاکستان کے ان غلیظ مگرمچھوں کی حالت نہ پوچھو کہ جنہیں صرف کرپشن کے مال جمع کرنے کے ذائقے کا پتا ہے۔ باقی فطرت کے تمام ذائقوں سے وہ محروم ہیں۔ میں کتنے ہی ارب پتی ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے ساری زندگی خوب لوٹ گھسوٹ کی لیکن عمر بھر رزق کے اصل ذائقوں سے محروم رہے۔ جنکی اولادیں انکے جلد مرنے کا انتظار کرتی۔ جنکی دولت حرام انکی زندگی کو نہ بچا سکی اور بعض تو ایسے جنکو کفن بھی خیراتی چندے کا پہنایا گیا اور حرام کے کمائے انکے لاکھوں ڈالر باہر کے بینکوں میں سڑتے رہے۔

چوہدری صاحب دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ کرنے کے بھی عادی تھے۔ باآواز بلند قیلولہ کے دوران وہ دنیا و مافیا سے بے خبر سیدھے لیٹے ہوئے ایسے دکھائی دیتے جیسے انگریزی کے حرف یو کو اُلٹا دیا گیا ہو۔

درست ہے کہ آپ کے مطابق میں زیادہ کھاتا ہوں لیکن میں کب حرام کے لقمے تناول کرتا ہوں میں جو کھاتا ہوں وہ دکھائی بھی دیتا ہے اور سنائی بھی۔ یہ چھپ کر کھانے والوں نے معاشرے میں سڑاند پیدا کر رکھی ہے۔کمبخت چھپ کر غریب قوم کے کروڑوں اربوں کھا جاتے ہیں۔ بینکوں سے قرض لیکر، من پسند ٹھیکے لے کر، قومی وصوبائی اسمبلی اور سینٹ کی سیٹ لے کر، وزارتیں لے کر بے رحم کتنا کھا جاتے ہیں کس کو پتا ہے۔کون جانتا ہے۔اور جو جان جاتا ہے وہ اپنا حصہ لے کر کھا جاتا ہے۔ چوہدری صاحب نے لمبا ساڈکار لے کر کھیر کے ڈونگے کی جانب ہاتھ بڑھایا۔اور کہنے لگے میرے ڈکار تم لوگوں کو بھلے نہیں لگتے لیکن جو تم سب کا حق بنا ڈکار لیے کھا رہے ہیں بتاؤ انکے نعرے کیوں لگاتے ہو۔ یہ چوہدری کے کھابے ہیں مجھے نہ روکو۔۔۔اگر روک سکو تو ان کم بخت بغیر ڈکار والوں کو روکو۔۔۔

ہومیو پیتھی علاج

لوگ ہمیں ہمارے نام کی وجہ سے اکھاڑے کا پہلوان سمجھتے ہوں گے حالانکہ ہم لائبریری کے کیڑے ہیں اس لئے صحت کا بالکل خیال نہیں رکھتے بلکہ اکثر ادیبوں، شاعروں اور صحافی دانشوروں کی طرح حفظان صحت کے اصولوں کی ڈٹ کر خلاف ورزیاں کرتے رہتے ہیں اور خوش قسمتی سے بیمار بھی بہت کم ہوتے ہیں البتہ سال دو سال بعد جب کبھی نزلہ وزکام اور بخار کی گرفت میں آتے ہیں تو پھر اگلی پچھلی ساری کسر پوری ہو جاتی ہے ہمیں دنوں کے بجائے ہفتوں میں آرام ملتا ہے، نزلہ و زکام سے ہم بہت الرجک ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے بجائے ہمیں براہ راست بخار ہو جایا کرے، گزشتہ دنوں بھی ہم نزلہ و زکام میں مبتلا ہو گئے اس دوران کتاب بلکہ اخبار بھی پڑھنے کے قابل نہ رہے، چند جملے پڑھتے ہی آنکھوں سے پانی بہنے لگتا، خواہش کے باوجود کچھ لکھنے سے بھی معذور ہو گئے بس بیٹھے کھانستے اور شوں شوں کرتے رہے، کبھی کبھی تو اس زور کا حملہ ہوتا کہ بے اختیار یہی جی چاہتا کہ ناک کو کسی دیوار کے ساتھ رگڑ ڈالیں لیکن بمشکل تمام ضبط کرتے ہوئے کچھ دیر تک اسے چٹکی میں دبائے رکھتے، چھینکیں مار مار اور کھانس کھانس کر ہمارے تو پھیپھڑے جواب دے گئے، گلا بھی بیٹھ گیا متعدد ڈاکٹروں سے رجوع کیا مگر بقول شاعر:

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

گزشتہ روز ایک دوست کا فون آ گیا بیماری کا سن کر پوچھنے لگے "کس سے دوا لے رہے ہو۔۔۔؟"

ہم نے بے بسی سے کہا "یار علاقے کے سارے کلینک اور ہسپتال بھگتا چکا ہوں اب غالباً صرف شفاخانہ حیوانات ہی باقی رہ گیا ہے۔۔۔۔"

ہمیں ٹوک کر مشورہ دیتے ہوئے بولے "ابھی شفاخانہ حیوانات نہ جانا بلکہ ایلو پیتھی کی جان چھوڑو اور ہومیو پیتھی علاج کراؤ۔۔۔"

ہم نے ناچاران کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ایک ہومیو کلینک کا رخ کیا اور جاتے ہی ڈاکٹر نے طلب کر لیا غالباً ہم صبح

> **یار! علاقے کے سارے کلینک اور ہسپتال بھگتا چکا ہوں اب غالباً صرف شفاخانہ حیوانات ہی باقی رہ گیا ہے۔**

سے پہنچنے والے سب سے پہلے مریض تھے، ڈاکٹر صاحب ہماری صورت دیکھتے ہی معاملہ بھانپ گئے اور کچھ سوچتے ہوئے بولے

"ہوں۔۔۔۔۔تو آپ نزلے میں مبتلا ہیں؟"

"شوں شوں" ہم نے اثبات میں سر ہلا دیا

"کب سے؟" انہوں نے مزید پوچھا

"ہفتہ بھر سے ۔۔۔۔۔ شوں شوں ۔۔۔۔۔۔"
ہمیں گھورتے ہوئے بولے "اور آپ آج تشریف لائے ہیں ۔۔۔۔ اگر دائمی نزلے میں مبتلا ہو جاتے تو ۔۔۔؟"
ہم نے بھنا کر کہا "یہی تو سوچ رہے ہیں ۔۔۔ شوں شوں ۔۔۔ ابھی تک ہوئے کیوں نہیں ؟"
مسکرا کر پوچھنے لگے "کون سی دوا کھائی تھی ۔۔۔؟"
ہم نے بیچارگی سے کہا "یہ پوچھیے کون سی نہیں کھائی ۔۔۔ شوں شوں ۔۔۔ اب تو دوا کا نام ہی ہمارے لئے سوہانِ روح ہو کر رہ گیا ہے ۔۔۔"
"نجی ٹی وی چینلز دیکھتے ہیں ۔۔۔؟" انہوں نے عجیب سوال پوچھ لیا۔
"ٹی وی چینلز کا بھلا نزلے سے کیا تعلق ۔۔۔؟" ہم نے بھنا کر پوچھا
ہاتھ اٹھا کر بولے "ہوتا ہے، ہوتا ہے آپ نہیں جانتے مگر میں تو ڈاکٹر ہوں مرض کے اسباب جاننا ہی تو ہمارا کام ہے ۔۔۔"
اِس کے بعد ہومیو ڈاکٹر صاحب نے نجی چینلز سے پرہیز بتاتے ہوئے کھٹی میٹھی گولیوں کی دو شیشیاں ہمیں تھما دیں اور ہماری جیب خاصی ہلکی کر دی، ایک عدد خوراک وہیں پھانک کر ہم ہومیو کلینک سے باہر نکلے اور گھر پہنچتے پہنچتے شدید بخار میں مبتلا ہو گئے۔
اس دوران نجانے کس طرح ہمارے نیم حکیم بزرگ علامہ طوفانی کو ہماری علالت کی خبر ہو گئی اور وہ عیادت کے لئے آ پہنچے، آتے ہی گرم ہو گئے "حد ہو گئی لاپرواہی کی ہفتہ بھر سے نزلے میں مبتلا ہو اور ہمیں خبر تک نہ کی کچھ دیر قبل عزیزی فیاض کے ذریعے پتا چلا تو شاہین ایکسپریس پر سیالکوٹ جانے کے بجائے ریلوے سٹیشن سے سیدھا یہاں چلا آیا کہ نجانے برخوردار کی طبیعت اب کیسی ہو؟"
بے اختیار ہمارے جی میں آئی انہیں کہہ دیں کہ اجی حضرت اگر آپ کو بروقت اطلاع کر دیتا تو آپ نزلے کا کیا بگاڑ لیتے ؟ لیکن حدادب ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے عرض کیا "آپ کو تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ نزلہ وزکام ہی تو ہے آج نہیں تو کل ختم ہو جائے گا ۔۔۔"
اتنی دیر میں وہ ہماری نبض تھام چکے تھے بوکھلا کر دھاڑے "ہائیں؟ تمھیں تو شدید بخار ہے مگر مجھے تو بتایا گیا تھا کہ نزلے میں مبتلا ہو؟"
ہم نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا "نزلہ تو ختم ہو گیا مگر بخار نے آلیا ۔۔۔۔"
"پہلے بخار ہوا تھا پھر نزلہ ختم ہوا تھا یا پہلے نزلہ نزلہ ختم ہوا اور پھر بخار ہوا تھا؟" اُن کے سوال نے ہمیں چکرا کر رکھ دیا۔
ہم نے اٹک اٹک کر کہنا شروع کیا "پہلے بخار ہوا تھا اور اس کے بعد نزلہ یوں غائب ہو گیا تھا جیسے ۔۔۔۔؟" ہم تشبیہ دیتے دیتے ہوش میں آ گئے
ہنکارا بھر کر بولے "ہوں ۔۔۔ تو پھر ضرور تم نے ہومیو پیتھی طریقہ علاج اختیار کیا ہو گا ؟"

ہومیو پیتھی کا یہ بنیادی اصول ہے کہ کوئی مرض دور کرنے کیلئے اس کے مقابل کوئی بڑا مرض کھڑا کر دوا گر مریض نزلے کی شکایت کرے تو دوا سے نمونیے کے اسباب پیدا کر دیئے جاتے ہیں پھر مریض نزلے کی شکایت نہیں کرتا ہومیو پیتھی کی کرتا ہے۔

"ٹھیک کہا آپ نے ۔۔۔ لیکن آپ کو اس کا علم کیونکر ہوا ۔۔۔؟" ہم نے حیرت سے پوچھا
اپنے سر کے خضاب زدہ بالوں کی ایک لٹ چھو کر چشمے کے پیچھے سے ہمیں گھورتے ہوئے کہنے لگے "برخوردار ہم تو اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں آخر ہم نے اپنے بال دھوپ میں تو سفید نہیں کیئے۔"
ہم یہ سن کر حیران رہ گئے کہ دس بارہ فٹ کے فاصلے سے یہ مونث مذکر کی پہچان تو کر نہیں سکتے، بھلا اُڑتی چڑیا کے پر کیسے گن

لیتے ہوں گے، ہم نے اصرار کیا "پھر بھی آپ کو کیسے پتا چل گیا کہ۔۔۔۔۔"

ہماری بات کاٹتے ہوئے کہنے لگے "ارے بھئی یہ کون سی مشکل بات ہے، ہومیوپیتھی کا یہ بنیادی اصول ہے کہ کوئی مرض دور کرنے کیلئے اس کے مقابل کوئی بڑا مرض کھڑا کر دو اگر مریض نزلے کی شکایت کرے تو دوا سے نمونیے کے اسباب پیدا کر دیئے جاتے ہیں پھر مریض نزلے کی شکایت نہیں کرتا ہومیوپیتھی کی کرتا ہے۔۔۔"

اس کے بعد علامہ طوفانی نے فلو اور نمونیے پر لیکچر دینا شروع کر دیا ۔۔۔"فلو بگڑ کر نمونیے میں تبدیل ہو جاتا ہے جو خطرناک ثابت ہو سکتا ہے لہٰذا فلو کے مریضوں کو نمونیے سے بچنے کیلئے حکیم کی ہدایت کے مطابق دوا کے ساتھ ساتھ پانی، جوس، یخنی وغیرہ کا خوب استعمال کرنا چاہیے اور۔۔۔۔۔"

اس کے بعد ہم پر غنودگی طاری ہوگئی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ہمارے نیم حکیم بزرگ تشریف لے جا چکے تھے کچھ دیر بعد مزید چند احباب تشریف لے آئے ایک خیر خواہ نے آتے ہی اطلاع دی۔

نزلہ وزکام ایک زہریلے وائرس سے ہوتا ہے جو عام دوا سے نہیں مرتا لہٰذا عرشی دواخانہ والوں کا گوہر جوشاندہ پیجئے کیونکہ اس کا ذائقہ چکھ کر کوئی جاندار چند منٹ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا

۔۔۔۔۔

ہم نے انہیں بڑے خلوص کے ساتھ تازہ صورتحال سے آگاہ کیا "جناب نزلہ وزکام تو دفع دور ہو چکے ہیں اب ہم بخار کی گرفت میں ہیں۔۔۔۔"

اس پر ایک دوسرے دوست نے مشورہ دیا "آپ حکیم لقمان ثانی سے رجوع کیجئے نبض پر انگلی رکھتے ہی مرض کے ساتھ ہی اس کا شجرہ نسب بھی بتا دیتے ہیں، گوالمنڈی میں مطب کرتے ہیں اگر کہئے تو ساتھ چلا جاتا ہوں۔۔۔"

ہم نے بڑی مشکل سے انہیں روکا اور کہا "صاحب ہم طبعی موت ہی مرنا چاہتے ہیں لہٰذا آپ کے حکیم شجرہ سے علاج کرانے کا رسک نہیں لے سکتے۔۔۔۔۔"

ایک تیسرے صاحب بھڑک کر بولے "ارے جناب آپ طب مشرق پر اعتماد کیجئے اس کی توہین نہ کیجئے، حکیم جالینوس

> فلو بگڑ کر نمونیے میں تبدیل ہو جاتا ہے جو خطرناک ثابت ہو سکتا ہے لہٰذا فلو کے مریضوں کو نمونیے سے بچنے کیلئے حکیم کی ہدایت کے مطابق دوا کے ساتھ ساتھ پانی، جوس، یخنی وغیرہ کا خوب استعمال کرنا چاہیے۔

ثانی سے دوا لے کر دیکھئے افاقہ نہ ہوا تو پیسے واپس کر دیں گے، ہمارے تو خاندانی حکیم ہیں، سرکلر روڈ پر مطب کرتے ہیں ان کی شہرت کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی مردے کی نبض چھو کر کہہ دیں کہ یہ زندہ اور بالکل صحت مند ہے تو منکر نکیر حساب کتاب چھوڑ کر فوراً الگ ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔"

اِس قدر مبالغہ آمیزی اور موت کا سن کر ہمارا دل بھر آیا ہم نے آنسو پیتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں کہا "یارو میرے سرہانے بیٹھ کر موت کا تذکرہ کرنے سے بہتر ہے کہ آپ سورہ یٰسین کی تلاوت شروع کر دیں تاکہ مجھے اس مرض سمیت دنیا کی تمام تکلیفوں سے ہمیشہ کیلئے نجات مل جائے۔۔۔"

اس پر ایک دوست خفا ہو کہنے لگے "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں یہ عمر بھی بھلا آپ کے مرنے کی ہے؟ زندہ دلی کا مظاہرہ کیجئے۔۔۔۔"

اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ دہشت گردی کا بھی ہومیوپیتھی علاج ڈھونڈ لیا گیا ہے اِن حالات میں ہم کیسے زندہ دلی کا مظاہرہ کریں؟

شرارتی لکیریں

"گلوبل وارمنگ کا حل"

کیا آپ بھی اپنی بیویوں سے تکراراً پوچھتے ہیں "وہ کس لئے؟"

برف کے گولے پاپا کے لئے بنا رہا ہوں تاکہ اُنھیں
مشاعرے کے لئے گندے ٹماٹر خریدنے نہ پڑیں!

سیاستدانوں کی محبتیں اور مخالفتیں

احباب کو جو قرض دیا ہے وہ بھول جا — شرطِ رضا یہ ہے کہ تقاضہ بھی چھوڑ دے (ناشاد دہلوی)

پھانسی منصور کو لگائی ہے   وہ سمجھتا ہے نیک ''ٹائی'' ہے   (ظریفؔ جبلپوری)

وفادار کتا......

وہی انداز ہے ظالم کا زمانے والا

جیسے مالکوں کے گریڈ، ویسے ہی کتے!

نیا دور، نئے مسئلے

اقتدار کی کرسی ہے بھائی۔۔۔۔

دل تو بچہ ہے جی

اپنے اپنے کرتب

جب ایمبولینس خراب ہو جائے تو کیا کیا جائے!
AMBULANCE

ارمغانِ ابتسام کا اگلا شمارہ نئے قہقہوں کے ساتھ

اردو طنز و مزاح پر مبنی سہ ماہی برقی مجلہ

ارمغانِ ابتسام

جنوری ۲۰۱۶ء تا مارچ ۲۰۱۶ء

مدیر:

نوید ظفر کیانی